بیادگار

ناشر

جمعیۃ علماء ہند ۱- بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی

فون : 3311455, 3317729 فیکس : 3316173

روزنامہ الجمعیۃ نئی دہلی

ایڈیٹر: مولانا محمد عثمان فارقلیط

۲۳ فروری ۱۹۵۳ء ۸ جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ دوشنبہ

کا

نئی ترتیب و اضافہ کے ساتھ

مفتی اعظم نمبر رح

اشاعت نو

زیر سرپرستی

امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ صدر جمعیۃ علماء ہند

زیر اہتمام

ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی

۱۳ مئی ۲۰۰۰ء ۸ صفر المظفر ۱۴۲۱ھ ہفتہ

مرتب
محمد سالم جامعی
خادم ادارہ تحریر ہفت روزہ الجمعیۃ

معاون خصوصی
مولانا محمود مدنی
ناظم تنظیم جمعیۃ علماء ہند

فون: 3311455
3317729
فیکس: 3316173

جمعیۃ علماء ہند ۱ بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ترتیب

اظہارِ مسرت

امیر الہند حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی دامت برکاتہم

صدر جمعیۃ علماء ہند

مجھے خوشی ہے کہ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہؒ کے تعلق سے روزنامہ الجمعیۃ دہلی کے شائع کردہ ''مفتی اعظم نمبر'' کو نئی ترتیب واضافہ کے ساتھ اب دوبارہ ہفت روزہ الجمعیۃ شائع کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ مقبول ونافع بنائے۔ ہم سب کو اپنی مرضیات اور ملک وملّت کی پرخلوص خدمات کی توفیق وقبولیت عطا فرمائے۔

فقط

اسعد مدنی

صدر جمعیۃ علماء ہند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

مفتی اعظم نمبر کی نئی ترتیب

جمعیۃ علماء ہند کے اوّلین صدر مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہؒ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ اسلام کے عظیم مفکر، بے نظیر مفتی، بے مثال عالم اور اعلیٰ درجہ کے منتظم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں جن ہمہ جہت خوبیوں سے نوازا تھا، مبدأ فیاض بہت کم لوگوں کو اتنی خوبیاں عطا کرتا ہے۔

مفتی اعظمؒ کا انتقال ۳۱؍ دسمبر ۱۹۵۲ء کو اُس وقت ہوا جب نئے سال کے شروع ہونے میں صرف ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ اگلے دِن نئے سال کے شروع میں اُنھیں مہرولی میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے آغوش میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

حضرت مفتی اعظمؒ کے سانحۂ ارتحال پر روزنامہ "الجمعیۃ" نے اپنی روایت کے مطابق "مفتی اعظم نمبر" شائع کیا تھا جس کی بعض نامعلوم وجوہات کی بناء پر بہت معمولی ضخامت تھی۔ اس نمبر کی اشاعت کے بعد حضرت مفتی اعظمؒ کے صاحبزادے مولانا حفیظ الرحمٰن واصفؒ نے حضرتؒ سے متعلق روزنامہ 'الجمعیۃ' اور ملک کے دوسرے اخبارات ورسائل میں شائع ہونے والے مضامین کو یکجا کر کے "مفتی اعظم کی یاد" کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا۔ اپنے اس مجموعۂ مضامین میں صاحبزادۂ مرحوم نے ان تمام مضامین کو بھی شامل کر دیا تھا جو مفتی اعظم نمبر میں شائع کیے گئے تھے۔ اللہ رب العزت نے اپنے مقبول بندے کی نسبت سے "مفتی اعظم نمبر" اور "مفتی اعظم کی یاد" دونوں کو ہی قبولیت عامہ سے سرفراز فرمایا اور یہ دونوں ہی مجموعے بہت جلد نایاب ہو کر رہ گئے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

جمعیۃ علماء ہند کے محترم صدر امیر الہند حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی مدظلہ کی خواہش تھی کہ اکابر و اسلاف جمعیۃ علماء ہند کی یاد تازہ کرنے اور ان کی قومی وملی خدمات سے روشنی حاصل کرنے کے لیے ان بزرگوں کے سلسلہ میں شائع ہونے والی تحریروں اور مجموعوں کو خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہوں دوبارہ منظر عام پر لایا جائے۔

حضرت امیر الہند مدظلہ کی یہ مبارک خواہش بارگاہِ خداوندی میں مقبول ہوئی اور ہفت روزہ "الجمعیۃ" کی جدوجہد اور مولانا محمود مدنی ناظم تنظیم جمعیۃ علماء ہند کی خصوصی توجہ کے نتیجہ میں "شیخ الاسلام نمبر" اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھی۔ اس سلسلہ کی دوسری کڑی "مفتی اعظم نمبر" ہے جو نئی ترتیب واضافہ کے ساتھ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

مفتی اعظم نمبر میں ہم نے جہاں نئی ترتیب قائم کرنے کی کوشش کی ہے وہیں کچھ اہم نئے مضامین بھی اس میں شامل کر کے اس نمبر کو ہمہ جہت بنانے کی کوشش کی ہے۔

مفتی اعظم نمبر کی نئی ترتیب واضافہ میں ہم نے خدا کی عطا کی ہوئی اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس نمبر کو مفید سے مفید تر بنانے کی کوشش کی ہے۔ اب یہ فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ اپنی اس کوشش میں ہم کس حد تک کامیاب ہو سکے ہیں۔

مفتی اعظم نمبر کی اشاعت نو کا یہ پروگرام کافی پہلے طے ہو چکا تھا جس کے لیے ہفت روزہ "الجمعیۃ" میں وقتاً فوقتاً اعلان بھی کیا جاتا رہا ہے۔ اس اعلان کے بعد وطن عزیز کے گوشہ گوشہ میں جس اشتیاق و اضطراب کے ساتھ اس اشاعتِ نو کا انتظار کیا گیا ہمیں اس کا پورا پورا احساس بھی ہے اور اعتراف بھی۔ اس لیے انتظار کے لیے ہمارے قارئین کو جو زحمت برداشت کرنا پڑی ہے، ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

مفتی اعظم نمبر کی یہ اشاعت نو ہمارے خوابوں کی کوئی مکمل تعبیر نہیں ہے۔ ہم اپنی اس کارکردگی پر مطمئن اور مسرور بھی نہیں ہیں۔ مگر تحدیث بالنعمۃ کے طور پر اس اشاعتِ نو کو ہفت روزہ الجمعیۃ اور اپنی زندگی کا ایک اہم باب ضرور تصور کرتے ہیں اور اس پر ہم اپنے رب کے بے پایاں شکر گذار ہیں۔

ہم اس موقع پر ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتے ہیں جنھوں نے مفتی اعظم نمبر کی اس اشاعتِ نو کی ترتیب و تزئین میں ہماری مدد کی ہے یا اشتہارات کے ذریعہ ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔

اللہ تعالیٰ ان سبھی حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین!

نیاز کیش

محمد سالم جامعی

خادم ادارۂ تحریر ہفت روزہ "الجمعیۃ" دہلی

اداریہ

مولانا محمد عثمان فارقلیط

الجمعیۃ

۲۳؍فروری ۱۹۵۳ء

مُفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے جس خصوصی نمبر کا مژدہ آپ کو بار بار سنایا گیا تھا وہ آج آپ کی خدمت میں حاضر کیا جارہا ہے۔ حضرت کی زندگی کے جن گوشوں کو نمایاں کرنے اور جن پہلوؤں پر زور دینے کی ضرورت تھی ان پر زیر نظر نمبر میں ایک حد تک روشنی ڈالی گئی ہے اور اہل قلم کے ذی علم طبقہ نے ان پر کافی توجہ فرمائی ہے۔ اس لیے ہم ضرورت نہیں سمجھتے کہ یہاں ان کا اعادہ کریں۔ بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ ایک الگ راہ سے ناظرین کرام کی توجہ چند خاص باتوں کی طرف مبذول کرائیں۔ اور دُور اور نزدیک کے لوگوں کو بتائیں کہ اس خاص نمبر کی اشاعت کیوں ضروری سمجھی گئی اور افادیت کے نقطۂ نظر سے اس کا پیش کرنا کیوں اہم قرار پایا۔ جو لوگ مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی بلند پایہ اور عدیم النظیر شخصیت سے واقفیت نہیں رکھتے ان کی نظر میں ممکن ہے کہ اس خصوصی نمبر کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو اور وہ اسے بھی پروپیگنڈہ کی شکل دینے کی جرأت کر بیٹھیں۔ لیکن جو لوگ حضرت کی علمی جلالت اور اجتہادی منزلت سے واقف ہیں وہ اعتراف کریں گے کہ اس نمبر کی اشاعت نہ صرف وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے والی ہے بلکہ یہ ان خدمات کا کم سے کم اعتراف ہے جو مرحوم نے پینسٹھ سال کے طویل و عریض عرصہ میں انجام دیں اور جن کا شاندار ریکارڈ ایک زندہ قوم کے لیے باعث فخر و مباہات ہونا چاہیے۔ اگر ہم مشہور شعراء کی برسیاں منا کر اپنے آپ کو قابل فخر قرار دے سکتے ہیں، اگر ہم فاتحین عالم کی کچھ یادگاریں قائم کر کے اپنی سعادت مندی اور فرض شناسی کا ثبوت دے سکتے ہیں تو ہمیں ایک ایسی عظیم و جلیل شخصیت کا تعارفی نمبر نکالنے میں کیوں تامل ہو۔ جس کی عملی بارگاہ کو ہندوستان اور بیرونِ ہند میں نصف صدی سے زائد تک مرجعیت اور مقبولیت حاصل رہی۔ اور جس کی اسلامی بصیرت اور فقیہانہ دانشوری نے امت کی امامت اور قیادت کے فرائض انجام دیئے جو بزرگ ہستی منصبِ شریعت اور مسند افتاء پر جلوہ افروز ہو کر عالم اسلام سے خراجِ عقیدت حاصل کرتی رہی اور جس نے ملک کے محاذ

آزادی میں شریک ہو کر قومی سیاست کو تازہ روح بخشی۔ کیا وہ اس بات کی مستحق نہ تھی کہ ایک خاص نمبر کے ذریعے اس کی بے داغ علمی شہرت اور بے مثال ملی اور قومی خدمات کی یاد آوری ہو اور ان کے بے ریا اخلاص کے تذکار سے دلوں کو عقیدت و عرفان کی روشنی اور حرارت پہنچے۔

آج کے جمہوری اور لادینی دور میں دینی مآثر کے نقوش روز بروز مدھم پڑتے جا رہے ہیں اور اشخاص سے گذر کر علمی نظریات تک کو گھن لگنا شروع ہو گیا اور یہ وقت کا تقاضا اور سیاسی نظام کا قدرتی نتیجہ ہے جس کو بدلنے میں کوئی مزاحمت سود مند نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر ہم اپنے معتقدات اور ان کے سرچشموں پر ماحول کو اثر انداز ہونے کی اجازت دیتے رہے اور ہم نے اپنے بزرگوں کی دینی خدمات اور علمی کارناموں کا تحفظ نہ کیا اور اپنی بے حسی کی بدولت اپنے مشاہیر کو خود فراموش کر بیٹھے تو یہ امت کا اتنا بڑا نقصان ہو گا جس کی تلافی حال اور مستقبل کے کسی دَور میں نہیں ہو سکے گی۔ مسلمانوں کے دِلوں سے یوں بھی دینی علوم کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے، لیکن اگر انھوں نے ان اعاظم رجال کو بھی نظر انداز کر دیا جن کو ہمارے اسلامی احساس کی نمود کہنا چاہیے تو یہ ہمارے باطنی ارتداد کی ایک افسوسناک علامت ہو گی اور ہم ایمان کے اس قلعہ کی حفاظت نہ کر سکیں گے جس کو اب تک ناقابل تسخیر سمجھا جاتا رہا ہے!

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ اپنے دَور کے ایک فقیہ، ایک مفتی اور ایک دینی پیشوا ہی نہ تھے، بلکہ عقلی اور فکری اعتبار سے بھی بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ انھیں جو چیز امتیاز بخشتی ہے وہ ان کی مجتہدانہ بصیرت معاملہ فہمی، اصابت رائے اور قوت فیصلہ کی بے پناہ طاقت تھی۔ معاملہ خواہ کیسا ہی معمولی ہو اس پر پوری توجہ دینا آپ کی عادت میں داخل تھا۔ فہم کی رسائی اور دماغ کی کار فرمائی کا یہ عالم تھا کہ جن مسائل کو سطح پر لانا جماعتوں کے لیے مشکل تھا آپ انھیں بہت آسانی سے روشنی میں لے آتے تھے۔ ہم جس قوت کو تدبر اور تفقہ کے نام سے پکارتے ہیں اور جن کا مصداق صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت آپ کی زندگی کے ہر قدم پر ملتا ہے۔ فقیہانہ نکتہ سنجیوں اور متکلمانہ نکتہ آفرینیوں کا تو جواب نہیں رکھتے تھے۔ اور پھر کوئی مسئلہ خواہ سیاسی ہو یا قومی، ملکی ہو یا بین الاقوامی، آپ کی دسترس سے باہر نہ تھا۔ اور جب آپ اس پر کوئی فیصلہ دیتے تو ماہرین کو بھی اصابت رائے کا اعتراف کرنا پڑتا اور اس پر کسی کو انگلی رکھنے کی گنجائش نہ ہوتی۔

ادارہ الجمعیۃ نے خدا کے فضل اور ارباب قلم کے تعاون سے اس نمبر کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے اور حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ایک ایسا خاکہ پیش کر دیا ہے جو کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ بن سکتا ہے۔ اب یہ ناظرین کرام کا کام ہے کہ مفتی اعظم کے مشن کو سمجھیں اور اسے لے کر آگے بڑھیں۔ اور ان کے تذکار سے اپنے دلوں کو گرمائیں اور اپنی اسلامیت کو اجاگر کر کے مرحوم کی روح کے لیے تسکین کا سامان بہم پہنچائیں گے۔

تاثراتِ الم

حضرت مفتی اعظمؒ کے وصال کے حادثۂ فاجعہ کے موقع پر ملک کی مشہور اور عظیم شخصیتوں نے مختلف موقعوں پر اپنے رنج و الم کا اظہار کیا ہے۔ ہم انہیں ذیل میں مولانا حفیظ الرحمن صاحب واصفؔ صاحبزادہ حضرت مفتی اعظمؒ کی تالیف "مفتی اعظم کی یاد" اور روزنامہ "الجمعیة" دھلی کی خصوصی اشاعت "مفتی اعظم نمبر" کے شکریہ کے ساتھ پیش کررہے ہیں۔

مفتی صاحب دریائے سیاست کے بہترین شناور تھے

از: شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی دامت برکاتہم

وما کان قیسٌ ھلکه ھلك واحدٍ و لکنه ارکانُ قومٍ تھدّما

زین ماتم ار سپہر بقانون گریستے از چشم اختران ہمہ شب خون گریستے

حضرت مولانا المفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ اگرچہ ہزاروں علماء نے حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز سے علوم عقلیہ و نقلیہ کا استفادہ کیا مگر قدرت کی فیاضیوں نے جو خاص جامعیت اور سابقیت مفتی صاحب مرحوم کو عطا فرمائی تھی وہ بہت ہی کم کو نصیب ہوتی ہے۔ مفتی صاحب مرحوم ابتداء ہی سے نہایت ذکی، سمجھدار، مستقل مزاج، عالی حوصلہ، معاملہ فہم واقع ہوئے تھے۔ آپ کو علوم عقلیہ اور نقلیہ سے بھی طبعی مناسبت تھی۔ تقریر و تحریر کے میدانوں میں آپ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اور دوسروں کے مقابلہ میں بازی لے گئے۔

اخلاقِ فاضلہ میں خداوندِ عالم نے کمال عطا فرمایا تھا۔ دریائے سیاست کے بہترین شناور تھے۔ تدبر و تفکر کے انمول موتیوں سے آپ کا دامن بھرا رہتا تھا۔ ہر معاملہ کی گہرائی اور آخری تہہ تک پہنچنا آپ کی ذکاوت کا ہمیشہ شاہکار رہا ہے۔

جس طرح آپ بلند پایہ مفتی، وسیع النظر عالم، دور اندیش زیرک، دقیقہ رس سیاست داں تھے ایسے ہی آپ بہترین مدرس اور استاد بھی تھے۔ دقیق و غامض مضامین کے سمجھانے کا بہترین ملکہ خداوند عالم نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔

علمی کمالات کے ساتھ حسن خط کی بدولت بھی آپ کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔ خطاطی گویا فطری جوہر تھا۔ چنانچہ نسخ اور نستعلیق دونوں قسم کے خطوں پر آپ بے نظیر مہارت رکھتے تھے۔

تحریک آزادی وطن اور خلافت کمیٹی کی تائید اور جمعیۃ علماء ہند کی رہنمائی میں آپ نے جس فراست اور استقلال کا ثبوت ۱۹۱۸ء سے لے کر وفات کے وقت تک دیا۔ ہندوستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ قومی لوگوں کی زندگی اس کی مثال سے خالی ہے۔

شہرت طلبی اور نام و نمود کی خواہش کی ہوا بھی آپ کے پاس سے ہو کر نہیں گذری تھی۔ فروتنی اور تواضع میں آپ بالکل اپنے استاذ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ کے قدم بقدم اور آسمانِ تقویٰ کے چمکتے ہوئے ستارے تھے۔ باوجود اعلیٰ قابلیتوں کے (جن کے ذریعے وہ بڑی

سے بڑی عزت، شہرت اور دولت حاصل کر سکتے تھے) آپ نے یکسوئی اور گمنامی کے گوشہ میں ساری زندگی گذار دی۔ بہر حال حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی وفات اور جدائی نے ہم خدام جمعیۃ کی کمر توڑ دی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

لا یدرکُ الواصف المطرِیْ خصائصه ولو سابقا فی کل ما وَصَفا
حلف الزمان لیاتین بمثله
حنثت یمنیک یا زمانُ فکفّرِ

فرضی اللّٰه عنه وارضاه وخلف علینا بخیرٍ

میرے دل میں ان کی بڑی قدر ھے

پنڈت جواہر لال نہرو

(تقریر باجلاس کانگریس کمیٹی منعقدہ ۱۴؍ جنوری ۱۹۵۳ء بمقام اردو پارک، دہلی)

آج سے ۳۳ سال پیشتر تحریکِ خلافت کے زمانہ میں جب میں گاندھی جی کے ساتھ دہلی آیا تھا تو مفتی صاحب سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وائسرائے کے پاس ایک وفد بھیجنے کے سلسلہ میں گاندھی جی کو دہلی آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس زمانہ میں خلافت کمیٹیوں کے جلسے بھی ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب ایک جلسہ میں گاندھی جی نے اپنی تحریک "ترکِ موالات" کا ذکر کیا تو کچھ لوگ پیچھے ہٹے، کچھ نوجوانوں نے قبول کیا اور کچھ سن رسیدہ بزرگوں نے اس سے اختلاف کیا کیونکہ یہ تجویز ایک انوکھی تجویز معلوم ہوتی تھی لیکن حضرت مفتی صاحب نے اس تحریک کی حمایت کی کیونکہ یہ ایک صاف اور سچی تجویز تھی۔ اس کے بعد کانگریس نے باضابطہ طور پر اس تحریک کو منظور کیا، جہاں لوگ اس تحریک کو قبول کرنے میں جھجکے وہاں حضرت مفتی صاحب کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے۔ وہ ایک سیدھے، وہ ایک سیدھے، قابل، صاف اور ستھرے ذہن کے انسان تھے۔ ایسے آدمی کم ہوتے ہیں اور ایسے ہی آدمی کی قدر کی جاتی ہے۔ ان کے گزرنے کا افسوس ہے۔ انھوں نے پوری زندگی ایک شان کے ساتھ گزاری، آزادی کے بعد سے اب تک کے زمانہ پر اگر نظر ڈالی جائے تو بہت سی باتیں ایسی ہوئیں اور بہت سی تحریکیں ایسی چلیں جن سے دکھ ہوا۔ اور جو ناگوار گزریں، ہمیں ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک گرہ کھولتے ہیں تو دو گرہیں بندھ جاتی ہیں۔ اگرچہ دنیا کی حالت ہندوستان سے بہت زیادہ خراب ہے۔ پھر ہم یہ سوچتے ہیں کہ جن خیالوں کو ہم لے کر چلے تھے آج کے مسائل کو حل کرنے میں وہ کہاں تک موزوں ہیں۔ تیس برس کی تعلیم جو معقول تعلیم ہے ذہن سے نہیں ہٹتی۔ وہ باتیں جو بظاہر ملک منظور کر چکا تھا بعض لوگ اب انھیں منظور نہیں کرتے اور ایسے راستہ نکالتے ہیں جن سے نفاق، جھوٹ اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمیں ملک کو آگے بڑھانا ہے۔ وہ بھولتے ہیں کہ آزادی کی نگرانی کے لیے صرف فوجیں کافی نہیں ہوتیں وہ تو صرف بیرونی خطرات کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ بلکہ اس کے لیے ذہنی اخلاص کی ضرورت ہے، آزادی سے پہلے جو سوال ہمارے سامنے تھا وہ آزادی کے بعد آج بھی موجود ہے جو سبق ہم نے سیکھا اس پر عمل کیا اور جن لوگوں سے سبق حاصل کیا ان میں مفتی صاحب ایک خاص آدمی تھے۔ سیاسی میدان میں بہت سے لوگ آئے لیکن ایسی سادگی کی مثال نہیں ملتی۔ لوگ عہدوں کے بھوکے ہوتے ہیں۔ مفتی صاحب اگر پسند فرماتے تو وہ ہر عہدہ حاصل کر سکتے تھے۔ افسوس وہ گذر گئے لیکن مجھے امید ہے کہ ان کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

(اقتباس تقریر پنڈت جواہر لال نہرو بموقع جلسہ تعزیت کانگریس کمیٹی، ۱۴؍ جنوری ۵۳ء)

مفتی صاحب ملکی و قومی کام میں پیچھے نہیں رہے

مولانا ابوالکلام آزاد

(تقریر باجلاس کانگریس کمیٹی منعقدہ ۴ر جنوری ۱۹۵۳ء بمقام اردو پارک، دہلی)

مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اُن لوگوں میں سے تھے جو اپنی زندگی کا اعلیٰ مقصد اپنے سامنے رکھتے ہیں، اپنی زندگی اس مقصد کی تکمیل کے لیے صرف کرڈالتے ہیں۔ ان کی زندگی کا عظیم مقصد دین علم اور ملک کی خدمت کرنا تھا۔ وہ ایک مستند عالم تھے اس لیے قدرتی طور پر ان کا یہ فرض تھا کہ وہ دینی خدمات کرتے رہیں۔ چنانچہ تمام زندگی انھوں نے اس مقصد کے لیے گذار دی۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ شاہ جہاں پور کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت بھی شاہ جہاں پور میں ہی ہوئی۔ اس کے بعد دیو بند میں انھوں نے اپنی تعلیم کو تکمیل تک پہنچایا۔ دہلی آئے اور اپنی تمام زندگی علم دین کی خدمات کرنے میں بسر کردی۔ مدرسہ امینیہ میں وہ درس دیا کرتے تھے۔ شروع شروع میں ان کی تنخواہ بیس اور پچیس روپیہ کے درمیان تھی۔ اس وقت مدرسہ امینیہ سنہری مسجد میں تھا۔ بعد میں جب مدرسہ امینیہ کشمیری دروازہ منتقل ہو گیا تو وہاں درس دینے لگے وہ ایک معمولی تنخواہ پر اپنا گذر کرتے رہے (در حقیقت حضرت مفتی صاحب نے اُن علماء کی آنکھیں دیکھی تھیں جو اپنی خوشی سے غریبی کی حالت میں اپنی زندگیاں بسر کیا کرتے تھے۔

وہ عالم دین تھے اور دین کا اشارہ تھا کہ وہ ملکی اور قومی کام بھی کریں، چنانچہ اس کام میں وہ کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

۱۹۲۰ء میں جب میں جیل سے رہا ہوا تو اُن سے ملاقات ہوئی۔ میں اس وقت سے برابر اُن کی زندگی کو پرکھتا رہا۔ اُن کی ہمت، جرأت اور استقامت کبھی متزلزل نہیں ہوئی۔ یہ وہ طوفانی دور تھا کہ بڑی بڑی شخصیتیں اس دور میں بہہ گئیں، لیکن میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب کے عزم، ہمت اور استقلال میں ذرا فرق نہ آیا اور ان طوفانوں کی پرچھائیں بھی اُن پر نہیں پڑی۔ انھوں نے ایک فیصلہ کیا تھا اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ کانگریس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ زندگی کے آخری لمحات تک انھوں نے اس راستہ سے قدم نہیں ہٹایا۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی روح ہم سے قریب ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے، اور ہندوستان کی تاریخ میں ان کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

(اقتباس تقریر مولانا آزاد بموقع جلسہ تعزیت کانگریس کمیٹی ۴ر جنوری ۵۳ء)

وہ حضرت شیخ الہند کے سچے پیروکار تھے

مفتی صاحب اپنے تجر علوم اسلامی کے باعث عالم اسلام میں تو مشہور تھے ہی لیکن انھوں نے اپنی زندگی کے آخری پچاس سال میں ملک اور وطن کی ایسی خدمات انجام دی ہیں کہ غیر مسلم حلقوں میں بھی ان کا نام نہ بھلایا جاسکے گا۔ وہ عدیم المثال مدبر مفکر اور جنگ آزادی کے سپہ سالار تھے۔ اتحاد اور آزادی کی جدوجہد میں وہ اپنے استاد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سچے پیرو تھے۔ ابتداء ہی سے وہ تحریک آزادی میں شامل رہے اور پورا پورا حصہ لیتے رہے۔

ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں جب پہلی بار مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو مفتی صاحب نے اس میں پورا پورا حصہ لیا۔ اور خطبہ صدارت کی ترتیب میں اہم مشورہ اور امداد دی۔ تحریک خلافت میں مفتی صاحب مرحوم برابر حصہ لیتے رہے۔ لیکن اپنی عملی اور مذہبی سرگرمیوں کو کبھی منقطع نہ ہونے دیا۔

نمک سازی کی تحریک

نمک سازی کی تحریک کے زمانے میں وہ بہت چاہتے تھے کہ گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد خود نمک بنانے والے ایک دستہ کی قیادت کریں لیکن دوسرے بزرگوں نے ان کو روک دیا۔ کسی شخص کی سیرت اور کردار کا صحیح اندازہ اس کے ساتھ سفر کر کے یا جیل میں رہ کر ہو سکتا ہے۔ میرا اور ان کا جیل میں بھی ساتھ رہا اور سفر میں بھی۔ سفر حج جو اس زمانے میں ہر قسم کی مشکلات اور مصائب سے بھرپور تھا۔

جیل میں حضرت مفتی صاحب کا سلوک تمام قیدیوں کے ساتھ خواہ وہ کسی کلاس سے تعلق رکھتے ہوں ایسا تھا کہ جب وہ گجرات جیل سے رہا ہوئے تو تمام قیدی ان کی جدائی میں روتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم سے ایک بڑی نعمت علیحدہ کی جا رہی ہے۔

حضرت مفتی صاحب کے فتاویٰ کو عالمِ اسلام میں جو مقبولیت حاصل تھی وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ وہ ایک عزم کے انسان تھے۔ اس میں کبھی لچک پیدا نہیں ہوئی۔ چنانچہ تقسیم کے بعد جب مجسٹریٹ کے ذریعہ انھیں یہ پیغام دیا گیا کہ انھیں اور ان کے متعلقین کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دیا جائے۔ تو مفتی صاحب مرحوم نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور جواب دیا کہ جو عام مسلمانوں کا حشر ہو گا وہی میرا بھی ہو گا۔ میں اپنا مکان نہیں چھوڑ سکتا۔

(اقتباس تقریر سحبان الہند بموقع جلسۂ تعزیت)

ڈاکٹر سید محمود صاحب نے اپنی تقریر میں مفتی صاحب کو خراج عقیدت کرتے ہوئے کہا کہ "مفتی صاحب نے جس بہادری سے اپنی ساری زندگی بسر کی اُسی بہادری کے ساتھ انھوں نے اپنی موت کا بھی مقابلہ کیا۔ چنانچہ آخیر وقت میں انھوں نے دوائیں استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں ہر شخص کو زندہ رہنے کی کتنی خواہش ہوتی ہے۔ لیکن مفتی صاحب کی ذات اس کے بالکل برعکس تھی، وہ عرصہ تک جمعیۃ علماء کے صدر رہے تھے اور اپنی انتھک کوششوں سے انھوں نے جمعیۃ کو قائم کیا تھا۔ ترک موالات کی تحریک کے سلسلہ میں پانسو علماء سے فتویٰ حاصل کرنا صرف مفتی صاحب ہی کا کام تھا جو تاریخ میں یاد رہے گا۔ حضرت مفتی صاحب کے لیے اس سے بہتر اور کوئی دعا نہیں ہو سکتی کہ اپنی آزادی کو قائم رکھیں جس کے وہ ایک ہیرو تھے۔

(اقتباس تقریر ڈاکٹر سیّد محمود صاحب بموقع جلسۂ تعزیت)

موت العالِم موت العالَم

آہ! حضرت العلامہ محمد کفایت اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) کس قلم اور کس زبان سے یہ لکھوں اور یہ کہوں کہ آج دنیائے اسلام کی ایک مایۂ ناز ہستی اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھار گئی۔ روحِ علم و تقدس نے ہم سے منہ موڑ لیا۔ علم و تقویٰ کا بحرِ ناپیدا کنار مسندِ افتاء کا مفتی اعظم آج ہم سے جدا ہو گیا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ وانا للہ وانا الیہ راجعون۔

طویل علالت کے دوران صبح و شام کی حاضری میں قلبِ مضطر کے لیے یہ منظر کس درجہ حسرت آمیز اور درد انگیز ہوتا تھا کہ ایک طرف مرض کی شدت و کرب اور دوسری جانب یادِ خدا اور رجوع الی اللہ کا رقت انگیز جذبہ کار فرما تھا۔ مفتی صاحب کی ذاتِ ستودہ صفات ایسی جامع اور کامل تھی کہ اجتماعی و انفرادی شعبہ ہائے حیات کا ہر پہلو جس میں نمایاں نظر آتا تھا۔

جنگ آزادی کا راہنما، قانونی اور دستوری معاملات کا بہترین مدبّر و مفکر، مسندِ علم کا متبحر، جادۂ عمل کا پیکر، تقویٰ و تقدس کا امام اس مجموعہ

حسنات کا دوسرا نام "کفایت اللہ" جس کے فیضان سے آج دُنیا محروم ہو گئی۔
قلبِ حزیں میں یہ طاقت ہی کہاں ہے کہ اس مردِ باخدا کی جدائی اور فراق کا تحمل کر سکے۔ اور نوکِ قلم کو یہ جرأت ہی کب ہے کہ آج اس مقدس ہستی کا مرثیہ کہہ سکے۔ اب درگاہِ باری میں یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مردِ حق آگاہ کو فردوسِ اعلیٰ نصیب فرمائے اور ان کے پسماندگان اور ہم جیسے مجروح قلب خدام کو صبرِ جمیل کی توفیق بخشے۔

ان کے فتاویٰ پر سب کو اعتماد تھا

مولانا عبد الماجد دریابادی (ایڈیٹر صدق جدید)

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہجہاں پوری ثم الدہلوی نور اللہ مرقدہٗ کی وفات کو کئی ہفتے ہو چکے اور ملک کا گوشہ گوشہ اب تک ان کے ماتم و شیون سے گونجا ہوا ہے۔ خود پاکستان تک، سیاسی اختلاف کے باوجود تعزیت میں پیچھے نہیں۔ زندگی بھر مسلمانوں کے مکرم و محترم رہے، سالہا سال جمعیۃ علماء کے صدر، ایک بڑی دینی درسگاہ کے روحِ رواں، اور مجلس خلافت کے اہم رکن و کارکن۔ لیکن آپ کو علم ہے کہ اتنے بڑے مقتدا، جید عالم اور شیخِ وقت کیا تھے؟ نہ سید نہ حسنی نہ حسینی نہ صدیقی نہ فاروقی نہ علوی نہ عثمانی باوجود اس کے آپ نے دیکھا کہ بڑے بڑے عالی نسب شیخ اور سید ان کے علم و فضل تقویٰ اور تدین کے آگے جھکتے رہے۔ بڑے سے بڑے علماء اور مشائخ ان کے پیچھے نماز پڑھتے رہے۔ ان کے دینی فتوے سب پر چلتے رہے۔ مخالفوں اور معاندوں میں بھی کبھی کسی کو انگشت نمائی کرنے بلکہ اُدھر اشارہ کرنے کی جرأت نہ پڑی۔ یہ فیض اگر اسلام اور شارع اسلام کا نہ تھا تو اور کس کا تھا؟ اس بیسویں صدی کے گئے گزرے ہوئے اسلام کا بھی!

امتیازِ نسبت را پاک سوخت آتش او ایں خس و خاشاک سوخت
بر نسب نازاں شدن نادانی است حکم او اندر تن و تن فانی است

اور خود اقبالؔ جنھوں نے یہ ترانہ گایا ہے وہی کون سے سیّد زادے یا شیخ زادے تھے؟ اور اسلام کی ساڑھے تیرہ سو سال کی تاریخ میں یہ مثالیں نئی اور انوکھی کب ہیں؟

مفتی اعظم کی خصوصیات

مولانا محمد منظور نعمانی مدیر رسالہ "الفرقان" لکھنؤ

قارئین "الفرقان" اب سے بہت پہلے اخبارات میں مفتی ہند حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ (علیہ الرحمۃ والغفران) کی خبر وفات پڑھ چکے ہوں گے۔ اگرچہ کسی کی بھی موت اس حیثیت سے غیر معمولی حادثہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں آنے والے ہر انسان اور ہر جاندار کی آخری منزل موت ہی ہے۔ اور یہ ہر شخص کی جانی بوجھی بات ہے۔ لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ جن بندوں کی زندگی غیر معمولی ہوتی ہے اُن کی موت بھی اپنے اثرات کے لحاظ سے عام لوگوں کی موتوں کے مقابلے میں غیر معمولی ہی ہوتی ہے۔ اور دُور نزدیک والے اس سے اس طرح متاثر ہوتے ہیں جس طرح کہ غیر معمولی واقعات و حوادث سے متاثر ہوا کرتے ہیں۔ علم دین میں حضرت مفتی صاحبؒ کی بلند مقامی اور خاص کر فقہ و فتاویٰ میں ان کی مرجعیت اور سیاسیات میں ان کی خاص بصیرت اور ذہن و فکر کا سلجھاؤ یہ تو وہ چیزیں ہیں جن سے کسی درجے میں وہ

لوگ بھی واقف ہوں گے جن کی واقفیت کا ذریعہ اخبارات یا دوسرے وسائط ہوں گے، لیکن ان کے علاوہ حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے غیر معمولی کمالات سے بھی نوازا تھا جن سے صرف وہی حضرات واقف ہوں گے جنھیں نزدیک رہنے اور قریب سے دیکھنے اور برتنے کا زیادہ موقع ملا ہوگا۔ یہ عاجز حضرت مفتی صاحبؒ کی علمی عظمت کا پوری طرح قائل ہونے کے باوجود ان کے دوسرے قسم کے کمالات سے ہمیشہ زیادہ متاثر رہا۔ ان میں سے ان کے جس کمال کا نقش میرے دل پر سب سے زیادہ گہرا ہے وہ اُن کی بے انتہا تواضع اور بے نفسی ہے۔ اس بارے میں اس عاجز کا جو تاثر اور احساس ہے واقعہ یہ ہے کہ اس کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ نے ان کو جتنی بلندیاں عطا فرمائی تھیں وہ اُتنے متواضع اور بے نفس تھے۔ ان سے ملنے والے ان کے کسی نیاز مند نے بھی کبھی محسوس نہ کیا ہوگا کہ وہ اپنے کو کچھ بھی سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات اپنے بہت چھوٹوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے اور ایسا معاملہ کرتے کہ انھیں شرم آتی، اس عاجز نے اس مقام کی کسی شخصیت میں کبھی اس درجہ کا تواضع نہیں دیکھا۔ دوسری جس خصوصیت سے یہ عاجز بہت متاثر ہوا وہ یہ ہے کہ سفر و حضر کی سیکڑوں صحبتوں میں میں نے کبھی ان کی زبان سے، نہ نجی گفتگو میں، اور نہ مجلسی بحثوں اور گفتگوؤں میں، کسی بڑے سے اپنے مخالف کے متعلق بھی کوئی سخت لفظ کبھی نہیں سنا۔ اسی طرح کبھی غیبت کا کوئی کلمہ سننا یاد نہیں۔

تیسری خاص بات جس سے عاجز بہت متاثر ہے یہ ہے کہ بعض حدیثوں میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق آتا ہے کہ: "کان یخدم نفسہ" (آپ خود ہی اپنے خادم تھے، اپنے گھر اور اپنی ذات کے معمولی معمولی کام خود کر لیا کرتے تھے) حضرت مفتی صاحبؒ اس اسوۂ نبیؐ کے خاص نمونہ تھے، اس بلند مقامی کے باوجود اپنے گھر کے بچوں کے بہت سے ایسے معمولی اور حقیر کام خود کیا کرتے تھے جن کے کرنے میں ایک معمولی آدمی بھی اپنی توہین سمجھے گا۔ واقع یہ ہے کہ یہ عاجز حضرت مفتی صاحبؒ کی ان سیرتی خصوصیات سے اتنا متاثر ہے کہ اگر ان کے ہاتھ پر کھلی کرامتیں دیکھتا تو غالباً اس سے زیادہ متاثر نہ ہوتا۔

حضرت مفتی صاحبؒ اُن اکابر دین میں سے تھے جن کی علمی عظمت و عقیدت اور ان کے علم پر اعتماد کی وجہ سے بہت سے لوگ غلطیوں اور فتنوں سے محفوظ رہتے تھے، اس لحاظ سے آپ کی وفات اس دورِ فتن میں ایک بڑا دینی سانحہ ہے۔

اللهم تحرمنا اجره ولاتفتنا بعده واغفرله وارحمه اِنّك انت الغفور الرحيم۔

آہ تعلیم الاسلام والے مفتی صاحب

مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دہلوی

جامع مسجد کے پلیٹ فارم پر ملک کے ممتاز علماء و مشائخ کا اجتماع تھا اور ہر شخص حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر اپنے احساسات رنج والم کا اظہار کر رہا تھا۔

اس اجتماع میں مفتی اعظم کی علمی اور دینی خدمات پر مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا اور عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ حضرت مفتی صاحب کی رُوحِ پر فتوح کے لیے زیادہ سے زیادہ مالی اور بدنی ایصالِ ثواب کریں۔

جو حضرات خود علوم اسلامی کے ماہر تھے، حدیث و فقہ کے فاضل تھے، ادب و کلام کے استاد تھے، تصوف و احسان کے امام تھے، جنگِ آزادی کے جاں باز مجاہد تھے، ان کا مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر یہ کہہ دینا کہ حضرت مفتی صاحب کی وفات سے ہم خدامِ علم کی کمر ٹوٹ گئی، کچھ کم اثر انگیز نہ تھا۔

مجمع پر سکوت طاری تھا،لوگوں کی آنکھیں نمناک تھیں۔ ہر شخص غم میں سر جھکائے یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ جلسہ کے بعد جب میں جامع مسجد سے باہر نکلا تو دو نو عمر لڑکے آپس میں یہ گفتگو کرتے سنائی دیے۔

"تعلیم الاسلام والے مفتی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے نا! یہ اس کا جلسہ تھا۔"

ان الفاظ نے میرے دل و دماغ پر وہ اثر کیا جو جلسہ کی پر سوز تقریریں بھی نہ کر سکیں۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ حضرت مفتی اعظم کی وفات سے خواص و عوام کا ہر طبقہ متاثر ہوا ہے۔ اور حضرت مفتی اعظم اُن گنے چنے اکابر علم و فضل میں سے ہیں جن کی جدائی نے صرف بڑوں کو ہی مبتلائے غم نہیں کیا بلکہ چھوٹے بھی ان کی جدائی میں سوگوار ہیں۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا۔

سنا جناب نے! اگر محدثین ایک بے بدل محدث پر آنسو بہا رہے ہیں۔ اگر ارباب فقہ، فقہ اسلامی کے ایک مجتہد کی رحلت پر ماتم کناں ہیں، اگر ارباب سیاست ایک سیاسی مدبر کے انتقال پر اظہار رنج و غم کر رہے ہیں۔ اگر جنگِ آزادی کے سپاہی ایک مجاہد وطن کی محرومی پر کف افسوس مل رہے ہیں تو ملت کے نونہال بھی یہ کہتے ہوئے جا رہے ہیں۔

"تعلیم الاسلام والے مفتی صاحب کا انتقال ہو گیا۔"

آج جس طرح فقہ و حدیث کے حلقوں اور تفسیر و کلام کی محفلوں پر حضرت مفتی اعظم کی وفات حسرت آیات سے رنج و الم کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں تو اسی طرح ان مدرسوں اور مکتبوں میں بھی مفتی اعظم کا سوگ منایا جا رہا ہے۔ جہاں ملت کے نونہال تعلیم الاسلام جیسی بے مثال کتاب پڑھ کر اپنے دین و ایمان کو اُستوار کر رہے ہیں۔

مفتی کفایت اللہ مرحوم

مولانا محمد اسماعیل ذبیح

ہندوستان کے علماء کرام میں حضرت شیخ الہند کے بعد سیاسی ذکاوت اور نکتہ رسی میں مفتی صاحب مرحوم کا کوئی دوسرا حریف نہ تھا۔ اصابت رائے۔ معاملہ فہمی آئینی موشگافیوں اور سیاسی تحریکات کی نبض شناسی میں مفتی صاحب گاندھی جی، موتی لال نہرو، قائداعظم، پنڈت مالویہ۔ آزاد و انصاری اور پریزیڈنٹ پٹیل کی صف کے آدمی تھے۔ اسی صف اور انہی لوگوں میں بیٹھ کر انھوں نے بارہا اپنی بات منوائی۔ وہ انگریزی زبان اور اُس کے علوم سے نا آشنا ہوتے ہوئے بھی انگریز اور ہندو ذہنیت کا مکمل جواب تھے۔ اور ان کی ذہنی و فکری سطح اس معیار پر تھی جو ایک ماہر آئین کی ہو سکتی ہے۔ مفتی صاحب کانگریس کے صدر بھی بن سکتے تھے۔ اور مسلم لیگ کے بھی۔ بشر طیکہ وہ شہرت پسندی، پارٹی بازی اور سیاست میں تھوڑی سی گندگی کی آمیزش کو قبول کر لیتے اور مصلحت کی چادر میں ضمیر کو لپیٹ سکتے۔ مفتی صاحب نے ہندوستانی سیاست کی اہم تحریکات اور معرکہ کے مسائل میں قائدانہ شرکت کر کے اور پشاور فائرنگ کی رپورٹ تیار کر کے اپنی شخصیت کا کمال دنیا سے تسلیم کرالیا تھا۔ مگر تھے وہ ایک پُرانی وضع کے عالم دین ہی۔ یعنی مدرسہ امینیہ دہلی کے صدر مدرس جس پر وہ ساری زندگی فائز رہے۔ ان کا لباس، ان کا رہن سہن۔ ان کا طرز زیست اور عادات و خصائل سب کچھ مجاہدانہ تھا۔ کوچہ چیلان کے ایک مکان میں رہنا۔ روزانہ بازار سے اپنے اور دوسروں کا سودا سلف خرید لانا۔ غریبوں کی مدد کرنا اور دینیات کی کتابوں کا درس دینا بس یہی ان کا روزمرّہ کا معمول تھا۔ عربی ادب اور فقہ میں ان کو امام فن کا درجہ حاصل تھا۔ ان جیسا مفتی اب شاید ہی دنیا کو میسر آئے۔ مفتی صاحب کی بعض تصانیف ناشروں کے لیے گراں قدر آمدنی کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ مگر خدمت دین کے جذبے کے پیش نظر خود مفتی صاحب نے اپنی تصانیف کو اپنے لیے محفوظ نہیں کیا اور اس طرح

لاکھوں روپے کی آمدنی سے دستبردار ہوگئے۔ جمعیۃ علماء ہند کے وہ دماغ بھی تھے اور ساکھ بھی وہ سیاسی تعصب اور انتہاپسندی دونوں سے خالی تھے۔ اس لیے ہندوستان کی مختلف سیاسی پارٹیوں بلکہ خود انگریز حکمرانوں تک کو ان کی سنجیدگی اور معقولیت کا اعتراف تھا۔

زندگی کے آخری برسوں میں وہ سیاسیات سے کنارہ کش ہوگئے تھے اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا نقطۂ نظر نہ انتہاپسند ہندو لیڈر شپ کو قبول تھا اور نہ علیحدگی پسند سیاستدانوں کو۔ وہ اگرچہ مشکل سے مشکل آئینی اور سیاسی اختلافات میں "مصالحتی فارمولا" پیش کرنے میں سند مانے جاتے تھے، مگر ۴۵ء کے بعد ایسی کوششوں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد علماء میں سے وہ شخص جاتا رہا جس نے مدرسہ و مکتب کی تخلیق کو آکسفورڈ اور کیمبرج کے معیار پر پہنچا دیا تھا۔

آہ! مفتی اعظم

میر مشتاق احمد صاحب

در مقام لانیا ساید حیات سوئے الا می خرامد کائنات

سالِ نو (۱۹۵۳ء) کی آمد میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مفتی اعظم کی روح پاک کو اپنی طرف بلا لیا۔ علم کا چراغ گل ہو گیا۔ عالم اسلام کے علمی خزانے کا در بے بہا ہمارے درمیان نہ رہا۔ فقیہ زماں نکتہ داں عالم بے بدل چل بسے اور ایک شاندار تاریخ یادگار کے طور پر چھوڑ گئے۔ وہ عالم باعمل تھے۔ ان کی ذات میں بے حد خوبیاں تھیں۔ وہ جامع صفات تھے۔ علم و حلم، انکساری، مروّت و شفقت و محبت، اتقاء و پرہیزگاری، حق گوئی و بے باکی کا مجسمہ تھے۔ لیکن نمود و نمائش کی خواہش نہ تھی۔ حضرت مفتی صاحب نے دین کو سیاست کے تابع نہیں کیا، بلکہ سیاست اور مادی دنیا کو دینِ حق کے تابع رکھا۔ وہ حکومت اور درباری ضرورتوں سے بے نیاز تھے۔ اللہ کی امانت تھے۔ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ حضرت العلماء ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے راہنما تھے۔ آپ نے ملک کو برطانوی پنجۂ اقتدار سے نجات دلانے کے لیے میدانِ عمل میں آکر نہ صرف راہ نمائی کی بلکہ جیل کی زندگی کو لبیک کہا اور خطرناک موڑوں پر استقلال و استقامت کا ثبوت دیا۔ آپ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ قصہ خوانی بازار کے خونی واقعہ پر جو انکوائری کمیٹی کانگریس نے مقرر کی تھی، آپ اس کے ممبر تھے۔ آپ ہمیشہ قومی یکجہتی اور قومی ایکتا کے علمبردار رہے۔ آپ نے کبھی فرقہ پرستی کی طاقتوں کے سامنے سر نہ جھکایا۔ آپ کی سیاسی فراست اور دیانت کی تعریف ہر موافق اور مخالف تسلیم کرتا تھا۔ آج کے بہت سے سیاستداں اور وزیر حضرت مفتی صاحب کے سامنے طفل مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ ایک سچے اور پکے محبِ وطن تھے۔

ایک سانحۂ عظیم سالِ نو کی آمد سے ڈیڑھ گھنٹے پہلے واقع ہوا۔ اللہ کی مرضی یونہی تھی۔ گذشتہ نصف صدی سے یہ شمع ہدایت دہلی کو معرفت کی شعاعوں سے منور کر رہی تھی۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں، لیکن وہ دین حق جس کا وہ مبلغ تھا وہ ہے اور رہے گا۔ اگرچہ وہ پاک اور مقدس روح نہ رہی، لیکن اس کا پاک اور مقدس مقصد ہمارے سامنے ہے۔ آؤ ارادہ کرو، یقین کو عمل کا جامہ پہناؤ، آؤ دین حق کو اپنی زندگی کا عملی جزو بناؤ۔ آؤ عمل کرو۔ آؤ موت آنے سے پہلے کچھ نیکی کریں۔ کچھ خدمتِ مخلوق خدا کریں۔ خداوند کریم اس پاک مقدس روح کے صدقے میں انسانوں کو نیک راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تا چند ناداں غافل نشینی بینی جہاں را خود نہ بینی

ناقابلِ تلافی نقصان

مسٹر شعیب قریشی (سفیر پاکستان)

ہندوستان میں مقیم پاکستانی ہائی کمشنر مسٹر شعیب قریشی نے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ کی وفات حسرت آیات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کی وفات کو ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا۔ مسٹر شعیب قریشی کا پورا بیان حسب ذیل ہے:

"حضرت مولانا الحاج مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کی وفات حسرت آیات کی غم انگیز خبر سن کر مجھے انتہائی رنج والم ہوا۔ میں سالہا سال سے مفتی صاحب سے واقف رہا ہوں۔ مفتی صاحب کا غم نہ صرف ہندوستان اور پاکستان میں منایا جائے گا بلکہ تمام اسلامی دنیا میں ان کی وفات پر ماتم کیا جائے گا۔ کیونکہ ان کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کو پر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک زبردست عالم فاضل مفتی تھے۔ ان کے جاری کردہ فتوؤں کی جو علم اور عقل کے اعتبار سے مستند ہوتے تھے، قدر کی جاتی تھی۔ اور انھیں اٹل سمجھا جاتا تھا۔ ایک مذہبی رہنما ہونے کے علاوہ مفتی صاحب نے ہندوستان کی قومی جدوجہد اور بین الاقوامی مسلم سیاست میں نمایاں کام کیا تھا۔ ہندوستان میں انھوں نے تحریک خلافت میں ایک اہم پارٹ انجام دیا اور عرصہ تک جمعیۃ علماء ہند کے صدر رہے۔

ہندوستان سے باہر انھوں نے عالمی مسلم کانفرنس میں شرکت کی جو مکہ معظمہ میں شاہ ابن سعود نے بلائی تھی۔ بعد کو انھوں نے قاہرہ میں فلسطین کانفرنس کی صدارت کی۔

میں مفتی صاحب کے عزیزوں کے ساتھ رنج و غم میں دل سے شریک ہوں۔ اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ انھیں صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کی روح کو سکون بخشے۔"

مسٹر شعیب قریشی اور ان کے عملہ کے افراد نے مفتی صاحب کے جنازہ کی نماز میں شرکت کی۔ اسٹاف کے ممبران بھی جنازہ کے ساتھ رہے۔

یاد رہے کہ مسٹر شعیب قریشی اپنے عہدہ پر مامور ہو کر جب دہلی تشریف لائے تھے تو سب کاموں سے پہلے مفتی صاحب کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔

آہ قبلۂ دین پناہ مفتی کفایت اللہ

از مرقوماتِ معراجؔ دھولپوری

شد برائے سیرِ چمن قبلۂ ہستیِ دل — مبتلائے دردِ بیحد گشت چوں بزمِ جہاں
رحلتش را عیسوی سن گفت معراجِ حزیں — خلد منزل پاک باطن مفتیِ ہندوستاں

۱۹۵۳ء

دیگر

پردۂ رحمت کشیدہ آں فقیہِ بے بدل — چوں نہفتہ از نگاہِ طالبِ دیدار شد
در تلاشِ سالِ ہجری خاطرم معراج بود — گفت ہاتف رہ نوردِ عالمِ اسرار شد

۱۳۷۲ء

ہندوستان دار الامان ہے

از جناب مولانا محمد ادریس صاحب نسیم دھلوی

یہ فتویٰ ہے اس مفکرِ اعظم و مدبر اعظم کا جو سرزمین ہند میں مفتیٔ اعظم کے لقب سے ممتاز تھا۔ ''انقلاب عظیم آسمانی'' کے بعد جن دِنوں راقم الحروف بسلسلۂ فتاویٰ نویسی حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ان ایام میں میری استدعا پر ''موجودہ ہندوستان'' پر ایک مبسوط تقریر فرمائی اور آخر میں بطور فذلکہ ارشاد فرمایا۔

''موجودہ ہندوستان شرعی اعتبار سے دار الامان ہے۔''

دار العلوم دیوبند میں میرا زمانہ طالب علمی تھا کہ حضرتؒ دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہو کر دیوبند تشریف لے گئے۔ میں سلام کو حاضر ہوا پوچھا کس حجرے میں مقیم ہے۔ عرض کیا حجرہ نمبر ۴۲ احاطہ مولسری، چونک کر فرمایا۔ اچھا! میں اس گھڑی کی مسرت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ جب حضرتؒ نے حجرے میں قدم رکھتے ہی چہار دیواری پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے فرمایا ''میں بھی اس حجرے میں رہا ہوں۔''

سخت روحانی قلق ہے کہ بندہ اپنی طویل اعصابی علالت کے باعث آخری خدمات حتیٰ کہ آخری دیدار سے بھی محروم رہا۔ تاہم اپنی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین کی تسکین خاطر کی غرض سے تاریخی ''قطعات لیل و نہارغم'' (۵۸۰ + ۲ ۷ ۱۳ = ۱۹۵۲ء) موسوم بہ ''نشانی مفتی اعظم'' (۱۹۵۲ء) کتابی شکل میں تیار کیے ہیں، جس میں ''یک صد پارہ غم'' (۱۳۷۲ھ) یعنی تاریخ رحلت کے سو مادے استخراج کر کے درج کیے ہیں۔ ۱۲ مادے آیات سے مقتبس ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ستر اشعار کا مجموعہ ہشتگانہ اقسام تاریخ سے آراستہ تاریخی نثر عبارت میں سوانح بھی قلم بند کر دیئے۔ غرض کہ حضرتؒ کی روحانی بارگاہ میں:

شہرت عام و بقائے دوام کے لازوال پھول بطور ہدیہ پیش ہیں

۲ ۵ ۹ ۱ ء

اس سبد گل کے ایک پھول سے دماغ معطر کیجئے

مکتوبات تعزیت

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کے سانحۂ ارتحال پر جمعیۃ علماء ہند اور ان کے اہل خانہ کو موصول ہونے والی تعزیتی تجویزوں، پیغامات اور تعزیتی مکتوبات کی تعداد ہزاروں سے بھی متجاوز ہے۔ ہندوستان و پاکستان کے تمام اہم دینی، علمی، اصلاحی، ادبی، قومی اور سیاسی اداروں میں تعزیتی جلسے ہوئے اور تجاویز منظور ہوئیں۔ ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے قصبات و دیہات اور شہروں میں تعزیتی جلسوں کا سلسلہ ایک طویل عرصہ تک جاری رہا۔ ہر جگہ حضرت مفتی صاحبؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا۔

اس مختصر سے مجموعہ میں اگرچہ ان سب کو توشامل کرنے کی گنجائش نہیں ہے تاہم ذیل میں کچھ اہم خطوط تعزیت اور تجاویز بطور مشتے نمونہ از خروارے ہم حضرت مرحوم کے صاحبزادے مولانا حفیظ الرحمٰن واصفؒ کی مرتب کردہ کتاب "یادِ مفتی اعظمؒ کی یاد" اور روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی کے "مفتی اعظم نمبر" کے شکریہ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

حضرت قطب المشائخ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ

ڈھوڈھی ڈاک خانہ جھاوریاں، ضلع سرگودھا

مکرم و محترم بندہ جناب مولانا مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصفؔ، از احقر عبدالقادر رائے پوری۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

حضرت مفتی صاحب قدس اللہ سرہ کے انتقال پرملال کی خبر سنی۔ بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ حضرتؒ کے بہت ہی درجے بلند فرمائے اور ترقیات سے نوازے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمادے۔ ہم سے ایک بہت بڑی نعمت چھن گئی۔ اللہ جل شانہ اس کا نعم البدل نصیب فرمادے۔ اس سے زیادہ کیا عرض کروں۔

عبدالقادر ۱۳؍ جنوری ۱۹۵۳ء

حضرت مولانا سیّد مناظر احسن صاحب گیلانی

از بربیگھا ضلع پورنیہ

۸؍ جنوری ۱۹۵۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الی الاخ المصاب مولانا حفیظ الرحمن کفی اللہ لکم کفایۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ علالت کی خبر سب سے پہلے آپ ہی کے ذریعے ملی۔ اور اردو انگریزی اخباروں نے ماتحذر منہ قد وقعا کی خبر جان گسل سنائی۔ وہ جو ابو الامت کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ اس کی تعزیت شخصی طور پر کیا کی جائے۔

عمت فواصله فعم مصابه　　فالناس فيه كلهم ماجور

ولا تقولوا لمن يقتل فی سبيل الله اموات، بل احياء ولكن الا تشعرون٥

کی یافت تو ان ہی کو ہو سکتی ہے، جو اس راہ کے راہی ہیں۔ کم از کم اندھوں سے اتنی حقیقت تو بہر حال مخفی نہیں رہ سکتی کہ:

ردت صنائعه اليه حياته　　فكانه من نشرها منشور

اللہ اللہ! فقیہ جلیل جس کے متعلق واقعی خیال آتا ہے کہ وہ:

عجباً لاربع اذرع فی خمسة　　فی جوفها جبل اشم كبير

یاد آتا ہے خان بہادر رشید احمد مرحوم کا مہمان تھا۔ میں فکر ہی حاضری کی کر رہا تھا کہ کنواں خود پیاسے کے سامنے کھڑا تھا۔ ندامت و خجالت کی حد نہ تھی۔ اور وہ سمجھاتے جاتے تھے کہ آپ میرے یہاں مہمان ہیں۔ میرا فرض تھا کہ آ کر ملاقات کرتا۔

دین کا وہ اعتدالی قالب جو سیدنا الامام الکبیر النانوتوی کے صدقے میں تقسیم ہوا ہے اس کے بہترین نمونے اُٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ فقہی جزئیات کے ناقد بصیر کو اب دنیا کہاں ڈھونڈے گی۔

كل شئ هالك الا وجهه　　فرحمه الله ونور ضريحه

فقط　خاکسار مناظر احسن گیلانی

حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی

از دار الافتاء علمائے لدھیانہ، منڈی بہاء الدین (پنجاب)

مکرم و محترم دام لطفکم العالی. السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آج اخبارات میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر ملال کی خبر پڑھ کر انتہائی صدمہ ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عنایت فرمائے۔

مرحوم کی رحلت سے دنیائے اسلام کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ مرحوم حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار تھے۔ آخری سانس تک ان کے نقش قدم پر چلنے میں مصروف رہے۔ جہاں تک عالم اسباب کا تعلق ہے مسلمانانِ ہند کو جن حضرات پر ہر طرح اعتماد تھا ان میں آپ کی شخصیت ایک نمایاں مقام رکھتی تھی۔ اسلام کے ہر شعبے میں آپ کا فیضان جاری و ساری تھا۔ آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں حضرت شیخ الہندؒ کے بعد انھیں کے نظریوں کے مطابق آپ نے جو نمایاں خدمات انجام دے کر منزلِ مقصود کو حاصل کیا وہ تاریخ ہند میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ میری بدقسمتی ہے کہ آپ مرحوم کے بتلائے ہوئے راستے پر چل کر ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں۔ سب کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے۔ فقط والسلام:

بندہ محمد نعیم عفا اللہ عنہ از منڈی بہاء الدین

۵ر جنوری ۱۹۵۳ء

حضرت مولانا مفتی سیّد مہدی حسن صاحب

صدر مفتی دارالعلوم دیوبند

۵ر جنوری ۱۹۵۳ء

عزیزم مولوی حفیظ الرحمن و خلیل الرحمن سلمهما الله تعالیٰ سلام و دعائے مسنون

میں ۱۹ر دسمبر ۵۲ء سے راجپور روڈ کے شفاخانہ میں بستر علالت پر پڑا ہوں۔ آنکھوں کا آپریشن ہوا ہے۔ ایسی حالت میں حادثۂ فاجعہ کی خبر کانوں میں پڑی کہ ۳۱ر دسمبر ۵۲ء کی شب میں حضرت مفتی اعظم، علامۂ زماں، فقیہ بے نظیر، دنیائے علم و عمل، آفتاب فضل و کمال، علوم کا دریائے ناپیدا کنار، دین و مذہب کا درِ شہوار، جنگ آزادی کا زبردست جری جرنیل و شہسوار، میدانِ سیاست کا یکہ تاز، ثابت قدمی والوالعزمی کا طودِ عظیم، زمانے کا نباض و نبض شناس، طوفانی موجوں کی حرکات کا واقف کار، دنیا کا رہنما، عالم اسلامی کا پیشوا و مقتدا مفتی محمد کفایت اللہ نور اللہ مرقدہ کا وصال ہو گیا۔ اس حادثہ سے جو صدمہ آپ لوگوں کو پہنچا ہے وہ اپنی جگہ پر بالکل بجا اور درست ہے لیکن ساتھ ہی اس کے دہلی میں نہیں بلکہ تمام عالم اسلامی بلکہ ساری دنیا کو مفتی اعظم کے ارتحال سے جو ناقابل تلافی زبردست نقصان پہنچا ہے۔ وہ بھی اپنی جگہ پر بجا اور درست ہے۔ آہ! ہمیشہ کیلئے یہ علم و فضل کا آفتاب غروب ہو کر ہم سے جدا ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کل اجلی مسمیّٰ و الصبر عند الصدمة الاولی

اب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم آپ مل کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کے مزار پر انوار و برکات کی بارش کرے اور ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ میری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں اور جملہ متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے اور مفتی صاحب کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے اور ان کے بعد کسی فتنے میں مبتلا نہ کرے۔ آمین! اللهم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعده واغفرلنا وله برحمتك یا ارحم الراحمین

خادم ناکارہ سیّد مہدی حسن غفرلہٗ شاہجہانپوری

۵ر جنوری ۵۳ء - ۱۸ر ربیع الثانی ۷۲ھ

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

ناظم عمومی جمعیۃ علمائے ہند و ممبر پارلیمنٹ

بسم الله الرحمن الرحیم

برادرم مولانا حفیظ الرحمٰن و خلیل الرحمٰن صاحب السلام علیکم و رحمۃ اللہ

مزاج گرامی! دلی سے دور سی پی میں کامٹی سے واپس آیا تو رات کے ایک بجے لطیف غنی صاحب نے پرچہ بھیج کر حادثۂ عظیم کی اطلاع دی اور یہ کہ دہلی سے بذریعہ ٹیلی فون مجھ کو مطلع کیا گیا ہے۔ جب سفر کے لیے روانہ ہوا تھا تو دل تو جب ہی خطرہ محسوس کر رہا تھا، مگر حکیم صاحب کے اطمینان دلانے پر ارادہ کر لیا۔ وائے بدقسمتی کہ جس روز بد کا خوف تھا وہ سر پر آ کر رہا۔ اور دنیا اس مقدس وجود سے محروم ہو گئی۔ جس کے علم و تقدس کی روشنی دنیائے اسلام کو منور کر رہی تھی۔ موت العالِم موت العالَم کا صحیح مصداق یہی سانحۂ عظمیٰ ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مفتی صاحب کی وفات حسرت آیات پر صرف آپ ہی کے آنسو نہیں نکلے، دنیائے اسلام کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ آپ [illegible]
تقدس میں وہ حادثہ پیش آگیا جو ناقابل تلافی ہے۔ حضرت اقدس آپ ہی کے باپ نہیں تھے، امت مرحومہ کے باپ تھے۔ [illegible]
تقدس کی روح تھے اور اعلائے کلمۃ الحق کے مژدہ اور اسوہ تھے۔

آہ ثم آہ! کہ آج یہ دولت بے بہا ہم سے چھن گئی اور میں جس کی آنکھیں اس ہستی کو دیکھ کر ٹھنڈی ہوتی تھیں آخری دیدار سے محروم [illegible]
گیا۔ تاہم محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد زخمی دلوں کے لیے مرہم ہے۔ الصبر عند الصدمة الاولی۔

اطلاع ملنے پر بہت کوشش کی کہ کسی طرح ہوائی جہاز سے ہی پہنچ جاؤں اور آخری دید سے فیضیاب ہو سکوں۔ لیکن افسوس کامیاب نہ
ہو سکا۔ کیونکہ ساتھ ہی یہ اطلاع بھی ملی کہ تجہیز و تکفین دس گیارہ بجے دوپہر تک ہو جائے گی۔ انما اشکو بثی و حزنی الی اللہ، ان
اللہ مع الصابرین۔

دعاگو محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہ،
یکم جنوری ۱۹۵۳ء

حضرت مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی پٹنہ

یکم جنوری ۱۹۵۳ء

مولانا حفیظ الرحمٰن، دُکھے دل کی تعزیت قبول کیجیے۔ مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی موت موت العالِم موت العالَم کا صحیح مصداق ہے۔
دل کا سہارا ٹوٹ گیا۔ بتائیے اب ہماری جہالت کم مائیگی، بے بصیرتی، کہاں رجوع کرے گی؟ فقہی، علمی، ملی الجھنوں کی سلجھی تعبیر کہاں ملے
گی؟ کس کی نکتہ رسی اور فطانت گہرائی میں ڈوب کر معاملے کے پس منظر کی ہو بہو تصویر کو ہم کور بصروں کے لیے چند سادہ لفظوں میں اجاگر
اور محسوس بنا کر سامنے کھڑی کر دے گی؟

اے اللہ! رحمت کی بارش برسا! اُس نیک نہاد ہستی پر جو سادہ، بے تصنع، فراخ حوصلہ، غیور، بے طمع، دین و ملت کا مخلص خادم، کوہ وقار،
علم کا منار، تقویٰ و ورع کا پیکر، اسلامی اخلاق کا نمونہ و مجسمہ، مفتی، ادیب اور ایوانِ جمعیۃ علماء ہند کے بنیان مرصوص کی پہلی آئنی اینٹ تھی۔ انا
للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے ساتھ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جمیع وابستگان کو صبر جمیل عنایت فرمائے۔ آمین

عبدالصمد رحمانی، پٹنہ
دفتر جمعیۃ علماء صوبہ بہار (پٹنہ)

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی صاحب ندوی

پروفیسر ندوۃ العلماء لکھنؤ

مکرمی و محترمی السلام علیکم و رحمۃ اللہ

اخبارات سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارتحال کی اطلاع ملی، میں سفر میں تھا، اب واپس ہوا ہوں۔ اس حادثہ میں ہندوستان

کے تمام مسلمان مستحق تعزیت وہمدردی ہیں۔ایک اہم دینی وعلمی ستون اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔

وما كان قيس هلكه هلك واحد

یہ ایک قومی وملی حادثہ ہے اور ایک عظیم الشان خسارہ۔ مفتی صاحب کا بدل ملنا آسان نہیں، صرف اللہ تعالیٰ ہی اس بات پر قادر ہے کہ امت مسلمہ کو پھر وہی دل ودماغ عطا فرمائے۔اناللہ واناالیہ راجعون۔

آپ سے ذاتی نیاز مندی کی بنا پر یہ دوسطریں لکھ دیں ورنہ حادثہ ہم جیسوں کے اظہارِ تعزیت سے بالاتر ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کے خاندان پر اپنا فضل رکھے اور اسلاف کرام کے راستے پر چلائے کہ اس کی زندگی اور موت قابل رشک ہے۔والسلام

نیاز مند ابوالحسن علی
۳۷، گوئن روڈ، لکھنؤ

مولانا مولوی سیّد عابد وجدی الحسینی بھوپالی (فاضل دیوبند)

سابق مدرس مدرسه اسلامیه کھولا پور، ضلع امراؤتی
حال قاضی ریاست بھوپال

ذو المجد والکرم حضرت اخی المحترم زیدت الطافکم، سلام مسنون!

مخدوم العالم علامۃ العرب والعجم حضرت مفتی رحمۃ اللہ واسعۃ وغفرلہ مغفرۃ سابقۃ کے حادثہ ارتحال پر ملال کی خبر اخبار کے ذریعے سے ابھی ملی، دل دھک سے ہوگیا، قلبی صدمہ ہوا ارشاد وہدایت، درس وفتویٰ کا آفتاب جو ہمارے سروں پر ضو فگن تھا بحکم ربی غروب ہوگیا۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔

موت العالم موت العالم کے مصداق آج ہمارا ملک یتیم ہوگیا۔ حالانکہ عرصہ دراز سے حضرت مرحوم ومغفور کے فیوض و برکات اور زیارت سے دوری کی وجہ سے محرومی تھی لیکن قلب معمور ہوتا تھا۔ آخری زیارت ولقاء حیدر آباد میں جلسہ جمعیۃ میں ہوئی۔اب وہ صورت مبارکہ اس دنیا میں کہاں نظر آسکے گی؟ایسے تبحر وپاکباز نفوس دوبارہ کہاں پیدا ہوں گے؟

فیا اسفا! واحسرتا!ایک مہجور ورنجور انسان کے قلب پر جو کیفیت وحالت ہے تو آپ کے رنج وغم کا کیا ٹھکانہ ہوگا۔ پروردگار عالم ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آپ سے ایک شفیق وبزرگ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا لیکن یہاں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مرجع علم وادب مرکز فتویٰ وتقویٰ سے سارا عالم محروم ہوگیا۔ بہرحال پروردگار عالم کی مرضی یہی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔اس کا قانون یہی ہے جو ہم کو اباً عن جد ورثہ میں ملا ہے۔

سبقنا الی الدنیا ولوعاش اهلها. منعنا بها عن جيئه و ذهابه

میرے پاس الفاظ نہیں کہ آپ کی تعزیت کرسکوں بجز اس کے کہ حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے کے واقعہ کو تازہ کرکے صبر کیا جاسکے۔

وللواجد المكروب من زفراته سكون عزاء اوسكون لغوب

بارگاہ حق سے دست بدعا ہوں کہ وہ آپ کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین!

دو تین سال سے احقر بھوپال سے ترک وطن کر کے یہاں برابر میں مقیم ہے اور اسلامی مدرسہ چلا رہا ہے۔ بحمد تعالیٰ آپ کی دعاؤں سے مع اہل و عیال بخیریت ہے۔ امید ہے کہ آپ مع جملہ متعلقین بھابھی صاحبہ و عزیزان سلمہم اللہ تعالیٰ بعافیت ہوں گے۔ سب کو سلام و دعا، دیگر رتعزیت۔

خویدکیم سید عابد وجدی الحسینی بھوپالی
۵ر جنوری ۱۹۵۳ء

حضرت مرحوم و مغفور کی روح پاک کو قرآن پاک پڑھا کر ایصال ثواب مدرسے کی جانب سے کیا گیا اور جماعتی طور پر بھی۔ اللہ تعالیٰ مقبول فرمائے۔ وجدی

جناب فاضل اکرم مالک رام صاحب

نمائندۂ شعبہ صنعت و حرفت حکومت ھند

از اسکندریہ (مصر)

۲ر جنوری ۱۹۵۳ء

میرے کرم فرما۔ سلام نیاز قبول فرمایئے۔ کل ریڈیو سے حضرت علامہ مفتی صاحب مرحوم و مغفور کی سنائی سُنی۔ آخر جس بات کا دھڑکا اتنے دن سے لگا ہوا تھا وہ ہو کر ہی رہی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

میرے بھائی جو نقصان آپ کا ذاتی اور علمی اور مذہبی دنیا کا خاص طور پر ہوا ہے اس کی تلافی تو اب ممکن نہیں۔ لیکن اس بات کی تسکین ہونا چاہیے کہ وہ اپنی پوری عمر گزار کر اللہ کو پیارے ہوئے۔ ایسی عمر جس کا ہر ہر لمحہ دینی خدمت سے مملو ہے۔ خدا ایسی خدمت کا موقعہ اور ایسی موت ہر ایک کو دے۔ آمین!

جو مرتا ہے اس کی جگہ ہمیشہ کے لیے خالی ہو جاتی ہے۔ خلف اپنے سلف سے ہر پہلو سے کم تر ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی طرف سے ان کے کاموں کو جاری رکھنے میں کوئی کوتاہی نہ کریں۔ جن سے ان کے نیک نام پر دھبہ لگنے کا اندیشہ ہو۔

آپ کو صبر و شکر کی تلقین کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ کریم ان سے رحم و کرم اور چشم پوشی کا سلوک کریں اور انھیں اعلیٰ علیین میں اپنے جوار رحمت میں جگہ دیں۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

والسلام والاکرام خاکسار مالک رام

حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی

از پانی پت

حضرت مفتی اعظمؒ کی وفات سے دنیائے اسلام کے علمائے کرام کی صف میں جو جگہ خالی ہو گئی ہے بظاہر اس کے پُر ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا اور اس اعتبار سے اس حادثہ پر رنج اور غم کا جس قدر بھی اظہار کیا جائے کم ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ذاتی طور پر ایک مخلص اور مشفق بزرگ کے سایہ سے محروم ہو گیا ہوں۔ آج سے ۴۳ سال قبل ۱۹۰۹ء میں مجھے پہلی بار حضرت مفتی صاحب سے نیاز حاصل ہوا تھا اور

اس صدی کی دوسری دہائی کے آغاز ہی سے ملک کی آزادی کی تحریک کے ساتھ وابستگی کے باعث، یہ تعلق روز بروز استوار تر ہوتا گیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طویل مدت میں میں نے ایک ملاقات میں بھی یہ بات محسوس نہیں کی کہ میں ہندوستان کی تحریک آزادی کے ایک ممتاز رہنما اور دنیائے اسلام کے ایک مقتدر عالم باعمل کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اس کے برعکس میرے ساتھ حضرتؒ کا طرز عمل ہمیشہ ایک مشفق اور مخلص دوست جیسا رہا اور آج جب حضرت مفتی صاحب ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے ہیں میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ذاتی طور پر اپنے ایک بزرگ اور سر تاپا اخلاص و شفقت دوست سے محروم ہوگیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کے ساتھ مجھ ایسے خدام کو بھی صبر کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین!

لقاءاللہ عثمانی پانی پتی

حضرت مولانا محمد کفیل صاحب فاروقی

استاد مدرسہ عالیہ کلکتہ

محترم المقام زید مجدکم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

۳۱ر دسمبر ۵۲ء اور یکم جنوری ۵۳ء کو میں مکان سے کلکتہ آتے ہوئے ریلوے سفر میں تھا۔ یہاں پہنچ کر دفعتہً حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ کے حادثۂ فاجعہ کا علم ہوا۔ میں آپ کو نہیں بتاسکتا کہ میری کیا کیفیت اُس وقت ہوئی۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ باوجود عزم کے دہلی عیادت کے لیے حاضر نہ ہوسکا۔ میری ہی آخری ملاقات حضرت مفتی صاحب سے غالباً ۴۴ء میں دارالعلوم دیوبند میں ہوئی تھی۔ میں اُس زمانے میں وہاں مدرس تھا۔ مجھے بار بار وہ علمی مجلس جس میں حضرت مفتی صاحب، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب مدظلہ اور یہ ناچیز الادب کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا وہ بھی یاد آتا ہے۔ فرمایا تھا کہ مولوی کفیل صاحب جانتے ہو یہ کون ہیں؟ یہ شیخ الادب ہی نہیں شیخ الفقہ بھی ہیں۔ میں اس وقت اس کا مطلب یہی سمجھا تھا کہ اہم مسائل میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کی طرف رجوع کیا کرو۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت شیخ الادب صاحب حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں۔ مجھے حضرت مفتی صاحب کے فقہی تعارف سے اس امر کا احساس ہوا تھا کہ ہمارے یہ بزرگ کس طرح اپنے متوسلین اور شاگردوں کی حوصلہ افزائی فرماتے اور اظہار حق میں اپنی بے نفسی اور پاکبازی کا ثبوت دیتے ہیں۔

آہ! میں مفتی صاحب کو کہاں تلاش کروں اور علم و عمل میں ایسی جامع ہستی کو کس جگہ دیکھوں۔ یقین مانئے کہ بعض حیثیات سے میرے لیے یہ صدمہ اپنے باپ کے صدمے سے بڑھا ہوا ہے۔ میرے والد مرحوم نے جو کہ حضرت مولانا گنج مراد آبادی قدس سرہٗ کے مخصوص مریدین میں سے تھے جب رحلت فرمائی تو میرے لیے یہ صدمہ نہایت روح فرسا تھا۔ بہت سے تعزیتی خطوط اعزاء و احباب اور بزرگوں کے آئے تھے۔ مگر خطوط میں سے دو خطوں نے میرے صدمہ کو بہت ہلکا کردیا تھا۔ ایک حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ کا تعزیتی خط تھا اور دوسرا حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی صاحب مدظلہٗ کا نینی جیل الہ آباد سے لکھا ہوا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے رقم فرمایا تھا کہ "آپ کے والد ماجد صاحب کا خاتمہ ایمان پر ہوا۔" خدا جانے یہ الہامی جملہ کیا اثر رکھتا تھا کہ میرے غم کی کیفیت ہی بدل گئی۔ میں اسی جملے کو اپنے ایقان واذعان کی بنا پر آپ کے لیے دہراتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور آپ کو حضرت مفتی صاحب کا صحیح جانشین ثابت کرے۔ میری طرف سے اپنے جملہ اعزاء اقربا کی خدمت میں اظہار تعزیت فرمایئے اور جو خراجِ عقیدت حضرت مفتی صاحب کی یاد میں بعنوان "یادِ مفتی

اعظم"اس کو الجمعیۃ میں بغرض اشاعت دے دیجئے۔

محمد کفیل فاروقی ۸ر جنوری ۱۹۵۳ء

مکتوب مسٹر آصف علی

سفیر حکومت س ھند متعینہ سو ئٹزر لینڈ

ہز ایکسلنسی مسٹر آصف علی دہلوی سے مضمون کی فرمائش کی گئی تھی۔ آپ نے ضابطہ کا مضمون تو نہیں بھیجا لیکن جواب میں جو خط تحریر فرمایا وہ خود مضمون ہے اس کو شائع کیا جارہا ہے۔

برنادر نرائن، ۱۵

برن-۲۱ر جنوری ۵۳ء

مکرم بندہ مولانا محمد میاں صاحب۔ سلام مسنون

آپ کا ۹ر جنوری کا خط مجھے روم (رومۃ الکبریٰ) سے واپسی پر ۱۹ر کو ملا۔ حضرت مفتی اعظم مرحوم و مغفور کی رحلت کی خبر مجھے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے خط سے معلوم ہو گئی تھی جو قلبی رنج ہوا اس کا اندازہ آپ فرماسکتے ہیں۔

مفتی صاحب مرحوم سے مجھے جو ذاتی عقیدت اور نیاز مندی کا شرف حاصل تھا وہ بالکل خصوصی تھا، کم و بیش ۳۵ برس تک کا قریبی ساتھ تھا۔ اگرچہ حضرت مغفور کی ہم نشینی کی عزت سیاسی تحریکات کے سلسلہ میں شروع ہوئی تھی، مگر زندگی کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا رہ گیا ہو، جس میں ان کی بصیرت افروز اور خلق آموز ہدایتوں کا فیض نہ پہنچا ہو۔

میری ارادت اور عقیدت مندی صرف ان کے بزرگانہ اخلاص اور شفقت پر ہی منحصر نہ تھی بلکہ ان کے اسوۂ حسنہ نے میرے قلب میں گہرا احترام پیدا کر دیا تھا۔ تبحر تو ممکن ہے اور حلقوں میں بھی اس درجہ کا موجود ہو مگر جو اخلاقی اور علمی ذہانت اور ذاتی انکسار، قناعت اور قربانی کا پیمانہ میں نے مفتی محمد کفایت اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ہر قول اور ہر فعل میں قریب سے قریب رہ کر دیکھا اس کی نظیر کمیاب ہے۔ مرحوم کی خوبیاں کن الفاظ میں گنواؤں لغت کا جو سرمایہ میرے پاس ہے وہ ان کی ثنائے حقیقی کے لیے ناکافی ہے۔

اگر کبھی زندگی کے حوادث نے مہلت دی تو شاید جو کچھ میرے علم میں ان کے سوانح ہیں قلم بند ہو سکیں۔ میں اس قابل تو نہیں کہ مفتی صاحب کے دینی تبحر کے متعلق بجز غایت احترام کے کچھ عرض کر سکوں مگر یہ کہہ سکتا ہوں کہ بارہا نازک سے نازک مسائل پر جب کبھی محض دنیوی علوم کے گوشہ سے گفتگو کا موقع آیا مفتی صاحب نے ہر قسم کی بحث کو صبر و سکون سے سنا اور جواب شافی عطا فرمایا۔ عموماً عقلی دلائل کو جو نازک مرحلوں تک پہنچ جائیں خطرناک قرار دے کر روک دیا جاتا ہے۔

سیاسی امور میں مفتی صاحب کے مشورے صائب اور روشن ضمیری کا ثبوت ہوتے تھے۔ سخت سے سخت موقعوں پر ان کے قدم استقلال کی چٹان پر جمے رہے اور ہر قربانی کو انھوں نے خندہ پیشانی سے لبیک کہا۔ وہ تدبر، دیانت، اخلاص، انکسار اور تبحر علمی کی ایک مشعل تھے۔ افسوس آج ان کی رحلت نے اس بزم کو سونا کر دیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

میری جانب سے پسماندگان کو یہ پیام مہربانی فرما کر پہنچا دیجئے کہ میں ان کے غم میں برابر کا شریک ہوں مگر یہ راہ ہم سب کے سامنے ہے۔

مخلص آصف علی

مکتوب

شیخ عبدالحق صاحب پراچہ

برادرم محترم مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصف السلام علیکم

مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کوئی مجموعہ مضامین حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پر شائع کر رہے ہیں۔ اس موقع پر چاہتا ہوں کہ ایک واقعہ اپنے مشاہدہ کے مطابق پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں۔ امید ہے کہ مجموعہ میں شامل فرماکر ممنونیت کا موقع دیں گے۔

آپ کو معلوم ہوگا حضرت مفتی اعظمؒ کی وفات سے کچھ روز قبل حضرت مولانا مفتی سیّد مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند دہلی تشریف لائے تھے۔ مولانا موصوف کو آنکھوں کا آپریشن کرانا تھا۔ ڈاکٹر موگا کے ہسپتال واقع علی پور روڈ میں داخل ہوکر آپریشن کرایا تھا۔ میں تقریباً روزانہ شام کو عیادت کے لیے ہسپتال جاتا تھا اور رات گئے تک وہاں رہتا تھا۔ مولانا موصوف روزانہ موصوف حضرت مفتی اعظمؒ کا حال دریافت فرماتے تھے۔ اور میں دن کی کیفیت سنایا کرتا تھا۔ وفات سے دس بارہ روز قبل حضرتؒ کی حالت کچھ سدھر گئی تھی اور مرض میں افاقہ معلوم ہوتا تھا۔ جس روز وفات ہوئی ہے اس روز بھی میں ہسپتال گیا۔ مولانا موصوف نے حضرت کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے عرض کیا اب خدا کے فضل سے روبہ صحت ہیں۔ اس کے بعد مولانا کے فرزند مولوی سیّد محمد میاں صاحب شاہجہاں پوری سے باتوں میں مصروف ہوگیا اور مولانا موصوف کو نیند آگئی۔

ساڑھے دس بجے یکایک آنکھ کھلی، مولوی محمد میاں کو آواز دی اور دریافت کیا کہ عبدالحق پراچہ ہیں۔ میں نے عرض کیا حاضر ہوں۔ فرمایا شیخ صاحب حضرت کا کیا حال ہے۔ میں نے جواب دیا کہ پہلے سے کچھ افاقہ ہے۔ فرمایا کہ آپ کیا کہتے ہیں؟ حضرت مفتی اعظمؒ تو رحلت فرماگئے۔ یہ کہہ کر مولانا موصوف رونے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ میں نے ابھی ایک خواب دیکھا ہے جس کی تعبیر پوری ہوچکی۔ میں نے دیکھا کہ ایک مکان میں اکابر اسلام کا اجتماع ہے اور حضور انور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی جلوہ فرما ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کیا کفایت اللہ نہیں آئے؟ کسی نے عرض کیا جی ہاں! یارسول اللہ وہ بھی آگئے۔ اسی وقت حضرت العلامہ مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ بھی وہاں آگئے اور اسی اجتماع میں شامل ہوگئے۔

یہ خواب مولانا موصوف بیان کرکے زار وقطار رونے لگے اور فرمانے لگے کہ مفتی اعظمؒ تو اپنے اکابر سے جاملے ان کا وصال ہوگیا۔ یہ سن کر میں اور مولوی محمد میاں سکتے میں رہ گئے۔ میں مولانا موصوف سے اجازت لے کر واپس آیا۔ شہر میں آپ کو معلوم ہوا کہ واقعی ٹھیک اسی وقت حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا ہے۔

خادم عبدالحق پراچہ
۷۵۳، کباڑی بازار، جامع مسجد، دلی

مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کی منظور کردہ تجویز تعزیت

باجلاس منعقدہ ۲۸ر فروری ۱۹۵۳ء، بمقام بمبئی

مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس مفتی اعظم حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی وفات حسرت آیات پر اپنے انتہائی رنج والم کا اظہار کرتے ہوئے آپ کی وفات کو نہ صرف کسی ایک جماعت یا کسی ایک فرقے کے لیے بلکہ پورے عالم اسلام اور جمیع انسانیت کے لیے حادثہ جانکاہ اور ناقابل تلافی نقصان سمجھتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کو خداوند عالم نے علم و عمل، زہد و تقوی، اتباع سنت اور تفقہ فی الدین کی جامع صفات کے ساتھ حسن اخلاق، اعلیٰ کردار، بہترین تفکر اور اعلیٰ تدبر کا مقدس پیکر بنایا تھا۔ مذہبی اور دینی خدمات کے ساتھ ہندوستانی سیاست اور آزادئ ہند کی جدوجہد میں آپ کی مساعی جمیلہ، آپ کی بار بار کی اسارت اور آپ کی قربانیاں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جمعیۃ علماء ہند آپ کے حسن تدبر کا زندہ کارنامہ ہے۔ آپ اس کے بانی اور معمارِ اوّل ہیں۔ بیس سال تک آپ کے دور صدارت میں جمعیۃ علماء ہند نے وہ عظیم الشان تاریخ مرتب کی جو آج نہ صرف جمعیۃ علماء ہند بلکہ ملت اسلامیہ کے لیے باعث فخر ہے۔ آپ کی یہی خدمات اور یہی عظیم الشان قربانیاں ہیں جن کی وجہ سے ہر ایک حلقہ آپ کی وفات سے متاثر ہے۔ اور موت العالم موت العالم کا صحیح نقشہ سامنے ہے۔

یہ اجلاس آپ کی وفات پر دلی رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے دست بدعا ہے کہ خداوند عالم آپ کو اعلیٰ علیین میں مقام اعلیٰ عطا فرمائے۔ اور آپ کے پسماندگان کے ساتھ گہری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

مجلس منتظمہ دار العلوم دیوبند اہم تحریر تعزیت

منعقدہ ۲۵ر جمادی الثانیہ ۷۲ ۱۳ھ

مجلس انتظامیہ دار العلوم دیوبند کا یہ اجلاس مفتی بے بدل عالم ربانی حضرت مولانا محمد کفایت اللہؒ رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند کی وفات حسرت آیات پر اپنے گہرے غم والم کا اظہار کرتا ہے۔ حضرت مرحوم اپنے علم و فضل تقویٰ و طہارت اور اخلاق و کمالات کے لحاظ سے طبقۂ علماء کے ایک بے نظیر شخصیت تھے۔ آپ دار العلوم کے ایک ممتاز فاضل اور اس کی انتظامی مجالس کے ایک فہیم اور مدبر رکن تھے۔ مجلس حضرت ممدوح کی وفات کو امت اسلامیہ، ملت ہندوستان اور دار العلوم کے ذمہ دار انتظامی حلقوں کا ایک ایسا خلا محسوس کر رہی ہے جو بظاہر اسباب جلد بھرنے والا نہیں ہے۔ مجلس کے تمام اراکین بارگاہِ حق میں دست بدعا ہیں کہ حق تعالیٰ انھیں اعلیٰ علیین میں مقام بلند عطا فرمائے اور امت میں ان کا خلف صالح پیدا فرمائے۔ اس صدمۂ جانکاہ میں مجلس کو حضرت مرحوم کے پسماندگان اور تمام اعزہ و اقربا سے دلی ہمدردی ہے۔ خدا تعالیٰ انھیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

نقش حیات

حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند

از: جناب مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصف
نائب مہتمم مدرسہ امینیہ، دہلی، خلف اکبر حضرت مفتی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

اس زمین پاک جہاں آبادی کی عظمت و مرتبت کا کیا ٹھکانا ہے، بڑے بڑے اولوالعزم شہنشاہوں اور بڑے بڑے عظیم المرتبت علماء اولیاء کرام کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے:

نور جہاں در ظلمت آباد بدن گم کردۂ
آوزان یوسف کہ تو در پیرہن گم کردۂ

۱۴ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ کو دلی والوں نے قدیم دہلی میں سرخیل اولیا حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے جوار میں ایسا ہی اپنا ایک خزانہ دفن کیا ہے، وہ کون تھا جس نے غریبی میں فیاضی اور داد و دہش کی اور اس طرح کی کہ اس کا دوسرا ہاتھ اس کی فیاضی کا راز دار نہ بن سکا۔ وہ کون تھا جس نے اپنے اقران میں تفقہ فی الدین کا ذوق پیدا کیا اور جس کی بے پناہ قوت اجتہاد نے علماء دین کے لیے منارۂ نور کا کام دیا، جس نے بڑے بڑے اُلجھے ہوئے دینی و سیاسی مسائل کو بیک جنبش نگاہ حل کیا، جو میدانِ سیاست کا بھی شہسوار تھا اور بحر شریعت و طریقت کا بھی کامیاب غواص تھا۔ کمالات ظاہری و باطنی کا مجموعہ اور گلزار مصطفوی (علی صاحبها التحية والتسليم) کا گل سرسبد تھا۔ یعنی میرے والد ماجد حضرت العلامہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ

زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

آپ کے کمالات و فضائل کا بیان کرنا مجھ ناچیز کی قوت سے باہر ہے۔ مختصر حالات زندگی مشفق محترم مولانا محمد میاں ناظم جمعیۃ علماء ہند کے حکم کی تعمیل کے طور پر عرض کرتا ہوں۔

ولادت باسعادت اور خاندان

آپ کی پیدائش شاہجہانپور (روہیل کھنڈ) کے محلہ سب زئی میں ہوئی۔ ۱۲۹۲ھ سن پیدائش ہے۔ آپ کے والد کا نام شیخ عنایت اللہ، ابن فیض اللہ ابن خیر اللہ، ابن عباد اللہ، یہ سلسلہ نسب شیخ جمال یمنی سے جا کر مل جاتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ کا اجدادی وطن "جزیرۃ العرب کا جنوبی ساحلی خطہ یمن ہے۔ یہ لوگ موتیوں کی تجارت کرتے تھے۔ بحرین سے موتی خرید کر ہندوستان، لنکا وغیرہ کے ساحلی علاقوں میں لاکر فروخت کرتے تھے۔

قدیم زمانہ میں یمن سے اسی طرح سوداگروں کا ایک قافلہ جہاز پر سوار ہو کر سمندر کی سطح پر روانہ ہوا۔ ہندوستان کے ساحل پر پہنچنے سے قبل طوفان نے آگھیرا۔ جہاز ٹوٹ پھوٹ گیا۔ مسافر غرق ہوگئے۔ قافلہ کے سردار کا کمسن لڑکا جس کا نام شیخ جمال تھا ایک تختہ پر بہتا ہوا ساحل تک پہنچا۔ ساحل سے اس کو ایک شخص جو بھوپال کا باشندہ تھا اپنے ساتھ لے آیا۔ وہ کمسن بچہ اسی شخص کے زیر تربیت رہا اور اس نے اپنے ہی خاندان میں اس کی شادی کر دی۔ یہی شیخ جمال مفتی صاحب قدس سرہٗ کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔

والد ماجد

آپ کے والد شیخ عنایت اللہ نہایت نیک نفس، صاحب تقویٰ بزرگ تھے۔ اپنے بلند کردار کی وجہ سے اپنے خاندان اور احباب و اقران میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ اپنے فرزند (حضرت مفتی صاحب

مرحوم) کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میں اس کو عالم دین بنانا چاہتا ہوں۔ غریبی و ناداری کے باوجود بہت بلند حوصلہ تھے۔ دو لڑکیوں کے بعد آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہ مبارک و مسعود فرزند عطا فرمایا۔ وہ دن کیا ہی مبارک دن تھا جبکہ یہ آفتاب رشد و ہدایت افق شاہجہانپور سے طلوع ہوا۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ نو مولود ایک روز عالمِ اسلام کا عظیم رہبر و رہنما ہوگا۔ اَن پڑھ اور مزدوری پیشہ خاندان کا چشم و چراغ، گدڑی کا لال عالم اسلام کا منارۂ راہ ثابت ہوگا۔ بچپن سے ہی پیشانی پر ستارۂ بلندی چمک رہا تھا۔ کھیل کود کی طرف سے بے رغبتی اور تعلیم و تفکر کی طرف رجحان تھا۔

تعلیم

پانچ برس کی عمر میں حافظ برکت اللہ صاحب کے مکتب میں تعلیم شروع ہوئی۔ قرآن شریف اسی مکتب میں ختم ہوا۔ اردو، فارسی کی ابتدائی تعلیم حافظ نسیم اللہ کے مکتب واقع محلہ درک زئی میں ہوئی محلہ خلیل شرقی میں مولوی اعزاز حسن خاں صاحب کا مدرسہ اعزازیہ جاری تھا۔ مکتبوں سے فارغ ہو کر وہاں داخلہ ہوا۔ سکندر نامہ اور عربی کی ابتدائی کتابیں حافظ بدھن خاں صاحب نے شروع کرائیں۔ مثل مشہور ہے کہ سونے پر سہاگہ۔ یہاں تو خود ہی جوہر قابل تھا۔ خدا کی شان کہ اساتذہ بھی مولانا عبید الحق خاں صاحب جیسے مشفق جوہر شناس اور حافظ بدھن خاں صاحب جیسے ذکی ذہین مل گئے۔ مولانا عبید الحق خاں صاحب کی جوہر شناس نگاہ نے اپنے تمام شاگردوں میں حضرت مفتی صاحب کو ممتاز و بلند مقام پایا۔ آپ نے شیخ عنایت اللہ مرحوم کو مجبور کیا کہ اپنے صاحبزادہ کو دارالعلوم دیوبند بھیج دیں۔ والدین وطن سے باہر بھیجنے پر راضی نہ ہوتے تھے۔ بڑی ردو کد کے بعد یہ طے پایا کہ فی الحال مراد آباد بھیج دیا جائے تاکہ وطن سے دوری نہ ہو۔ ۱۳۱۰ھ میں اپنے رفیق درس حافظ عبدالمجید کے ساتھ مدرسہ الغرباء شاہی مسجد مراد آباد بھیج دیا۔ اس وقت حضرت کی عمر مبارک تقریباً سترہ سال تھی۔

مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخلہ

غریب والدین کے لیے اپنی اولاد کو جدا کرنا پھر اس کمسنی میں پردیس بھیج دینی بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ مگر مولانا عبید الحق خاں صاحب کا تصرف باطنی کہئے یا کارکنانِ قضاء و قدر کی کارسازی سمجھئے کہ یہ مسئلہ بڑی آسانی سے طے ہوگیا اور یہ دونوں ساتھی مولانا کا خط لے کر مدرسہ عربیہ شاہی مسجد مراد آباد کے مہتمم مرزا حافظ نبی بیگ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مرزا صاحب مولانا کے پیر بھائی تھے۔ خط انھیں کے نام تھا، مگر وہ ان دونوں بمبئی گئے ہوئے تھے۔ نائب مہتمم حاجی محمد اکبر خاں سوداگر نے خط دیکھ کر بڑی نوازش فرمائی اور ہاتھی خانے کی مسجد میں مولوی عبدالخالق کے پاس عارضی طور پر ٹھہرا دیا۔ اور بعد میں مستقل قیام کے لیے حافظ محمد اسماعیل وکیل کا دیوان خانہ تجویز کیا گیا۔

حافظ محمد اسماعیل وکیل جو مولوی سر محمد یعقوب مرحوم ایم ایل کے والد بزرگوار تھے۔ شاہجہاں پور میں وکالت کرتے تھے اور وہیں سکونت رکھتے تھے۔ محلہ مغل پورہ میں واقع ہے۔ اسی میں حضرت مفتی صاحب اور حافظ عبدالمجید قیام پذیر تھے۔ وکیل صاحب مرحوم جب شاہجہاں پور سے آتے تھے تو ان تینوں ہم وطن طلبہ کے والدین کے ہاتھ ضروریات کی چیزیں، تحفے تحائف، کپڑا، جوتا، سوئٹر بھیجتے رہتے تھے۔

مراد آباد کے قیام کے دوران کھانے کا انتظام مدرسہ کی طرف سے تھا۔ تعلیم کے دیگر اخراجات آپ خود ہی برداشت کرتے تھے۔ آپ کے والد نادار تھے، اس لیے وہ تعلیم کے پورے اخراجات برداشت نہ کرسکتے تھے اور دوسروں کے عطیات سے طبعاً نفرت تھی۔ تحصیل علم کے تمام زمانہ میں کسی مسجد میں قیام نہیں کیا۔ اپنی کفالت کا بار کبھی کسی پر نہیں ڈالا۔ مراد آباد اور دیوبند کے قیام کے دوران میں تاگے کی ٹوپیاں کروشیا سے بنتے تھے اور فروخت کرتے تھے۔ بہت عمدہ مختلف رنگ کے ریشمی پھول بناوٹ میں ہوتے تھے۔ دو تین روز میں ایک ٹوپی تیار ہوتی تھی۔ دو روپے میں فروخت ہوتی تھی۔ وہ کتاب میرے پاس موجود ہے جس میں قلم سے آپ نے ٹوپیوں کے مختلف ڈیزائن اور نمونے بنائے تھے۔ فنکاری اور ہنر مندی کا بہترین نمونہ ہے۔

اساتذہ مراد آباد

مراد آباد میں مندرجہ ذیل اساتذہ سے پڑھا۔ مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھی مرحوم مدرس اوّل تلمیذ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ (جو بعد میں مدرسہ عبدالرب دہلی کے صدر مدرس رہے ہیں اور یہیں وفات ہوئی) مولوی محمد حسن صاحب، مولوی محمود حسن صاحب سہوانی۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ

مدرسہ شاہی میں دو سال تعلیم جاری رہی۔ اس کے بعد ۱۳۰۰ھ میں آپ مولوی عبدالخالق اور مولوی عبدالمجید تینوں ساتھی دارالعلوم دیوبند میں آکر داخل ہوئے۔ اس زمانہ میں دارالعلوم کے مہتمم مولوی محمد منیر صاحب تھے۔ صدر مدرس حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب تھے۔ دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ کے علاوہ مندرجہ ذیل اساتذہ سے مختلف کتابیں پڑھیں۔ مولانا منفعت علی صاحب، مولانا حکیم محمد حسن صاحب (برادر خورد شیخ الہند) مولانا غلام رسول صاحب، مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی، دورۂ حدیث مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھی اور حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھا۔

رفقاء خصوصی

قیام دیوبند کے زمانہ میں مندرجہ ذیل ساتھی اور ہم جماعت تھے جن سے بے تکلفی تھی۔ مولوی عبدالخالق شاہجہانپوری مرحوم مولوی حافظ عبدالمجید شاہجہانپوری مرحوم شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور ان کے بھائی مولانا سیّد احمد صاحب فیض آبادی، مولانا مولوی ضیاء الحق صاحب دیوبندی۔ (حال صدر مدرس مدرسہ امینیہ، دہلی)

صحاح ستہ کے دورہ میں آپ کے تقریباً ۲۸ ساتھیوں میں سے قابل ذکر حضرات مندرجہ ذیل ہیں:

حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ، مولانا محمد شفیع دیوبندی (حال شیخ الحدیث مدرسہ عبدالرب دہلی) استاذ محترم مولانا ضیاء الحق صاحب دیوبندی (حال صدر مدرس مدرسہ امینیہ، دہلی) مولوی محمد قاسم دیوبندی مرحوم مدرس مدرسہ امینیہ دہلی، مولوی امین الدین اپولوی (بانی مدرسہ امینیہ، دہلی)

قیام دیوبند کے مختصر حالات

دارالعلوم دیوبند سے حضرت مولانا انور شاہؒ صاحب ۱۳۱۴ھ میں اور حضرت مفتی اعظمؒ ۱۳۱۵ھ میں اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہم العالی ۱۳۱۶ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

دارالعلوم میں آپ کا قیام ۳ سال رہا۔ مدرسہ کے دارالاقامہ میں ہی رہتے تھے۔ تعلیم کے زمانہ اپنی ذہانت و فطانت اور وہبی صلاحیت کی وجہ سے اپنے محنتی اور جفاکش اقران سے ہمیشہ پیش قدم رہتے تھے۔ مطالعہ کم کرتے تھے مگر امتحان میں سب سے زائد نمبر حاصل کرتے تھے۔ فطانت اس بلا کی تھی کہ لوگوں کو محو حیرت کر دیتی تھی۔ چند ساتھیوں کے ساتھ شرکت میں کھانا پکایا جاتا تھا۔ سالن خود پکا لیتے تھے اور روٹی بازار میں ایک بھٹیاری کی دوکان سے پکوائی جاتی تھی۔ کچھ دن کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا کہ روٹیاں ہلکی آتی ہیں اور سب ساتھی سیر نہیں ہوتے۔ خیال ہوا کہ شاید بھٹیاری آٹا چرا لیتی ہے۔ طے ہوا کہ بھٹیاری کو آزمانا چاہئے جو ساتھی روٹی پکوانے جاتا وہ شروع سے آخر تک وہاں موجود رہتا اور اس کی حرکات پر نظر رکھتا۔ بہت دنوں تک تمام ساتھیوں نے جانچ پڑتال جاری رکھی۔ مگر پتہ نہ چلا۔ حضرت مفتی صاحب خود کبھی روٹی پکوانے نہ گئے تھے۔ ایک روز فرمایا کہ آج میں جاؤں گا۔ آپ آٹا لے کر بھٹیاری کی دوکان پر گئے اور جب اس نے روٹی پکانے کے لیے پیڑے کاٹنے شروع کیے، اسی وقت آپ نے اس کو ڈانٹ کر کھڑے ہو جانے کا حکم دیا۔ وہ کھڑی نہ ہوتی تھی۔ جب حاضرین کے مجمع نے اس کو مجبور کیا اور وہ کھڑی ہوئی تو اس کی جھولی میں سے ۲۵-۳۰ پیڑے بھرے ہوئے نکلے جو اس نے اپنی چابکدستی سے گاہکوں کے آٹے میں سے چرائے تھے۔

دارالعلوم سے فراغت

آپ تقریباً ۲۲ سال کی عمر میں ۱۳۱۵ھ میں دارالعلوم سے فارغ ہو کر دہلی آئے اور اپنے دوست مولوی امین الدین صاحب کے پاس دو تین روز قیام کر کے عازم وطن ہوئے۔ اس وقت مولوی امین الدین صاحب مسجد چھتہ شاہ جی چاوڑی بازار دہلی میں قیام پذیر

تھے اور ایک دینی مدرسہ قائم کرنے کی فکر میں تھے۔

سلسلہ تدریس

آپ کے اوّلین مربی داستان مولانا عبید الحق خاں صاحب جو مدرسہ اعزازیہ شاہجہانپور کے اعزازی مدرس تھے بوجہ غلبہ مبتدعین کچھ بددل ہو کر ۱۳۱۴ھ میں مدرسہ عین العلم کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ آپ جب دیوبند سے شاہجہانپور پہنچے تو انھوں نے اپنے ہونہار اور قابل شاگرد کو درس و تدریس اور دفتری خدمات پر مامور فرمایا۔ تنخواہ غالباً پندرہ روپے ماہوار مقرر ہوئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کی مالی حالت کمزور تھی اس وجہ سے ارکان مدرسہ کو کافی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا تھا اور مدرسین و ملازمین کو ایثار سے بھی کام لینا پڑتا تھا۔ چنانچہ ربیع الاوّل ۱۳۲۱ھ میں مدرسین کی تنخواہوں میں تخفیف کی گئی اور آپ کی تنخواہ بھی ۱۸ سے ۱۶ ہو گئی۔ آپ تقریباً ۵ سال مدرسہ عین العلم میں رہے۔

رسالہ البرہان کا اجراء

اس زمانہ میں فتنہ قادیانیت کا زور تھا۔ آپ نے ضرورت کا احساس فرمایا اور ایک ماہوار رسالہ 'البرہان' کے نام سے جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر آپ خود تھے اور منیجر (مولانا مفتی سیّد مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کے بڑے بھائی) منشی سلطان حسن میاں تھے۔ پہلا نمبر شعبان ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوا۔ اس میں قادیانیت کے رد میں بہترین مضامین شائع ہوتے تھے۔ جس وقت آپ مدرس عین العلم میں مدرس تھے، اس زمانہ کے آپ کے تلامذہ میں سے مندرجہ ذیل حضرات مجھے معلوم ہیں۔

حضرت مولانا حافظ اعزاز علی صاحب شیخ الفقہ والادب دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی سیّد مہدی حسن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولوی حافظ ذاکر علی صاحب ایڈوکیٹ، مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ایڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ۔

مدرسہ امینیہ کو مولوی امین الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سنہری مسجد چاندنی چوک دہلی میں جاری کیا تھا۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے۔ حضرت شاہ صاحب کچھ عرصہ کے بعد اپنے وطن کشمیر واپس تشریف لے گئے تو مولوی امین الدین صاحب نے حضرت مفتی صاحب کو خط لکھا۔ ادھر مدرسہ عین العلم کی مالی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے تنخواہوں میں اضافہ کے بجائے تخفیف ہو رہی تھی۔ حضرت مفتی صاحب نے مولانا عبدالحق صاحب دہلی جانے کی اجازت چاہی۔ مولانا نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ "آپ ترقی پر جا رہے ہیں۔ اللہ مبارک کرے، لیکن اگر خدا نے مجھ سے آخر میں یہ پوچھا کہ تم نے مولوی کفایت اللہ کو کیوں چھوڑ دیا تو کیا جواب دوں گا۔" آپ نے دہلی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ مگر قدرت نے آپ کے لیے وہ جگہ مخصوص کر رکھی تھی۔

دھلی تشریف آوری

رمضان ۱۳۲۱ھ میں مولانا عبید الحق صاحب کی وفات ہو گئی۔ مولوی امین الدین صاحب شاہجہانپور پہنچ گئے۔ حضرت مفتی صاحب کے مکان پر ہی قیام کیا اور دہلی آنے پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ شوال ۱۳۲۱ھ میں حضرت مفتی صاحب دہلی تشریف لے آئے۔

مدرسہ عین العلم کے ریکارڈ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کے تمام انتظامی امور حضرت مفتی صاحب ہی انجام دیتے تھے۔ تمام عملے سے پہلے مدرسہ پہنچ جاتے تھے اور سب کے بعد وہاں سے روانہ ہوتے تھے۔ حساب کتاب بہت عمدہ اور باقاعدہ رکھتے تھے۔ افتاء کا کام بھی کرتے تھے اور درس و تدریس بھی۔ سب سے پہلا فتویٰ جو بہت مدلل اور مبسوط لکھا تھا۔ اس کو شاہجہانپور کے تمام علماء نے اور خاص کر آپ کے استاد مولانا عبید الحق صاحب نے بہت پسند کیا تھا اور بڑی تعریف کی تھی۔

فرمایا کرتے تھے کہ حصولِ تعلیم کے زمانہ میں اگرچہ میں نے بہت کم محنت کی، مگر افتاء کے معاملے میں بڑی احتیاط اور محنت سے کام لیا کرتا تھا۔ حصولِ تعلیم دارالعلوم دیوبند کے زمانہ میں رات کے مطالعہ کے لیے طلبہ کو سرسوں کا تیل چراغ میں جلانے کے لیے ملا کرتا تھا، میں رات کو مطالعہ نہیں کرتا تھا تیل کا پکوان تل کر کھاتا اور ساتھیوں کو کھلاتا تھا۔ اس کے باوجود امتحان میں کامیاب رہتا تھا۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی" فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں کوشش کی کہ اپنے ہم سبقوں میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کروں۔ بڑی محنت اور خوب مطالعہ کرتا تھا۔ امتحان کے موقع پر میر زاہد رسالہ کا پرچہ تھا۔ ایک سوال کا جواب بڑی عمدگی سے میں نے دو صفحے پر لکھا اور اسی سوال کا جواب مفتی صاحب نے آدھے صفحہ پر لکھا۔ حضرت شیخ الہند" اس پرچہ کے ممتحن تھے۔ آپ نے دونوں کو برابر نمبر دیئے۔ یعنی آدھے صفحہ کا مضمون اپنے وزن کے لحاظ سے دو صفحے والے مضمون سے کم نہ تھا۔

نجی زندگی و خانہ داری

آپ کی پہلی شادی اُس وقت ہوئی جبکہ آپ مدرسہ عین العلم میں مدرس تھے۔ زوجہ اوّل سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئے، مگر یہ دونوں بچے خورد سال فوت ہو گئے اور کچھ دِنوں کے بعد زوجہ محترمہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اُس کے بعد شرف الدین صاحب کی صاحبزادی نبیہ خاتون کے ساتھ نکاح ہوا۔ اُن سے سات اولادیں ہوئیں۔ جن میں سے ہم دو بھائی اور دو بہنیں بقید حیات ہیں۔

دہلی میں جب آپ نے اپنی زوجہ محترمہ کو لانے کا ارادہ فرمایا تو بارہ دری شیر افگن خاں میں چھڑے والوں کے مکان کے قریب ایک مکان کرایہ پر لیا۔ یہ سب سے پہلا مکان تھا جس میں آپ نے سکونت فرمائی۔ اس کے بعد حویلی اعظم خاں میں متعدد مکان تبدیل کیے اور کرایہ کے مکانوں میں سب سے آخری مکان کوچہ فولاد خاں گلی مدرسہ شاہ عبدالعزیزؒ میں لیا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ قیام رہا۔ اور اس میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس سرہ' کی تشریف آوری کا منظر راقم الحروف کو خوب یاد ہے۔

غالباً ۱۳۳۱ھ سے ۱۳۴۳ھ تک تقریباً تیرہ سال اُسی مکان میں رہے۔ اِسی اثناء میں کوچہ چیلان میں ایک مکان خرید لیا جس میں ناصر وحید صاحب بطور کرایہ دار رہتے تھے۔ ۱۳۴۳ھ میں کچھ تعمیری تغیر و تبدل کر کے ذاتی مکان میں ہی منتقل ہو گئے۔ اب اس وقت دو مکان زر خرید ہیں۔ پہلا مکان ۱۶ر ستمبر ۱۹۱۹ء کو سراج الدین ولد بہاء الدین وارشاد الٰہی ولد حاجی کرم الٰہی سے دو ہزار دو سو ساٹھ روپیہ میں خریدا تھا اور دوسرے مکان کی زمین ۷ ۲ر اپریل ۷ ۱۹۳ء اور ۱۲ر جون ۷ ۱۹۳ء کو خان بہادر منشی ذکاء اللہ خاں مرحوم کے ورثہ سے ایک ہزار دو سو اسّی روپیہ میں خریدی تھی۔

دہلی میں ابتدائی ایام میں مدرسہ امینیہ کی ملازمت کے ساتھ ساتھ آپ نے انجمن ہدایت الاسلام کے دفتر میں بعہدۂ محاسبی ملازمت کر لی تھی۔ انجمن کے دفتر میں آپ بعد مغرب کام کیا کرتے تھے۔ انجمن کی سالانہ کانفرنس جو ۲۸ر مارچ ۱۹۰۸ء کو دہلی میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اُس وقت انجمن میں موجود تھے اور اس کے چوتھے اجلاس میں جو حکیم اجمل خاں کی صدارت میں ہوا تھا، آپ نے ہی انجمن کی کارگذاری اور حسابات وغیرہ پیش کیے تھے۔ آپ اس تبلیغی انجمن کے کاموں سے کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد آپ نے محض اس وجہ سے ملازمت چھوڑ دی کہ بعض غلط اور ناجائز حساب آپ کو لکھنے پڑتے تھے جس کو آپ کا ضمیر گوارا نہ کر سکا۔

کتب خانہ رحیمیہ

۱۳۲۴ھ میں آپ نے حافظ زاہد حسن امروہوی کی شرکت میں کتابوں کی تجارت کی، کچھ عرصہ کے بعد حافظ صاحب موصوف سے شرکت ٹوٹ گئی اور مولوی حافظ عبدالغنی دہلوی کے ساتھ شرکت کر لی اور اس فرم کا نام کتب خانہ رحیمیہ رکھا گیا۔ یہ تجارتی کتب خانہ اب بھی اردو بازار میں موجود ہے اور اس میں آپ کے اور مولوی عبدالغنی مرحوم کے ورثاء اپنے اپنے حصول کے مطابق شریک ہیں۔ یہ اسلامی علوم کی خدمت اور نشر و اشاعت کے سلسلے میں ہندوستان کے ممتاز اداروں میں سے ہے۔

مدرسہ امینیہ کا قیام

مولوی امین الدین مرحوم نے ماہ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ کو سنہری مسجد میں یہ دینی مدرسہ جاری کیا تھا۔ صدر مدرس کے عہدہ پر مولانا محمد انور شاہ کشمیری کو رکھا گیا۔ مدرس دوم مولانا محمد عبدالقادر ہزاروی، مدرس سوم مولانا ضیاء الحق دیوبندی مدرس، چہارم مولوی محمد قاسم دیوبندی، مدرس پنجم مولوی سیّد انظار حسین ہنس پوری،

مدرس فارسی و نائب مہتمم مولوی عبدالغفور دہلوی، مدرس قرآن حافظ عبداللہ بلاسپوری اور حافظ رحیم بخش فیض آبادی۔ اس جماعت نے (مع مولوی امین الدین مہتمم) بلا تعین تنخواہ اس مدرسے کی دینی خدمت شروع کی۔

جب حضرت مولانا محمد انور شاہؒ مورخہ ۸ ربیع الاوّل ۱۳۲۰ھ کو اپنے والد محترم کی طلب پر وطن تشریف لے گئے تو مدرسہ امینیہ میں بڑی کمی محسوس ہونے لگی اور مولوی امین الدین صاحب حضرت مفتی صاحب کو شاہجہانپور سے بلانا چاہتے تھے مگر آپ اپنے استاد مولانا عبید الحق صاحب کی وجہ سے مجبور تھے۔ ان کے انتقال کے بعد آپ نے مدرسہ عین العلم سے استعفیٰ دے دیا اور مولوی امین الدین کی طلب پر شوال ۱۳۲۱ھ میں دہلی تشریف لے آئے۔ یہ طلب تو ظاہری سبب تھا لیکن حقیقت نگر نگاہیں خاندان ولی اللہی کے بعد دہلی کے تاریک مطلع پر اس بدر کامل کی منتظر تھیں۔ خاندان ولی اللہی کے منتسبین انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد دیوبند وغیرہ کی طرف منتقل ہو گئے تھے۔ کارکنان قضا و قدر نے اسی خاندان کے متبعین میں سے ایک اولوالعزم ہستی کو دارالسلطنت دہلی کے لیے چنا اور یہ بدر کامل ولی اللہی آفتاب سے انوار قدسی اپنے دامن میں لے کر آسمان دہلی کے مطلع پر بصد جاہ و جلال نمودار ہوا۔

یکم شوال ۱۳۲۱ھ سے آپ کی تنخواہ بیس روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ عملی حیثیت سے مدرسہ امینیہ کے تمام انتظامی معاملات درس حدیث اور افتاء آپ ہی انجام دیتے تھے۔ مہتمم صاحب تمام امور میں حتیٰ کہ خانگی معاملات میں آپ سے مشورہ کو ضروری خیال کرتے تھے۔ جلسوں کا انصرام روئدادوں اور مضامین کی ترتیب و تدوین معاہدات اور تمام معاملات آپ کے ہی سپرد تھے۔

دہلی کے لیے آپ کی تشریف آوری آیۂ رحمت ثابت ہوئی اور ایسا محسوس ہوا کہ عرصہ سے دہلی کو اور خاص کر اس چمنستان ملت کو آپ کا ہی انتظار تھا۔ شہر کے زعماء و شرفاء اور اہل الرائے حضرات نے بھی ہر قسم کے سیاسی و ملی اور اجتماعی و شہری اداروں کے معاملات میں آپ سے رجوع کرنا شروع کر دیا۔ حاجی رشید مرزا مرحوم سے کسی بیرسٹر نے کہا کہ مسلمانوں کے مقدمات کے فیصلوں کے سلسلے میں مجسٹریٹوں اور وکیلوں کو سخت اُلجھن اور دُشواری پیش آتی تھی کیونکہ مقامی علماء کے فتوے الجھے ہوئے ہوتے تھے۔ یا تو عبارت سمجھ میں نہیں آتی تھی یا غلط ہوتے تھے اور جس مقدمہ میں دو چار علماء کے فتوے عدالت میں پیش ہوتے تھے ان میں اختلاف ہوتا تھا۔ جب سے مولانا کفایت اللہ کے فتوے آنے شروع ہوئے عدالتوں کو بڑی سہولت ہو گئی ہے۔

مدرسے میں آنے کے بعد آپ نے بہت سی اہم تبدیلیاں کیں۔ آپ ہی کی خوددار ہستی تھی جس نے سب سے پہلے طلبہ میں خودداری اور عظمت علم کا شعور پیدا کیا۔ شہر کے لوگ شادی بیاہ یا دیگر تقریبات میں طلبہ کی دعوت کرتے تھے اور طلبہ ان کے مکانوں پر جا کر کھانا کھاتے تھے۔ علم دین کی اس بے حرمتی کو وہ اولوالعزم ہستی کیوں کر برداشت کر سکتی تھی جس نے تعلیم کے زمانہ میں ٹوپیاں بن کر اپنی روزی آپ پیدا کی ہو۔ اور کسی کا دست نگر بننا گوارا نہ کیا ہو۔ چنانچہ آپ کے تشریف لانے کے بعد یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

آٹھویں سالانہ اجلاس میں آپ نے جو مقالہ پڑھا اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

(۱) تمام مدارس اسلامیہ کا مقصود ایک ہے۔ یعنی چمن علم دین کی آبیاری اسی باغ کی یہ سب کیاریاں ہیں۔ لہٰذا تمام مدارس کو انتظامی حیثیت سے بھی ایک نظام میں منسلک ہونا چاہیے اور ایک کو دوسرے کا مخالف نہ ہونا چاہیے۔

(۲) مدارس اسلامیہ کے ترقی نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ ان کے کارکن یعنی اہل شوریٰ اور منتظمین وہ لوگ ہیں جن کو علم دین کا ذوق اور مناسبت نہیں ہے۔ بلکہ اکثر نئی وضع کے پابند اور جدید طرز کے شیدائی اور علم دین سے محض بے بہرہ ہیں۔ یا اگر اہل شوریٰ اہل علم اور دیانت دار ہیں تو ان کے مہتمموں کی نیت میں کھوٹ ہے۔ اگرچہ وہ امور تعلیمی کو خوب سمجھتے ہیں لیکن مالی معاملات میں نیت درست نہیں۔ وہ اس چندے کے مال کو اپنا مال اور اپنی جائداد سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اہل شوریٰ میں اہل علم بھی داخل ہوں اور تمام امور

انتظامی و تعلیمی ان کے مشورے سے فیصل ہوں۔ اور مہتمموں کو خدا کا خوف اور اپنے فرائض کا احساس کرنا چاہیے اور اس مال میں سے جو خدا نے ان کو امانت سونپا ہے بقدر ضرورت اپنے اوپر خرچ کرنا چاہیے۔

(۳) مدرسے کا اہتمام کوئی معمولی کام نہیں ہے بلکہ اس کے لیے پوری فرصت توجہ اور لیاقت شرط ہے۔ ضروری ہے کہ مہتمم مدبر، تجربہ کار امور انتظامی سے واقف ہو اور اس کے ذمہ کوئی اور کام بطور فرض منصبی کے نہ ہو۔ ایک شخص پوری توجہ سے دو کام نہیں کر سکتا۔

(۴) مہتمم اور اہل شوریٰ مدرسے کے امور میں خدا کی طرف سے وکیل ہیں۔ لہٰذا موکل کی رضا مد نظر رہنی چاہیے اور مدرسے کے انتظام اور ضروریات پر کامل توجہ رہنی چاہیے۔

(۵) مہتممین اور مدرسین کو چاہیے کہ ان خدا کے مہمانوں (طلبہ) کے ساتھ نہایت نرمی اور خیر خواہی کا برتاؤ کریں۔ ان کی مشکلات میں ان کی اعانت اور مدد کو باعث فخر سمجھیں۔

(۶) طلبہ کے داخلے کے وقت احتیاط سے کام لیا جائے اور پچھلے مدرسے سے نیک چلنی کی سند لے کر داخل کیا جائے۔

(۷) اہل خیر حضرات کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جو خدا کے ان مہمانوں کی دعوت کرتے ہیں اور ان اعلیٰ تعلیم کے حق دار لوگوں کی انتہائی توہین اور تضیع اوقات کا سبب بنتے ہیں۔ یہ طے کر لیا گیا ہے کہ طلبہ کو مدرسہ سے باہر کسی دعوت میں ہرگز نہ بھیجا جائے گا۔ اگر دعوت کرنا ضروری ہو تو ایک دن قبل مہتمم کو تعین وقت اور تعداد کے ساتھ اطلاع دی جائے اور مدرسے میں پابندیٔ وقت کے ساتھ کھانا لاکر اپنے آدمیوں کے انتظام میں کھلایا جائے۔

انجمن اصلاح الکلام

آپ نے ۱۳۲۸ھ میں ایک مجلس تقریر و مناظرہ قائم کی، جن کا نام کچھ عرصہ کے بعد انجمن اصلاح الکلام تجویز کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو تقریر و مناظرہ سکھایا جائے۔ ہر آٹھویں دن طلبہ تقریر و مناظرہ کیا کرتے تھے اور آپ خود ان کی رہنمائی فرماتے تھے۔

اتحاد مدارس اسلامیہ کی تحریک

آپ نے ۱۳۲۲ھ میں مدارس اسلامیہ کے اتحاد کی جو تحریک اُٹھائی تھی وہ کافی حد تک کامیاب ہوئی اور اس کی کامیابی کا مظاہرہ دارالعلوم دیوبند کے عظیم الشان اجتماع منعقدہ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ میں ہوا۔ اس اجتماع میں مدرسہ امینیہ کے دس فارغ التحصیل طلباء کی دستار بندی کی گئی۔

افسوس کہ یہ تحریک حکومت برطانیہ کی کڑی نگاہ کی وجہ سے وسیع تر نہ ہو سکی اور اسی میں عافیت تھی کہ خاموشی اختیار کر لی جائے۔ مولانا امین الدین صاحب مہتمم مدرسہ امینیہ کی وفات ۱۹رمضان ۱۳۸۸ھ (۷رجون ۲۰ء) کو ہوئی اور ۹......شوال ۱۳۸۸ھ (مطابق ۲۶رجون ۲۰ء) کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ امینیہ کا اہتمام بھی حضرت مفتی اعظم کے سپرد فرمایا۔

آپ کا ملی و قومی احساس

یورپین ٹرکی کے سیاسی مطلع کا ریاستہائے متحدہ بلقان کی بغاوت سے مکدر ہونا تھا کہ اسلامی اخوت اور ملی غیرت کی روح مغرب سے مشرق تک دوڑ گئی۔ دہلی کے مسلمانوں نے بھی گہری ہمدردی کا ثبوت دیا۔ مدرسہ امینیہ کی طرف سے قنوت نازلہ کے بارے میں ایک فتویٰ شائع کیا گیا۔ اس کے بعد چرم قربانی کے بارے میں دوسرا فتویٰ ہزاروں کی تعداد میں شائع کیا گیا۔

حضرت مفتی صاحب نے ایک جلسہ بلایا اور تقریر میں ترکوں کے اندوہناک مصائب بیان فرما کر اعانت کی ترغیب دی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ طلبہ نے اپنا سب کچھ دے ڈالا اور جن کے پاس کچھ نقد نہ تھا، انھوں نے کپڑے، کتابیں اور برتن دے ڈالے۔ اس کے بعد آپ نے مدرسین و طلبہ کے وفود مرتب کر کے روانہ کیے اور چندہ جمع کیا گیا۔ جو سامان جمع ہوا تھا اس کو آپ نے خود جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر نیلام کیا۔ آپ کی سعی و کوشش سے جو چندہ ہلال احمر کو دیا گیا اس کی میزان تین ہزار آٹھ سو چورانوے روپے آٹھ آنے نو پائی تھی۔

جس تربیت گاہ سے آپ تربیت پاکر نکلے تھے یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ صرف درس تدریس ہی کے مرد میدان نہ تھے بلکہ

میدان سیاست کے بھی شہسوار تھے۔ حضرت شیخ الہند کی وصیت کے سننے اور جاننے والے آج بھی موجود ہیں۔ اس نگاہ جوہر شناس نے اوّل دن سے اس گدڑی کے لعل کی آب و تاب دیکھ لی تھی اور ارکانِ جمعیۃ علماء کو وصیت فرمائی تھی کہ دو آدمیوں کو ہرگز نہ چھوڑنا۔ ایک مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور دوسرے مولانا کفایت اللہ (صدر جمعیۃ علماء ہند)۔

آپ کے دل میں قومی و ملّی احساس بدرجہ اتم موجود تھا اور باوجود خاموش طبع ہونے کے آپ اہم اور خطرناک موقعوں پر بے دھڑک میدان میں آجاتے تھے۔ بیسویں صدی کا آغاز مسلمان عالم کے لیے بے انتہا دل شکن اور صبر آزما تھا۔ جبکہ بلقان میں ترکوں پر آفتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ مبارک ہیں وہ آنکھیں جنھوں نے وہ منظر دیکھا ہوگا کہ چمنستان محمودؒ و قاسمؒ کا یہ سرو آزاد جامع مسجد شاہجہانی کی سیڑھیوں پر چندہ کا سامان نیلام کر رہا تھا اور لوگ زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر خرید رہے تھے۔ نعم البائع و نعم المشتری۔

حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے بعد ہندوستان کی سیاست کا رُخ بدل رہا تھا اور زعمائے ملک یہ محسوس کر رہے تھے کہ عوام کی رائے عامہ کو بیدار کر کے ملک کے اندر انقلاب کی روح پیدا کی جائے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ تمام فرقے آپس میں متحد ہو جائیں اور مشترک طور پر کوئی حرکت کی جائے۔ مسلم لیگ نے جو برادرانِ وطن کے ساتھ سمجھوتہ کا قدم اپنے جدید دَور ۱۹۱۵ء کے اجلاس بمبئی میں اُٹھایا تھا اور لکھنؤ کے اجلاس دسمبر ۱۹۱۶ء میں بصدارت مسٹر محمد علی جناح مکمل ہوا۔ جو میثاق لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے اس کی تفصیل کتب تاریخ میں مذکور ہے۔ اس میں صوبائی اسمبلیوں کے معاملے پر بہت بڑی ٹھوکر کھائی تھی جس کا احساس اس وقت کے لیڈروں کو نہیں ہوا اور مسلمانوں کی کوئی سیاسی جماعت بھی مسلم لیگ کے سوا نہیں تھی۔ خاص خاص کے علاوہ تمام علماء کے میدان سیاست میں قدم بھی نہ رکھا تھا۔ نہ جمعیۃ علماء کا وجود تھا نہ ان کا کوئی سیاسی پلیٹ فارم تھا۔ مگر جونہی کانگریس اور مسلم لیگ کا سمجھوتہ شائع ہوا فوراً ہندوستان کے علماء میں سے ایک ہی شخص اٹھا تھا، اس نے اس سمجھوتہ میں وہ خامیاں بیان کی تھیں جن کی بنا پر بعد میں تمام ہندوستان کے مسلمانوں نے اس سمجھوتہ کو ناقابل قبول سمجھا۔ وہ دُوربین مفکر حضرت مفتی اعظم تھے۔ آپ نے وزیر ہند لارڈ مانٹیگو کی آمد کے موقع پر ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں حکومت خود اختیاری کا مطالبہ پیش کیا۔

آپ نے ہی سب سے پہلے شرعی عدالتیں قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ یہاں ان تفصیلات کی ضرورت نہیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس سرہ جب سیاسی معاملات میں کسی لیڈر سے گفتگو کرتے تھے تو فرماتے تھے کہ ہمارے کفایت کو بلاؤ۔ ایک طرف حضرت شیخ کے وہ رفقاء اور تلامذہ تھے جو ہر وقت آپ کے ساتھ رہتے تھے اور ہر حالت کے شریک تھے۔ مالٹا میں اسیری کی سختیاں جنھوں نے آپ کے ہمراہ جھیلی تھیں اور دوسری طرف حضرت شیخ کا ہر اہم معاملہ میں مولوی کفایت کو یاد فرمانا۔ این سعادت بزور بازو نیست۔ آخر ایک روز آپ کے ایک تلمیذ خاص نے عرض کیا کہ حضرت ہم بھی تو آپ کے ہمراز و دمساز خدام ہیں اور سیاسی معاملات سے بھی واقف ہیں۔ فرمایا، ہاں بیشک تم لوگ سیاستداں ہو، لیکن مولوی کفایت کا دماغ سیاست ساز ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی اپنی کتاب (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک، ص ۱۴۶) میں لکھتے ہیں:

"مولانا شیخ الہندؒ نے علی گڑھ کالج کے انقلابی عنصر کو اپنی تحریک میں شامل کر لیا تھا۔ چنانچہ ان کے پارٹی پروگرام کو چلانے والے ایک طرف مولانا کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد تھے تو ان کے ساتھ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا محمد علی مساوی درجہ پر شریک تھے۔"

۸ راگست ۱۹۱۷ء کو ملک معظم (برطانیہ) کا مشہور اعلان بابت خود اختیاری شائع ہوا۔ کچھ روز کے بعد لارڈ مانٹیگو ہندوستان آئے اور میثاق لکھنؤ ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ زمانہ بے انتہا نازک اور خطرناک تھا۔ ملک کے اندر سیاسی بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ مسلمانوں

کی لیڈرشپ صرف مسلم لیگ کے ہاتھ میں تھی۔ علماء یہ خطرہ محسوس کر رہے تھے کہ اگر قومی و ملی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی صحیح رہنمائی نہ کی گئی تو آئندہ چل کر ان سے مزید غلطیاں سرزد ہونے کا قوی امکان تھا۔ مسلم لیگ کے گیارہویں اجلاس دہلی منعقدہ دسمبر ۱۹۱۸ء میں علماء سب سے پہلی بار بکثرت شریک ہوئے۔ علماء کی شرکت کی خوشی میں ایک تجویز مبارکباد کرسی صدارت سے پیش کی گئی، جو علماء اس اجلاس میں شریک ہوئے ان میں سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا عبداللطیف وغیرہ نے نمایاں حصہ لیا۔

رولٹ بل ۱۹۱۹ء کے خلاف جب گاندھی جی نے خلافت کمیٹی کی شرکت میں تحریک ستیہ گرہ شروع کی تو حضرت مفتی صاحب بڑے انہماک سے اس تحریک میں حصہ لے رہے تھے۔ آپ کے دولت خانے پر لیڈروں کے بڑے بڑے اہم مشورے ہوتے تھے، مگر آپ حکمت عملی کے ساتھ پوشیدہ کام کرتے رہے۔ گرفتاری کا موقع نہیں آنے دیا۔ ترک موالات کے بارے میں پانچ سو علماء کا انقلابی فتویٰ آپ نے ہی مرتب فرمایا تھا۔

۱۹۱۹ء میں جن چند حضرات نے جمعیۃ علماء ہند کے قیام کی ضرورت محسوس کی ان میں آپ کا نام نمایاں و درخشاں نظر آتا ہے۔ تمام ہندوستان کے علماء نے متفقہ طور پر آپ کو صدر منتخب کیا اور جمعیۃ علماء ہند کا سب سے پہلا دفتر مدرسہ امینیہ میں آپ کے ہی کمرہ میں قائم ہوا۔ کوئی محرر اور چپراسی نہیں تھا۔ بلکہ آپ خود اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند اپنے ہاتھوں سے تمام کام کیا کرتے تھے۔

آپ کو قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ فضائل و کمالات کا مجموعہ بنایا تھا۔ وہ علماء جو ہمیشہ جزوی مسائل میں اُلجھے رہتے تھے آپ کی قیادت میں ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو گئے اور یہ آپ کا ہی بلند اخلاق اور مضبوط کردار تھا کہ مختلف الخیال علماء میں ایک جگہ جمع ہونے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ جمعیۃ علماء کو آپ نے اپنے ہاتھوں سے پرورش کیا اور اپنی محنت و جانفشانی سے پروان چڑھایا۔ تقریباً ۲۰ برس آپ جمعیۃ علماء کے صدر رہے۔ مگر اس طویل عرصہ میں کبھی سالانہ کانفرنس کی صدارت نہیں فرمائی۔ قومی کاموں میں حتیٰ الامکان اپنی جیب سے رقمیں خرچ کرتے تھے۔ سفر خرچ وغیرہ بھی بہت کم لیتے تھے۔ جمعیۃ علماء کے اجلاس پشاور ۱۹۲۸ء میں راقم الحروف کو بھی (جبکہ میری عمر ۱۶-۱۷ سال کی تھی) اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ استقبالیہ کمیٹی کے بے انتہا اصرار کے باوجود میرا سفر خرچ اور کھانے وغیرہ کے مصارف نہیں لیے۔ صدر استقبالیہ نے کہا کہ ایک بچے کے سفر خرچ اور مصارف طعام کو آپ اتنی اہمیت نہ دیجئے جبکہ میں اپنی قوم اور اپنے صوبہ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اپنی خوشی سے پیش کر رہا ہوں۔ فرمایا کہ یہ بچہ اگرچہ صدر جمعیۃ کا بچہ ضرور ہے مگر جمعیۃ کا رکن نہیں ہے۔ اس کا سفر خرچ لینے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔

آپ کی عمر مبارک کے ۶۰ سال دینی و مذہبی اور سیاسی و ملی خدمات کے لیے وقف رہے۔ ایک طرف مدرسہ امینیہ کے ساتھ آپ کا یہ شغف تھا کہ بیماری کی حالت میں بھی درس و افتاء کا شغل رہتا تھا۔ مدرسہ سے رخصت نہیں لیتے تھے۔ کبھی ناغہ نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف قومی و ملی فرائض سے بھی غافل نہ تھے۔ ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی میں آپ بے انتہا باغیانہ اور خطرناک تقریریں کرنے کے جرم میں ۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۰ء مطابق ۷ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۹ھ کو اپنے دولت خانہ واقع کوچہ چیلان سے رات کے چار بجے گرفتار کیے گئے تھے۔

آپ کی عظیم الشان تقریروں کی گونج آج بھی فضائے آسمانی میں باقی ہے۔ اپنی پیرانہ سالی اور کمزوریٔ صحت کے باوجود دو دو تین تین گھنٹے تک اسٹیج پر شیر کی طرح گرجتے تھے۔ شروع میں آواز ہلکی ہوتی تھی مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد تیز، بلند اور قوی تر ہوتی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں لاؤڈ اسپیکر (آلہ مکبّر الصوت) کا رواج نہ تھا، مگر بڑے سے بڑے عظیم الشان مجمعوں پر آپ کی آواز حاوی ہوتی تھی۔ آپ کی تقریر عالمانہ ہوتی تھی۔ مگر عوام کے لیے بھی اس قدر

دلچسپ ہوتی تھی کہ کبھی آپ کی تقریر سے کسی کو اُٹھ کر جاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ غرضیکہ آپ خلوت میں اعلیٰ درجہ کے مفکر و مدبر اور جلوت میں اعلیٰ درجہ کے مقرر و خطیب تھے۔ ہر میدان میں آپ کا ارشاد و قول فیصل تھا۔ میں بلا خوف لومۃ لائم یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر مفتی اعظم گذشتہ تحریکات آزادی میں (خاص کر نہرو رپورٹ کے استرداد کے بعد) برادرانِ وطن کے ساتھ اشتراک عمل نہ کرتے تو اجتماعی حیثیت سے مسلمان ان تمام تحریکات سے بالکل الگ رہتے۔

غرض کہ یہ آپ کی پہلی گرفتاری تھی جو ۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۰ء کو وقوع میں آئی۔ گورنمنٹ برطانیہ آپ کی عظمت سے واقف تھی۔ آپ کے اوپر ہاتھ ڈالنا آسان کام نہ تھا۔ پہلے سے تمام ریزرو پولیس کو دہلی میں بلالیا گیا تھا۔ اسلحہ اور مشین گنوں کا انتظام کرلیا گیا تھا۔ اور شہر کے تمام گلی کوچوں کی بڑی سختی سے ناکہ بندی کرلی گئی تھی۔ قصاب پورہ، پہاڑ گنج، ملتانی ڈھانڈہ کی طرف سے خاص طور پر مشین گنیں لگائی گئیں اور ہزاروں کی تعداد میں پولیس بھیجی گئی۔ رات کے ۳ بجے سے شہر کے گلی کوچوں میں آمد و رفت بالکل بند کردی گئی تھی۔ حتیٰ کہ نماز فجر کے لیے جانے والوں کو بھی گھروں سے نہیں نکلنے دیا گیا تھا۔

تقریباً ۴ بجے کوتوال مجسٹریٹ وغیرہ آپ کے دولت خانہ پر آئے۔ گھر کے سب بچے عورتیں وغیرہ خوف زدہ تھے اور آپ نہایت استغنا کے ساتھ ان کے ہمراہ تشریف لے جارہے تھے۔ ہندوستان کے کسی لیڈر کو اس شان و شوکت اور اس انتظام کے ساتھ گرفتار نہیں کیا گیا۔ دہلی جیل میں مجسٹریٹ نے آپ کو ۶ ماہ قید بامشقت اے کلاس کا حکم سنایا۔ اور گجرات جیل میں منتقل کردیا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم خان بادشاہ خان عبدالغفار خاں، مولانا احمد سعید صاحب دہلوی، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی وغیرہ گجرات جیل میں آپ کے ساتھ تھے۔

دوسری گول میز کانفرنس (دسمبر ۱۹۳۱ء) کی ناکامی کے بعد دوبارہ سول نافرمانی شروع ہوگئی۔ اور ۴ر جنوری ۱۹۳۲ء کو گاندھی جی گرفتار کرلیے گئے۔ اس موقع پر جمعیۃ علماء پھر جنگ آزادی کے میدان میں آگئی۔ حضرت مفتی اعظم کو سب سے پہلا ڈکٹیٹر بنایا گیا اور دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے لیے ۱۱ر مارچ ۱۹۳۲ء بروز جمعہ جلوس کا اعلان کیا گیا۔ جامع مسجد شاہجہانی میں بعد نماز جمعہ جلسہ ہوا اور آپ نے جلوس میں پرامن طریقے اختیار کرنے کی تلقین فرمائی۔ اور جامع مسجد سے یہ عظیم الشان جلوس چلا جس میں ایک لاکھ نفوس تھے۔ جلوس کی رہنمائی آپ فرمارہے تھے۔ آزاد پارک عقب ٹاؤن ہال جلوس پہنچا اور وہاں جلسہ مرتب کیا گیا۔ وہاں دیودیال کوتوال شہر اور عبدالواحد قادیانی سب انسپکٹر پولیس کی بڑی بھاری جمعیت کے ساتھ موجود تھے۔ آپ ایک بنچ پر کھڑے ہوکر اپنا طوفانی بیان پڑھنا چاہتے تھے کہ پولیس نے بے تحاشا لاٹھی چارج شروع کردیا۔ نہتے عوام سراسیمہ ہوگئے۔ لاٹھی چارج بہت شدید تھا۔ سینکڑوں آدمی زخمی اور اَدھ موئے ہوگئے۔ آپ کے بائیں طرف مولانا عبدالحلیم صدیقی اور دائیں طرف ماسٹر ہلال احمد زبیری تھے اور سامنے راقم الحروف آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ مولانا عبدالحلیم کے کئی چوٹیں آئیں۔ زبیری صاحب کی کلائی کی ہڈی ٹوٹی اور راقم الحروف کے کندھے اور بازوؤں پر کئی لاٹھیاں پڑیں۔ ڈیڑھ دو ماہ تک علاج جاری رہا۔

پولیس کے بے رحمانہ لاٹھی چارج سے جب عوام منتشر ہوگئے تو کوتوال آپ کو گرفتار کرکے کوتوالی لے گیا اور وہاں سے دہلی جیل بھیج دیا گیا۔ سیاسی اسیروں کے مقدمات کے لیے جیل میں عدالت قائم کی جاتی تھی۔ آپ کو ۱۸ ماہ قید بامشقت اے کلاس کا حکم سنایا گیا۔ اور نیو سینٹرل جیل ملتان میں رکھا گیا۔ ملتان جیل میں مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا داؤد غزنوی، لالہ دیش بندھو گپتا، چودھری شیر جنگ وغیرہ آپ کے ساتھ تھے۔

آپ کا دینی احساس

باوجودیکہ قومی و وطنی تحریکات میں آپ جان کی بازی لگانے سے دریغ نہ فرماتے تھے اپنے دینی و مذہبی فرائض سے بھی غافل نہ

تھے۔ ۱۹۲۲ء میں جب سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک جاری کی اور ہزاروں ملکانوں کو مرتد کرلیا تو جمعیۃ علماء نے اس کی روک تھام شروع کی۔ تبلیغی وفود بھیجنے شروع کیے۔ سوامی شردھانند نے کس جذبہ کے ماتحت یہ تحریک جاری کی تھی اور اس کا جواب دینا مسلمانوں کا فریضہ تھا یا نہیں، اس موقع پر اس بحث کی ضرورت نہیں۔ بہرحال سب سے پہلا تبلیغی وفد جو حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب فرماکر اپنی دعاؤں کے ساتھ روانہ فرمایا تھا اس کے صدر مولانا محمد عرفان مرحوم (مدیر اوّل اخبار الجمعیۃ) تھے۔

شدھی کی تحریک کی وجہ سے ملک کے اندر فسادات اور بلوے جاری تھے اور اس سلسلے میں اتحاد کانفرنسیں بھی ہورہی تھیں۔ ۱۷ر ستمبر ۱۹۲۴ء کو گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے ۲۱ دن کا برت شروع کیا تھا۔ ۲۶ر ستمبر ۱۹۲۴ء کو سنگم تھیٹر مقابل ایڈورڈ پارک دہلی میں پنڈت مدن موہن مالویہ کی صدارت میں ایک عظیم الشان اتحاد کانفرنس منعقد کی گئی جس میں آپ اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سیّد سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالمحاسن سجاد، حکیم اجمل خاں، مولانا احمد سعید، مفتی محمد صادق قادیانی اور سوامی شردھانند، پنڈت رام چندر وغیرہ اور ملک کے دیگر زعما موجود تھے۔ صدر اجلاس نے اپنی تقریر میں اشتراک مذہب اور اتحادِ عمل کی ضرورت بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے مذہب میں سے سزائے مرتد اور تبلیغ کو نکال ڈالیں۔ تاکہ امن و اتحاد قائم ہو۔ دوسرے لیڈروں نے کہا یہ صلح کس طرح ہوسکتی ہے جبکہ تمھارے مذہب میں مرتد کے لیے سزائے قتل ہے۔ اس کانفرنس میں فریق مخالف بڑی تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ بڑے بڑے مشہور مناظر اور پنڈت موجود تھے۔ جدید تعلیم یافتہ لیڈروں کو ہمیشہ سے یہ خبط رہا ہے کہ اپنے آپ کو امام اعظمؒ کا جانشین سمجھتے رہے ہیں۔ ان مسائل میں برادرانِ وطن کے ساتھ تھے۔ مفتی محمد صادق نے کہا کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہیں ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علیؒ نے بھی یہی کہا۔ اس کانفرنس کا منظر دیکھنے والے اب بھی موجود ہیں۔ چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہورہی تھی اور صرف ایک اللہ کا شیر کھڑا ہوا گرج رہا تھا۔ اسلامی شعائر کی طرف سے مدافعت کررہا تھا یعنی مفتی اعظمؒ جو مناظروں کے بھی سینکڑوں میدان جیت چکے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد تبلیغ پر ہے۔ تبلیغ اس کے خمیر میں داخل ہے۔ اس کو تبلیغ کے حق سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اور بیشک اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اور یہ اسلام کا کھلا ہوا روشن اصول ہے۔ ہمیں اس کے ظاہر کرنے میں کسی قسم کا تامل نہیں، مگر ہندوستان کے فسادات اس عقیدہ کے نتائج نہیں ہیں اور اس سزا کو جاری رکھنے کا حق صرف سلطان اسلام کا ہے۔ پس موجودہ حالات میں اسلامی حدود کے جاری ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا کہ مولانا! یہ تو فرمایئے کہ سوراج کے بعد کیا ہوگا۔ آپ نے جواب دیا کہ سوراج کے بعد جمہوری مجلس مقننہ ہوگی۔ کیا وہ اسلامی قانون نافذ کرے گی؟ اگر کرے گی تو تمام احکام جاری ہوں گے مگر ہندوستان کے مستقبل کے مشترک پلیٹ فارم پر اسلامی حکومت کا تصور پیش نظر نہیں ہے۔

اللہ اللہ! اسلام کے اس مردِ مجاہد کی نظر کس قدر دوربین تھی۔ آج جو اسلامی حکومت کے نام سے ہندوستان کا ایک حصہ الگ ہوا وہاں خود اپنے ہی ہاتھوں اسلامی شعائر کا جو حشر ہورہا ہے کیا اس سے زیادہ بھی اسلام کی تاریخ میں کوئی دلگداز حادثہ ہوسکتا ہے؟

موتمر حجاز

جب حجاز سے شریف حسین کی عملداری کو سلطان ابن سعود نے ختم کردیا تو دنیائے اسلام کا ایک نمائندہ اجتماع منعقد کرنے کی تجویز ہوئی۔ یہ موتمر عالم اسلامی مورخہ ۲۶ر ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ کو مکہ معظمہ میں شریف شرف عدنان کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی اور اس میں تمام اسلامی ممالک کے منتخب وفود شریک ہوئے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے جو وفد بھیجا گیا تھا، اس کے ارکان مندرجہ ذیل تھے۔

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ (صدر وفد) مولانا عبدالحلیم صدیقی پرائیویٹ سکریٹری صدر وفد، مولانا محمد عرفان سکریٹری

وفد، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد سعید، مولانا نثار احمد ارکان وفد۔

آپ نے سلطان ابن سعود سے مطالبہ کیا کہ موتمر اسلامی میں حجاز کے لیے حکومت کی تشکیل کا مسئلہ بھی زیر بحث آنا چاہیے۔ چنانچہ یہ مسئلہ ایجنڈے میں شامل کرلیا گیا۔ ۱۴؍مئی ۲۵ء کو اکبری جہاز بمبئی سے روانہ ہوا تھا جس میں جمعیۃ علماء کا وفد اور جمعیۃ خلافت کا وفد اور ہندوستان کے تقریباً چار سو علماء و زعماء روانہ ہوئے۔ خلافت وفد مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی صدر وفد، مسٹر شعیب قریشی سکریٹری وفد، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی ارکان وفد، یہ سب حضرات ہم سفر ہی نہیں بلکہ ہر حال کے رفیق، غمگسار و مددگار تھے۔

اس عظیم الشان بین الاقوامی کانفرنس میں ہند، مصر، جاوا، فلسطین، بیروت، شام، سوڈان، نجد، حجاز، روسی ترکستان، عسیر، افغانستان، وادی نیل، ترکی، لاذقیہ وغیرہ کے وفود شامل تھے۔

سبجیکٹ کمیٹی کے لیے مندرجہ ذیل ارکان کو منتخب کیا گیا۔ مفتی اعظم فلسطین الحاج امین الحسینی، مفتی اعظم ہند مولانا کفایت اللہ، حافظ وہبہ وزیر اعظم حکومت سعودیہ، مولانا شوکت علی رکن وفد خلافت کمیٹی، ضیاء الدین رئیس وفد روسی، عمر سعید وفد جاوا۔

اس کانفرنس کے تمام اجلاسوں میں آپ نے بہت محنت سے کام کیا۔ حجازیوں سے اور خاص کر سلطان سعود سے خوب خوب جھڑپیں ہوئیں۔ تمام دنیا کے علماء و زعماء نے آپ کی قابلیت کا لوہا مانا۔ حجاز میں تمام مذاہب کی آزادی اور بردہ فروشی کے غیر شرعی رواج کا انسداد نیز اور بہت سی تجاویز پیش کیں۔ اور اپنی قوت استدلال سے منظور کرائیں۔ تفصیلات کی گنجائش نہیں۔ صرف ایک لطیفہ لکھتا ہوں۔ سلطان ابن سعود سے ایک ملاقات کے دوران آپ نے کہا کہ اگر آپ کو مدینہ منورہ میں بھی وہی کرنا تھا جو مکہ معظمہ میں ہوا تو آپ نے دنیائے اسلام سے یہ وعدہ کیوں کیا تھا کہ ہم موتمر اسلامی کے فیصلہ تک مدینہ میں کوئی قابل شکایت کام نہیں کریں گے۔ سلطان نے کچھ تامل کے بعد جواب دیا کہ میری قوم کے پانچ ہزار آدمیوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں مقبرہ وماثر کو منہدم نہ کروں گا تو وہ خود چڑھائی کر کے یہ کام کریں گے۔ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ مبادا وہ مجھ سے زیادہ تخریب کریں۔ اس لیے میں نے ان کا مطالبہ پورا کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ کیا آپ کو اپنی قوم کا حال معلوم نہ تھا؟ جب آپ ان کی وحشت و بربریت کو جانتے تھے، اور اعلان ملوکیت کے وقت تجربہ بھی کر چکے تھے تو آپ نے اس قسم کا وعدہ کیوں فرمایا؟

سلطان ابن سعود سٹ پٹا کر لاجواب ہو گئے۔ ایک مصاحب نے جواب دیا کہ جلالۃ الملک نے یہ سوچا تھا کہ میں اپنی قوم کو سمجھا لوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ کس صورت سے سمجھا لینے کی امید تھی۔ دلیل سے؟ یا طاقت سے؟ اس پر تمام حاضرین لاجواب ہو گئے۔

موتمر فلسطین

جب برطانیہ نے فلسطین کو تقسیم کیا اور ایک حصہ میں یہودیوں کی حکومت قائم کر دی تو فلسطین کے عربوں میں سخت بے چینی اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ برطانیہ کے خلاف تحریک جاری تھی۔ حکومت کی طرف سے عربوں پر بے انتہا مظالم ہو رہے تھے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان میں بھی جمعیۃ علماء ہند نے مجلس تحفظ فلسطین قائم کی۔ اعراب فلسطین اور شہدائے فلسطین کے لیے چندہ وغیرہ جمع کیا۔ تمام ہندوستان میں تقسیم فلسطین کے خلاف ۲۶؍اگست ۳۸ء کو یوم فلسطین منایا گیا۔ احتجاجی جلسے ہوئے اور جلوس نکالے گئے۔ اس سلسلے میں برطانیہ نے قاہرہ میں عالم اسلامی کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز کی۔ یہ کانفرنس "موتمر البرطانیہ المصریہ لدفاع عن فلسطین" کے نام سے مشہور ہے۔ مورخہ ۷؍اکتوبر ۳۸ء کو یہ موتمر قاہرہ میں علی علوبہ باشا کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مصر، شام، عراق، یوگوسلاویہ، پولینڈ، رومانیہ، ترکی غرضیکہ تمام عالم اسلامی کے تقریباً ساڑھے تین ہزار نمائندے شریک تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے جو وفد بھیجا گیا تھا اس کے نمائندے مندرجہ ذیل تھے: مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ رئیس وفد، مولانا عبدالحق مدنی اور مولانا محمد یوسف بنوری ارکان وفد تھے۔

آپ ۲۶ر ستمبر ۳۸ء کو دہلی سے روانہ ہوئے اور ۶ر اکتوبر کو قاہرہ پہنچ گئے۔ اسٹیشن پر بہت شاندار استقبال کیا گیا۔ مولانا محمد یوسف بنوری فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت مفتی اعظم کے استقبال کا جو نظارہ قاہرہ میں دیکھا (ہمارے دل مسرت کی وجہ سے اُچھل رہے تھے اور ہمارے سر فخر کی وجہ سے بلند ہو رہے تھے) اتنا عظیم الشان استقبال دنیا کے کسی نمائندے کا نہیں کیا گیا۔ مفتی اکبر، زندہ باد، ہندی وفد زندہ باد کے فلک بوس نعرے لگائے جا رہے تھے۔ ایک عظیم الشان جلوس کی صورت میں آپ کو قیام گاہ تک لے جایا گیا۔ ۷ر اکتوبر شام کو ۵ بجے مؤتمر شروع ہوئی۔ صدر کے دائیں جانب آپ کے لیے کرسی مخصوص کی گئی تھی۔

سبجیکٹ کمیٹی کے ارکان میں آپ کا نام سب سے پہلے رکھا گیا تھا۔ سبجیکٹ کمیٹی کے ۱۸ ممبر تھے جن میں سے تین ہندوستانی تھے یعنی حضرت مفتی اعظم (صدر جمعیۃ علماء) مولانا محمد عرفان اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن صدیقی ارکان وفد خلافت کمیٹی۔

آپ جہاز ہی میں علیل ہو گئے تھے۔ اور مصر پہنچ کر بھی شدید بخار میں مبتلا رہے۔ اس لیے کانفرنس میں خود شریک نہ ہو سکے۔ حضرت مولانا عبدالحق مدنی نے مؤتمر میں آپ کا بیان پڑھا اور آپ کی نمائندگی کی۔

آپ کی علالت کے دوران میں شیخ ازہر علامہ مصطفیٰ المراغی کئی مرتبہ آپ کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ مصر میں شیخ ازہر کی پوزیشن شاہ مصر سے زیادہ ہے۔ یعنی شیخ ازہر سے ملاقات کے لیے شاہ مصر خود ان کی خدمت میں آتے ہیں۔ شیخ الازہر کسی سے ملنے کے لیے کہیں تشریف نہیں لے جاتے۔ یہ خاص امتیاز تھا جو انھوں نے ہندوستان کے مفتی اعظم کے لیے برتا۔ مؤتمر میں تمام مندوبین عالم اسلام کے بیانات سے زیادہ سخت اور بے باکانہ آپ کا بیان تھا۔ قاہرہ سے رخصت کے وقت مصر کے علماء و زعماء نے چاہا کہ گروپ کے ساتھ آپ کا فوٹو لیا جائے۔ آپ نے انکار فرمایا۔ بس پھر کیا تھا وہاں کے علماء نے مناظرہ شروع کر دیا۔ بڑی مدلل تقریریں شروع کر دیں۔ آپ نہایت خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔ آخر میں آپ نے دریافت کیا کہ یُعَالِجُ فِیهِ أم لا؟ ایک صاحب بولے کیف لا؟ آپ نے فرمایا فھو حرام۔ مجلس پر کچھ ایسی خاموشی چھا گئی کہ پھر اس مسئلہ کے بارے میں کوئی شخص ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔

دم واپسیں

۲۶ر شوال ۱۳۵۰ھ کو آپ نے مدرسہ امینیہ کے انتظام کے بارے میں جو ہدایات شائع کی تھی، اس کی تمہید مندرجہ ذیل ہے:

"چونکہ مذہب کی آزادی وطن کی آزادی کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کے لیے جدوجہد کرنا میں اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہوں اور اس فریضے کی ادائیگی کے جرم میں مجھے توقع ہے کہ میں گرفتار کر لیا جاؤں گا۔ اس لیے مدرسہ امینیہ دہلی کی ان ذمہ داریوں کو جو میرے اوپر ہیں پیش نظر رکھ کر میں نے حسب ذیل انتظام کر دیا ہے تاکہ میری اسیری کے زمانہ میں مدرسہ کے کام میں کوئی خلل نہ آئے اور حقیقی نگراں و محافظ تو رب العزت جل شانہ ہی ہے۔"

یہ مجاہدین ملت اور شہیدانِ وطن کا خواب تھا۔ افسوس کہ آزادیٔ وطن کے بعد بھی اس کی تعبیر پوری نہ ہوئی۔ اپنی زندگی میں انھوں نے حصولِ مقصد کے لیے بڑی بڑی کٹھن منزلیں طے کیں۔ بڑی بڑی آفتیں جھیلیں، لیکن اس بارگاہ کون و فساد سے کوچ کرنے سے پہلے خود اپنی آنکھوں سے اپنی آرزوؤں کا خون ہوتے ہوئے بھی دیکھ گئے۔ ان کے کیا تاثرات اور کیا احساسات تھے۔ اب الفاظ میں کون ان کو بیان کر سکتا ہے۔ یہ جگر کا ناسور وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ زندگی میں اس کو بہتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا۔

آپ تقریباً دس برس سے گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ جلسوں اور پبلک کاموں میں کوئی حصہ نہ لیتے تھے۔ الٰہ آباد کے ہندی اخبار "امرت پتریکا" نے جب رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی اور اس کے خلاف احتجاج کے طور پر ۱۴ر اگست ۱۹۵۲ء کو جامع مسجد شاہجہانی کے سامنے جمعیۃ علماء کے اہتمام سے بہت بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا۔ اس کی صدارت آپ نے ہی فرمائی تھی۔ یہ دس برس کی گوشہ نشینی کے بعد پہلی اور آخری صدارت تھی۔ اسی وقت سے آپ کی صحت گرنے لگی۔ آپ ہر وقت اداس اور ملول رہنے لگے۔

ایک روز آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ ہم کو بھی اپنی زندگی میں کیا کیا دیکھنا تھا۔

ہو گیا مخمور اس آغاز کا انجام بھی
میں نے غم کھا تو لیا لیکن مجھے غم کھا گیا

آہ! لبوں پر مہر خاموشی تھی۔ دل سلگ رہا تھا۔ عاشقانِ جاں باز کے دل پر کیا گذرتی ہے اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کو کبھی عشق سے واسطہ پڑا ہو۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ ملت اسلامیہ کے اس بوڑھے سپہ سالار کے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ آدھی صدی دینی و سیاسی جدوجہد میں گذار کر بوڑھا شہسوار زمانے کی ناسازگاری سے تھک چکا تھا۔ اب اس کو ایک نیند کی ضرورت تھی۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن رحمت کا ایک جھونکا آیا اور اس کو نیند آگئی۔

یہ اسی برس کی بے داغ زندگی کیا تھی۔ ایک شاعر کی نظر میں:

زیست ہے ایک وقفہ موہوم
زندگانی سے زندگانی تک

لیکن یہ وقفۂ موہوم ایک انقلاب انگیز برق تھی۔ ایک اسوۂ حسنہ تھا۔ حریم نبوت کی روشنی اور چمنستان شریعت کی نسیم تھی جو ۱۳-۱۴ ربیع الثانی ۷۲ ۱۳ھ، ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء کیم جنوری ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب یعنی شب پنجشنبہ کو ساڑھے دس بجے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اخلاق و عادات اور کچھ متفرق حکایات

آپ نہایت سادہ طبیعت خاموشی پسند تھے۔ وقار اور متانت کا یہ عالم تھا کہ چھوٹے آپ کے رعب سے کانپتے اور احباب اور رفقاء آپ کی ہیبت سے ڈرتے تھے۔ خوش اخلاق اور مرنجان مرنج تھے۔ آپ کام خود کرنے کے عادی تھے۔ ہنر مند ایسے تھے کہ کوئی کام آپ کے لیے مشکل نہ تھا۔ خط نہایت عمدہ اور دلفریب تھا۔ آپ کا کمال خوشنویسی بالکل وہبی اور محض عطیہ ربانی تھا۔ خوش نویسی کی مشق آپ نے کبھی نہیں کی۔ حساب میں بڑی عمدہ مہارت تھی۔ سادہ لباس پہنتے تھے۔ کوئی امتیازی شان پیدا کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ شہرت و نمائش سے ہمیشہ متنفر رہے۔ عربی اور فارسی میں بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ اردو میں بھی کچھ تھوڑی سی شاعری کی ہے۔ عربی مکالمے میں فصاحت و بلاغت کا یہ عالم تھا کہ عرب کے علماء نے آپ کی زبان دانی کی تعریف کی اور کہا کہ ہندوستان کے علماء میں ہم نے صرف آپ کو اہل زبان کی طرح شستہ زبان بولتے ہوئے سنا۔

شیخ الازہر علامہ مصطفیٰ المراغی مرحوم نے آپ کے متعلق فرمایا تھا کہ ینبلج العلم والوقار فی جبینہ (اس شخص کی پیشانی پر علم اور وقار چمکتا ہے)

عالم اسلام کے اکثر زعما سے آپ کے تعلقات اور خط و کتابت تھی۔ مفتی اعظم فلسطین آپ کا بڑا احترام کرتے تھے سید توفیق شریف مرحوم (شامی لیڈر) جب ہندوستان آتے تھے تو اکثر آپ کے دولت خانہ پر قیام کرتے تھے۔ ہندوستان کے لیڈر تو آپ کو اپنا بزرگ تسلیم کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا محمد علی وغیرہ کی دعوت کی۔ دستر خوان پر چنے کی دال کا بھرتہ بھی تھا۔ حکیم صاحب نے اس کو بہت پسند کیا اور فرمایا کہ مفتی صاحب یہ دال ضرورت سے زیادہ لذیذ کیوں ہے؟ فرمایا کہ یہ میں نے اپنے ہاتھ سے پکائی ہے اور چونکہ خلوص کے ساتھ پکائی ہے، اس لیے لذیذ معلوم ہو رہی ہے۔

آہ! اب نہ وہ خلوص والے رہے، نہ وہ خلوص کی قدر پہچاننے والے رہے۔ حکیم صاحب مرحوم اپنی مجلس اور مطب میں کسی والیٔ ریاست کے استقبال کے لیے بھی کھڑے نہ ہوتے تھے لیکن جب آپ تشریف لاتے تھے تو سروقد کھڑے ہو جاتے تھے اور دوڑ کر دروازے سے آپ کو اپنے ساتھ لاتے تھے۔

حضرت مولانا محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے کہ مفتی کفایت اللہ کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے۔ آپ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ سے بیعت تھے، مگر خود کسی کو بیعت نہیں کیا۔ جب کوئی عقیدت مند بیعت کی درخواست کرتا تھا تو مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یا مولانا عبدالقادر رائے پوری مدظلہم العالی یا مولانا حسین احمد مدنی مدظلہم العالی یا مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی ہدایت فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ راقم الحروف کچھ بیمار ہو گیا۔ اس وقت چھ سات برس کی عمر تھی۔ والد مرحوم نے اپنے ایک شاگرد مولوی محمد ایوب کولہاپوری کے ساتھ مجھے ڈاکٹر انصاری کے مطب میں بھیجا۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کا مطب مسجد فتح پوری کے شرقی دروازہ کے دائیں جانب کمرے پر (بالمقابل کورونیشن ہوٹل) واقع تھا۔ مطب کے منیجر غالب صاحب تھے (جو رشتے میں غالباً خالہ زاد بھائی تھے) تمام آنے والے مریضوں کے نام رجسٹر پر لکھتے تھے۔ فیس وصول کرتے تھے اور مطب میں ترتیب وار بھیجتے تھے۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کے معائنہ کی فیس پانچ روپے تھی۔ والد محترم نے مجھ کو اپنے ساتھ لے جانا اس لیے مناسب نہ سمجھا کہ شاید ڈاکٹر صاحب فیس قبول نہ کریں۔ محمد ایوب کو سمجھا دیا تھا کہ وہاں میرا نام نہ لینا۔ جب مطب میں پہنچے، فیس پیش کی تو غالب صاحب نے پوچھا کہ اس بچہ کے والد کا کیا نام ہے۔ مولوی صاحب نے کہا عبداللہ۔ پھر پوچھا آپ کہاں سے آئے ہیں۔ انھوں نے کہا یہیں دلی شہر سے۔ غالب صاحب کی یہ کیفیت تھی کہ نوٹ ہاتھ میں تھا اور اُلٹ پھیر کر مختلف سوالات کر رہے تھے۔ دیگر حاضرین بھی حیران تھے کہ اس قدر تحقیقات کیوں ہو رہی ہے۔ آخر جب بھید کھلا تو نوٹ کو میز کی دراز میں رکھ لیا اور اندر ڈاکٹر صاحب کے پاس چلے گئے۔ دو تین منٹ کے بعد واپس آئے اور ہم کو نمبر کے خلاف اندر بھیج دیا۔ ہم معائنے کے کمرے میں داخل ہوئے تو ڈاکٹر صاحب کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ جب ان کی متجسس اور متبسم نگاہیں مجھ پر پڑیں تو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ سورج کی شعاع میرے دل کو برما رہی ہے۔

میرے سلام کے جواب کے بعد میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انھوں نے پہلا سوال یہ کیا، کہ بیٹا تمھارے ابا کا کیا نام ہے؟ میں نے کہا اباجی، بے ساختہ ہنس پڑے اور مولوی ایوب سے کہا کہ مولوی صاحب سچ کہئے، کیا یہ مولانا کفایت اللہ کا بچہ نہیں ہے؟ اب سوائے اقرار کے کوئی چارہ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً فیس واپس کروادی۔ مجھ سے فرمایا کہ دیکھا، میں تم کو کیسا پہچانا۔ معائنہ کے بعد نسخہ لکھ کر دیا اور چلتے وقت کہا کہ اپنے اباجی سے میرا سلام کہنا۔

اہل حاجت اور مستفتی لوگوں کے ساتھ آپ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ بسا اوقات رات کے بارہ اور ایک بجے لوگ فتویٰ لینے آتے تھے۔ آپ بستر استراحت سے خود اُٹھ کر تشریف لاتے تھے اور پیشانی پر بل بھی نہ آتا تھا۔ آپ کے ایک شاگرد مولوی محمد فاروق کہتے ہیں کہ ایک روز مدرسہ امینیہ سے واپسی کے دوران کاٹھ کے پل پر ایک صاحب ملے اور کہنے لگے کہ حضرت مجھے ایک ضروری فتویٰ لینا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے ان سے فتویٰ لیا اور کمپنی باغ کے دروازے کے سامنے پٹرول پمپ کے پاس ایک چارپائی پر اجازت لے کر بیٹھ گئے اور فتویٰ کا جواب لکھ کر اسی وقت ان کے حوالہ کیا۔

یہ چیز آپ کی فطرت میں داخل تھی کہ آپ کسی ملاقاتی کو انتظار کی زحمت نہیں دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کا نہیں ہزاروں مرتبہ کا تجربہ ہے کہ کھانا کھانے کے دوران اگر کوئی آجاتا تھا تو آپ کھانا چھوڑ دیتے تھے، اور جا کر ملاقات کرتے تھے۔ اور اگر فتویٰ لے کر کوئی آتا تھا تو فتویٰ بھی لکھ دیتے تھے۔ غرضیکہ فتویٰ لکھنے کے لیے کوئی خاص وقت کبھی مقرر نہیں کیا۔ چوبیس گھنٹے اور آرام و راحت حتیٰ کہ پوری زندگی افتاء اور اہل حاجت کے لیے وقف کر رکھی تھی۔

طبیعت بے انتہا غیور تھی۔ کبھی کسی کے سامنے اپنی ضرورت یا اپنی کسی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔ ایک مرتبہ ایک دوکان دار سے کوئی چیز خریدی جس کی قیمت حقیقت میں دس روپے تھی۔ اس نے کہا کہ حضرت ویسے تو میں پندرہ روپے لیتا تھا، مگر آپ سے دس روپے لوں گا۔ آپ کے پاس اس وقت صرف دس روپے تھے۔ دوکان دار کو کچھ نہیں دیا۔ گھر آکر اپنے شاگرد (مولوی ضیاء الحق دہلوی) کو پندرہ روپے دیئے اور فرمایا کہ اگر وہ پورے پندرہ روپے نہ لے تو اس کے سامنے پھینک کر آجانا۔

مکان کے لیے زمین خریدلی تھی۔ مگر بنوانے کے لیے روپیہ نہ تھا۔ دہلی کے ایک رئیس نے آپ سے درخواست کی کہ میں روپیہ پیش کر دوں گا۔ آپ تعمیر شروع کرا دیجئے۔ آپ نے انکار فرمادیا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر انھوں نے اصرار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا کچھ روپیہ قرض دے دو اور پرونوٹ لکھوالو۔ انھوں نے ضابطے کے

مطابق پرونوٹ انگریزی میں ٹائپ کرا کر پیش کیا۔ فرمایا کہ اس کا ترجمہ مجھے سناؤ۔ انھوں نے ترجمہ سنایا۔ آپ نے دستخط کرنے سے انکار فرمادیا۔ کیونکہ اس میں شرح سود بھی لکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے بہت کچھ سمجھانے اور تسلی دلانے کی کوشش کی کہ حضرت یہ تو صرف ضابطہ کی خانہ پری ہے۔ ورنہ ہم نے عمر بھر میں نہ کسی کو سود دیا، نہ کسی سے سود لیا۔ فرمایا کہ مجھے قرض لینے کی ضرورت نہیں ہے آپ مجھے معاف کیجئے۔ آخر انھوں نے دوسرا پرونوٹ ٹائپ کرلیا جب آپ نے دستخط فرمائے۔ قرض سے ہمیشہ بچتے تھے۔ وفات کے وقت آپ کسی کے مقروض نہیں تھے۔

آپ کے ہزاروں شاگرد ہندوستان، پاکستان، برما، ملایا، جاوا، سماترا، عراق، حجاز، شام، افغانستان، ایران، بخارا، فتن، تبت، چین اور افریقہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے مشاہیر میں سے حضرت مولانا حافظ اعزاز علی (استاذ الفقہ والادب دارالعلوم دیوبند) حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن (صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) اور حضرت مولانا حافظ احمد سعید (ناظم اوّل جمعیۃ علماء ہند) آپ کے محبوب اور خاص تلامذہ میں سے ہیں۔

آپ کے کمالات و فضائل کی شرح وتفصیل مجھ جیسے ہیچ مداں کے امکان سے باہر ہے۔ اپنی کوتاہ علمی نیز قلت گنجائش کی وجہ سے مقالہ ہٰذا کو ختم کرتا ہوں۔ ابھی آپ کے کمالات و فضائل اور آپ کی علمی و دینی خدمات پر بہت کچھ لکھا جائے گا۔ موجودہ نسل کو بھی آپ بہت کچھ سکھا گئے۔ اور آئندہ نسلیں بھی آپ کے اسوہ سے بہت کچھ سیکھیں گی۔ چودھویں صدی ہجری کا یہ عظیم المرتبت انسان تھا جو انبیاء علیہم السلام کی سادگی واستغناء خودداری و تحمل، دیانت و امانت، صبر و قناعت اور عزم واستقلال کا نمونہ پیش کر گیا۔

اللّٰھم اغفر لہ و متعنا بلسوتہٖ اِنّک اَرحم الراحمین.

□□

جشن صلح کا مقاطعہ ہر مسلمان کا فرض ہے

مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ کا ارشاد گرامی

”شرعاً ایسی حالت میں مقامات مقدسہ خلیفۃ المسلمین کے قبضے سے باہر ہیں اور بغداد شریف وبیت المقدس ونجف اشرف وغیرہ غیر مسلموں کے قبضے میں ہیں مسلمان کسی طرح ایک ایسی صلح کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتے جس کا نتیجہ اس وقت اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ امیر المومنین خلیفۃ المسلمین کے قبضہ اقتدار سے ان کے ممالک نکال لیے گئے ہیں اور اسلام کی دنیوی طاقت و اقتدار کو زائل کیا جا رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں طبقہ علماء دین سے ہوں اور شرعی نقطہ نظر سے کہتا ہوں کہ مسلمان کسی ایسی صلح کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتے اگر ہوں گے تو شرعاً گناہگار ہوں گے۔“

مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ صاحبؒ کی
مقدس زندگی کے چند اوراق

از: سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب نائب صدر جمعیۃ علماء ہند

یوں تو حضرت مفتی صاحب قبلہ کی ہمراہی کا مجھ کو ہر سفر اور حضر میں شرف حاصل رہا ہے اور ہمیشہ ان کی خداداد قابلیت کا معترف اور مدح خواں رہا ہوں۔ لیکن تین سفر جو قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہم رکابی میں اس فقیر کو میسر آئے ہیں وہ تمام عمر مجھ کو یاد رہیں گے اور وہی میرے لیے انشاء اللہ توشہ آخرت ہوں گے۔ پہلا سفر، حج ہے جو مفتی صاحب قبلہ کا پہلا سفر اور میرا دوسرا سفر تھا۔ اگرچہ مفتی صاحب قبلہ کا ارادہ کئی سال سے ہو رہا تھا۔ لیکن حسن اتفاق سے موتمر اسلامی کا موقع نکل آیا۔ اور اس تقریب کی وجہ سے بعض اچھے اچھے اور مشہور حضرات رفیق سفر ہو گئے۔ علی برادران، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا سراج الحق صاحب استاد دار العلوم دیوبند کثر اللہ سوادہ، مولانا محمد عرفان، مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا میرزا محمود اراز بیگ صاحب سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند یہ سب حضرات ہندوستان کی مختلف کمیٹیوں کی جانب سے وفود کی شکل میں تشریف لے گئے تھے۔ کچھ مخلصین تھے جو محض اس خیال سے ہمراہ ہو گئے تھے کہ حج سفر کے ساتھ موتمر اسلامی میں شریک ہو سکیں گے۔

مفتی صاحب اس سفر میں بالکل خاموش تھے البتہ کبھی کوئی آہستہ آہستہ توبات کر لیتے ورنہ اپنے کیبن میں رہا کرتے۔ جب نماز پڑھنے نکلتے تو عرشہ پر بیٹھ جاتے۔ جس قدر ہمراہی تھے وہ یا تو مفتی صاحب کے ہم سبق علماء تھے یا آپ کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد تھے۔ جہاز میں ہم سب لوگ کھانا ایک ہی جگہ کھاتے تھے۔ قرنطینہ میں مفتی صاحب حضرت مفتی صاحب قبلہ کو میں نے دیکھا کہ بیچارے سے جو کپڑے لوگوں کے سیل گئے تھے وہ دھوپ میں پھیلا رہے تھے۔ اور جب خشک ہو جاتے ہیں تو ان کپڑوں کو بہت قاعدے سے طے کر کے ہر کپڑے کے مالک کو پہنچاتے ہیں۔ میں نے عرض کیا، آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ فرمایا یہ سفر حج ہے۔ اس میں لوگوں کی مدد کر رہا ہوں جدہ پہنچنے کے بعد تمام وفود سعودی حکومت کے مہمان ہو گئے اور سعودی حکومت کی نگرانی میں ہم لوگ مکہ معظمہ پہنچا دیے گئے۔ وہاں مختلف اسلامی ممالک کے وفود قیام پذیر تھے۔ وہاں پہنچ کر مختلف لوگوں سے تبادلہ خیالات ہوتے رہے۔ حضرت مفتی صاحب قبلہ سے عرب کے علماء گھنٹوں گفتگو کرتے تھے۔ بحث کا موضوع عام طور سے ملوکیت اور جمہوریت ہوتا تھا۔ یمن کے حضرات ملوکیت کے بہت حامی تھے۔ لمبی اور طویل گفتگو کے بعد کچھ لوگ جمہوریت کے قائل ہو جاتے تھے۔

علی برادران اور مفتی صاحب

علماء وفود کے علاوہ حضرت مفتی صاحب کا بہت سا وقت علی برادران سے گفتگو میں خرچ ہوتا تھا۔ اور وہ علی برادران کو نرم پالیسی اختیار کرنے پر آمادہ کرتے رہتے تھے۔ ابتدائی کانفرنس کے بعد مختلف سب کمیٹیاں منتخب ہوئیں اس میں سے سب اہم وہ سب کمیٹی تھی جو تجاویز مرتب کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کمیٹی کے کنوینر سید سلیمان ندوی تھے۔ اس کمیٹی کے تمام جلسے حضرت مفتی صاحب قبلہ کی صدارت میں ہوتے تھے اور جو تجویزیں کھلی کانفرنس میں پیش ہوئیں وہ تقریباً تمام حضرت مفتی صاحب کی مرتب کردہ تھیں۔ کئی روز تک کانفرنس ہوتی رہی۔ کانفرنس ختم ہونے کے بعد ہم لوگ مدینہ منورہ چلے گئے۔ چونکہ یہ سفر اونٹوں پر ہوا تھا اس لیے رات کو جہاں قافلہ ٹھہرتا، مفتی صاحب قبلہ تمام انتظام کرتے، پاخانہ باورچی خانہ درست کرتے اور قدمچوں کے لیے پتھر تلاش کرتے پھرتے اور

جب ہم سب سو جاتے اس کے بعد مفتی صاحب قبلہ تہجد کی نماز پڑھتے۔ تہجد کی نماز میں مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ پسند تھا۔ یعنی کوئی شخص دیکھے نہیں۔ کسی شغدف کے پیچھے چھپ کر کھڑے ہو جاتے۔ یا کوئی اور آڑ تلاش کر لیتے اور اس کے پیچھے اپنے کو چھپا کر نماز ادا کرتے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر وہاں کے علماء اور مشائخ کے ساتھ اکثر صحبتیں رہیں اور بعض علمی تذکرے بھی ہوئے سب سے زیادہ رقت انگیز وہ موقع تھا جب روضۂ اطہر پر آخری سلام کے لیے حاضر ہوئے۔ میں حضرت مفتی صاحب قبلہ کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ عام عادت یہ تھی کہ روضہ اطہر پر جب حاضر ہوتے تو اس کے بعد دیر تک کوئی بات نہ کرتے تھے، اور تقریباً گھنٹہ بھر تک خاموش رہتے تھے۔ لیکن آخری دن مفتی صاحب تقریباً تین گھنٹے تک خاموش رہے یہاں تک کہ قافلہ روانہ ہو گیا اور مدینہ منورہ سے دور نکل آیا۔ تب بھی سکوت کا عالم طاری رہا۔ زیادہ وقت حضرت کا حرم مدینہ اور حرم مکہ میں گذرتا تھا۔ مفتی صاحب رات کو خاموشی کے ساتھ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی گلیوں میں روپے تقسیم کیا کرتے تھے۔ غرض ان کی قابلیت کا اندازہ موتمر میں لگایا جاتا تھا اور خلوص و عبادت اور ان کے تقویٰ کا اندازہ حرم میں دیکھا جا سکتا تھا۔

دوسرا اور تیسرا سفر

دوسرا سفر حضرت مفتی صاحب قبلہ کے ہمراہ گجرات جیل کا اور تیسرا سفر ملتان جیل کا ہوا۔ گجرات جیل میں صرف چار یا ساڑھے چار ماہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ معیت نصیب ہوئی۔ فتح الباری شرح بخاری کا پچھلا پارہ میں نے حضرت سے وہیں پڑھا۔ اس وقت جیل میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی۔ مسٹر آصف علی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم۔ خان عبدالغفار خاں۔ مولانا نور الدین صاحب لائل پوری۔ مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ اور بہت سے ہندوستان کے چیدہ حضرات موجود تھے۔ وہاں بھی مختلف صحبتیں مذہبی اور سیاسی منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ خاص کر مولوی نور الدین لائل پوری تو ہر وقت ہی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ جیل خانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ اپر کلاس کے قیدیوں کو مشقتی دیئے جاتے تھے۔ یہ مشقتی اخلاقی قیدیوں میں سے ہوا کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب قبلہ ان قیدیوں سے کام لینا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ لوگ بھی ہماری طرح کے قیدی ہیں۔ ان سے ہم خدمت کس طرح لے سکتے ہیں۔ اول تو مفتی صاحب اپنا ہر ایک کام اپنے ہی ہاتھ سے کیا کرتے تھے۔ اس پر یہ بات کہ ہم بھی قیدی ہیں اور وہ بھی قیدی ہیں۔ ہم بحیثیت ایک قیدی کے دوسرے قیدی سے ظلماً کس طرح خدمت لے سکتے ہیں۔ اس وجہ سے اور بھی مشقتیوں سے کوئی خدمت نہ لیتے تھے۔ چار مہینے کے بعد مسٹر آصف علی اور میں رہا ہو گئے۔ ہم لوگ دہلی چلے آئے اور ایک ماہ کے بعد حضرت مفتی صاحب قبلہ رہا ہو کر دہلی تشریف لے آئے۔

تیسری مرتبہ ملتان جیل میں

تیسری مرتبہ ملتان جیل میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ ملتان جیل میں پہلے مجھے پہنچنے کا اتفاق ہوا۔ حضرت مفتی صاحب قبلہ مجھ سے تقریباً بیس یوم کے بعد تشریف لائے۔ یہاں دہلی اور پنجاب کے بہت سے حضرات جمع تھے۔ مولانا داؤد صاحب غزنوی۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب نکودری۔ مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ چودھری افضل حق۔ مولانا احمد علی صاحب لاہوری لالہ دیش بندھو۔ لالہ شام ناتھ۔ لالہ اونکار ناتھ۔ مکند لال۔ چودھری شیر جنگ۔ مہاشہ اندر۔ مولانا عارف ہسوی۔ لالہ داؤدیال کے علاوہ اور بہت سے ہندو مسلمان تھے جن کے نام مجھے اب محفوظ نہیں۔

حضرت مفتی صاحب قبلہ کا شغل

حضرت مفتی صاحب قبلہ اپنی عادت کے موافق کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے تھے۔ کچھ وقت لالہ دیش بندھو آنجہانی کو فارسی پڑھاتے تھے۔ میں نے مفتی صاحب سے سراجی اور دیوان حماسہ جیل ہی میں پڑھا اور جب ملتان جیل میں مشاعرہ کا دور شروع ہوا تو مفتی صاحب قبلہ اکثر غزلوں کی اصلاح کیا کرتے تھے۔

قیدیوں کے پھٹے ہوئے کپڑے

عام طور سے مفتی صاحب ہی سیا کرتے تھے۔ جو قیدی آیا اس کا

کرتہ یا پاجامہ پھٹا ہوا دیکھا اور اس سے فرمایا لاؤ تمھارا کرتہ درست کردوں۔ جو شخص جیل سے رہا ہو کر جاتا اس کے لیے قصیدہ لکھا جاتا۔ اور حضرت مفتی صاحب قبلہ کی اصلاح کے بعد اس کو پڑھ کر سنایا جاتا۔ یہ پھٹے ہوئے کپڑوں کا سینا صرف سیاسی قیدیوں کے ساتھ مخصوص نہ تھا، بلکہ اخلاقی قیدیوں کے کپڑے بھی سیا کرتے تھے۔ اخلاقی قیدیوں میں سے اگر کسی کا کرتا یا پاجامہ پھٹ جاتا تھا تو وہ سیدھا حضرت مفتی صاحب کی کوٹھری میں پہنچ جاتا تھا۔ حضرت مفتی صاحب کا یہی مشغلہ رہتا تھا۔ گرمی وہاں بہت سخت ہوتی تھی مفتی صاحب بیمار بھی رہتے تھے۔ ایک دن شام کو غسل فرمانے کے لیے پانی گرم کیا۔ کوٹھری کے دوسرے درجہ میں کمبل پڑا ہوا تھا۔ آپ نہانے کے لیے تشریف لے گئے۔ کوئلہ کے دھوئیں کا اثر ہو گیا۔ کسی کو خبر نہیں۔ اندر سے نیم بے ہوشی کی حالت میں نکلے۔ کپڑے تو بدل لیے لیکن حواس صحیح نہ رہے۔ برابر کی کوٹھری والے نے اگر بتایا۔ ہم سب لوگ پہنچے۔ چودھری افضل حق مرحوم نے تشخیص کی کہ کوئلہ کے گیس کا اثر ہے۔ میجر فضل الدین صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل کو بلایا گیا۔ انھوں نے دوا تجویز کی اور رات کو بارہ بجے مفتی صاحب قبلہ کی طبیعت درست ہوئی۔ مفتی صاحب قبلہ کو ڈیڑھ سال کی قید مسٹر ینگ کی عدالت سے ہوئی تھی۔ میں تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل رہا ہو گیا تھا۔ میری روانگی کے وقت مفتی صاحب قبلہ نے میرے لیے چند اشعار لکھے تھے۔ جواب میرے پاس محفوظ نہیں۔ ایک رمضان بھی ہم کو جیل میں نصیب ہوا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی نے بہت خدمت انجام دی۔ مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی نے تراویح پڑھائی اور کئی قرآن شریف ختم کیے۔ بالآخر تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد اپریل ۳۳ء میں مفتی صاحب ملتان جیل سے رہا ہو کر دہلی پہنچے۔ یہ چند سطریں میں نے مولانا سید محمد میاں صاحب کے ایماء پر لکھ دیں۔ ورنہ حضرت مفتی صاحب قبلہ کی حیات طیبہ کے لیے دفاتر بھی ناکافی ہیں۔ اللھم اغفرلہٗ وارحمہٗ ☐☐

قطعات تاریخ وفات

از جناب مقبول صاحب سیوہاروی

صد دریغا کہ مفتیٔ اعظم — رفت و بگذاشت نقش فضل و کمال
ہاتف غیب حسب حالش گفت — وارث الخلد ہست سال وصال
۲ ۷ ۳ ۱ ۵

از جناب معراج صاحب دھولپوری

شد برائے سیر جنت قبلۂ ہستیٔ دل — مبتلائے درد بیحد گشت چوں بزم جہاں
رحلتش را عیسوی سن گفت معراج حزیں — خلد منزل پاک باطن مفتیٔ ہندوستاں
۱۹۵۳ء

دار العلوم دیوبند اور مفتی اعظم رحؒ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے خاتمے کے ۹ سال بعد ۳۰ رمئی ۱۸۶۶ء کو مجاہدین ۱۸۵۷ء نے دیو بند میں انار کے درخت کے نیچے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی جس کے بانیوں میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ شامل تھے۔ یہ ادارہ اب ایک عظیم الشان اسلامی یونیورسٹی کی شکل میں دین کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

حضرت مفتی اعظم دار العلوم دیو بند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے اور اکثر و بیشتر مجالس شوریٰ کی صدارت آپ ہی فرماتے رہے۔ دار العلوم دیو بند نے ملک کی آزادی کرانے میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ جیسے مجاہدین آزادی اس ادارے سے وابستہ رہے۔

۱۹۱۷ء میں برطانوی وزیر ہند لارڈ مانٹیگو ہندوستان آئے۔ اس موقع پر مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ نے مسلمانوں کے قومی و مذہبی اغراض کی حفاظت کے لیے ایک پمفلٹ میں حکومت سے خود اختیاری کا مطالبہ کیا۔

۱۹۱۸ء میں مفتی اعظم نے رولٹ ایکٹ کے نفاذ اور تحریک شیخ الہند کے قائدین کی گرفتاری اور جلاوطنی کے بعد انجمن اعانت نظر بندان اسلام قائم فرمائی جس کے سرپرست مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم تھے۔

اور حضرت مفتی صاحب ۱۳۵۵ھ سے ۱۳۷۲ھ تک شوریٰ کے رکن رہے۔ (تاریخ دار العلوم دیو بند، ج ۲، ص ۸۰، بیس بڑے مسلمان، ص ۴۴۲)

حضرت قاری محمد طیبؒ لکھتے ہیں کہ:

حضرت مفتی صاحب مرکز علوم دینیہ دار العلوم دیو بند کی انتظامی کونسل (مجلس شوریٰ) کے رکن رکین تھے، اور اکثر و بیشتر آپ کی موجودگی میں مجالس شوریٰ کی صدارت آپ ہی کے لیے مخصوص رہتی تھی۔ گویا آپ علمی، دینی، سیاسی اور انتظامی مجالس کے ایک بنے بنائے صدر تھے کہ صدارت آپ سے اور آپ صدارت سے متجاوز نہ ہوتے تھے۔ اس کا منشا حضرت ممدوح کی عظمت کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ مجلس تجاویز کے بنانے میں آپ کی قابلیت ممتاز اور مسلمہ تھی۔ ماقل و دل الفاظ کے ساتھ ایسی جامع تجویز لکھتے تھے کہ واقعات کا خلاصہ، مباحث کا نچوڑ، اور منشا مجوزین کا نحوی پورا کا پورا اس میں سمایا ہوتا تھا۔ بہت سی ایسی معاملاتی پیچیدگیاں جو بظاہر لاینحل نظر آتی تھیں ان کے اعتدال مزاج اور علمی استحضار کی بدولت بآسانی حل ہو جاتی تھیں، رائے فیصلہ کن دیتے تھے۔ (الجمعیۃ مفتی اعظم نمبر، ص ۱۶)

حضرت قاری محمد طیب کے دور اہتمام میں ۱۹۵۱ء میں حضرت مفتی صاحب کی معیت میں مولانا ابوالکلام آزاد دار العلوم دیو بند تشریف لے گئے تھے اور مولانا آزاد نے دار العلوم دیو بند کی سیاحت فرمائی۔ (الجمعیۃ آزاد نمبر، ص ۱۱۳)

حضرت مفتی صاحب کی وفات پر دار العلوم دیو بند کی مجلس شوریٰ کے اراکین نے ان الفاظ میں تاثرات کا اظہار کیا:

"حضرت مفتی صاحب اپنے علم و فضل، تقویٰ و طہارت اور اخلاق و کمالات کے لحاظ سے طبقۂ علماء کی ایک بے نظیر شخصیت تھے۔ آپ دار العلوم دیو بند کے ایک ممتاز فاضل اور اس کی مجلس شوریٰ کے ایک فہیم اور مدبر رکن تھے۔

ان کی وفات ملت اسلامیہ نیز دار العلوم کے حلقوں کا ایک ایسا خلا ہے جو بظاہر اسباب جلد بھرنے والا نہیں ہے۔ وہ وقت کے ان چیدہ اور منتخب روزگار علماء میں سے تھے جو بیک وقت عالم و فاضل، فقیہ و محدث، ادیب، و شاعر، ناظم و ناشر، تقی و نقی، غیور و مجاہد اور اس کے ساتھ ذکاوت و فطانت میں بے مثل تھے۔ ان کی شخصیت نہ صرف معاصرین میں بلکہ اساتذہ و اکابرین میں قابل اعتماد اور لائق بھروسہ تھی۔ سب ہی ان کے علم و فضل، اعتدال مزاج اور رعایت حدود کے قائل تھے۔

مرسلہ، محمد عارف صدیقی دیوبند

جمعیۃ علماء ہند کا بانی اور اس کا معمار

رئیس الاحرار جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی

پہلی جنگ عظیم میں ہندوستان کے تمام مقتدر مسلمان رہنما نظر بند کر دیئے گئے تھے اور حضرت مولانا شیخ الہند محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی اور آپ کے رفقاء کار حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، حضرت مولانا عزیر گل صاحب، مولانا حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم، مولانا وحید احمد صاحب مرحوم کو مکہ معظمہ سے گرفتار کر کے مالٹا پہنچا دیا گیا۔ اور آپ کے جو ساتھی ہندوستان میں تھے وہ تقریباً سب کے سب ہندوستان میں نظر بند کر دیئے گئے۔ مولانا محمد علی مرحوم، مولانا شوکت علی مرحوم اور مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کو بھی حکومت ہند نے گرفتار کر کے ہندوستان کے مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا تھا۔ حکومت کی اس متشددانہ پالیسی کے باوجود جن حضرات نے حوصلہ اور پامردی کے ساتھ ملک کی رہنمائی کی ان میں سب سے پہلے مفتی اعظم محمد کفایت اللہ صاحب مرحوم اور آپ کے ساتھیوں میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم، حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور حضرت مولانا عبدالباری صاحب مرحوم فرنگی محلی کے اسمائے گرامی ہندوستان کی تاریخ سیاست کے صفحۂ اول پر نظر آتے ہیں۔ برطانوی استعمار کے خلاف نظر بندوں کی رہائی کے مطالبہ کے عنوان پر تحریک کو منظم طریقہ سے چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ ہندوستان میں جو لوگ تھے انھوں نے اس تحریک کو چلایا۔ اس وقت حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم کے ذہن میں جمعیۃ علماء ہند کے بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ اگر چہ اس سے پہلے مولانا عبدالباری صاحب مرحوم نے "علماء ہند" کے نام سے ایک جماعت کے بنائے جانے کے خیال کا اظہار کیا تھا۔ لیکن وہ اپنی کثیر مصروفیتوں کی وجہ سے اس طرف دھیان نہ دے سکے۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم نے "جمعیۃ علماء ہند" کی داغ بیل ۱۹۱۹ء میں دہلی میں ڈالی اس کے قیام اور انتظام و انصرام میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب حضرت مفتی صاحب مرحوم کے شریک تھے۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب کی دعوت پر ہندوستان کے تمام صوبوں سے چیدہ چیدہ علماء دہلی تشریف، لائے تھے۔ میں خود اس بنیادی اجلاس میں شریک نہیں ہو سکا۔ لیکن لدھیانہ سے میرے حقیقی پھوپی زاد بھائی مولانا محمد عبداللہ اور مولوی حفیظ اللہ صاحب نے شرکت کی۔ لکھنؤ سے حضرت مولانا عبدالباری صاحب مرحوم تشریف لائے ہوئے تھے۔ علماء کے اس نمائندہ اجلاس نے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کو "جمعیۃ علماء ہند" کا صدر منتخب کیا۔ اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب کو ناظم اعلیٰ بنایا گیا۔

اس سے کچھ عرصہ پہلے "خلافت کمیٹی" کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ اس کے بنانے میں بھی حضرت مفتی صاحب کا بہت بڑا حصہ تھا۔ اس میں حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم ڈاکٹر انصاری مرحوم، مولانا حسرتؔ موہانی مرحوم۔ مولانا عارف ہسوی سب حضرت مفتی صاحب کے شریک کار تھے۔ ان ہی دنوں گاندھی جی نے کانگریس کے کام کی ابتداء کر دی۔ اس کام میں گاندھی جی کے سب سے زیادہ مشیر حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تھے۔ ان دنوں علی برادران اور مولانا آزاد جیلوں میں تھے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ کام کی اہمیت نے اور اخبارات نے مفتی صاحب کے نام کا تعارف ملک میں کرا دیا۔ اہل علم وہ مسلم تھے یا غیر مسلم، مفتی صاحب کے علم و دانش کے قائل ہو گئے تھے۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اس وقت ہندوستان کے تمام سیاسی نظر بند رہا کر دیئے گئے تھے لیکن شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھیوں کو رہا نہیں کیا گیا۔ اور یہ

بدستور مالٹا میں نظر بند رہے۔ ہندوستان کے تمام رہا شدہ رہنما کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے امرتسر پہنچ گئے۔ اس وقت مسلم لیگ کانگریس کا ایک حصہ سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ مسلم لیگ کا اجلاس بھی کانگریس کے اجلاس کے ساتھ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کی صدارت میں بہت شان و شوکت سے ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد رہائی کے بعد امرتسر تشریف نہیں لائے۔ اس لیے کہ رہائی ایسے وقت میں ہوئی جب کہ آپ امرتسر پہنچ کر اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ البتہ علی برادران نظر بندی سے رہا ہوتے ہی سیدھے امرتسر پہنچے اور وہیں گاندھی جی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اسی زمانہ میں جمعیۃ علماء ہند کی دوسری نشست ہوئی۔ جمعیۃ کی اس میٹنگ میں میں بھی شریک تھا۔ ستر اسی کے قریب ہندوستان کے مقتدر سرکردہ علماء شریک ہوئے۔ یہ میٹنگ امرتسر کے ایک بہت بڑے رئیس میاں محمد شریف مرحوم کی کوٹھی پر ہوئی۔ حضرت مفتی صاحب اور تمام علماء چونکہ طبعاً پروپیگنڈسٹ نہیں تھے۔ تصوف اور درویشی کا طبیعتوں پر اثر غالب تھا۔ اس لیے یہ حضرات اس وقت عوام میں نمایاں نہ ہو سکے اور نہ ہی نمایاں ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے عوامی لیڈر شپ امرتسر میں علی برادران کی طرف منتقل ہو گئی۔ اور خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس کانگریس کے پنڈال میں منعقد ہوا۔ مگر اس موقعہ پر جمعیۃ علماء ہند کا کھلا اجلاس امرتسر میں نہیں ہوا۔ لیکن جمعیۃ علماء کا آئین اور آئندہ طریق کار امرتسر میں ہی تیار ہوا جمعیۃ کا آئین اور طریق کار مرتب کرنا بہت مشکل مسئلہ تھا۔ مگر بقول مولانا عبدالباری مرحوم، اگر یہ کام مفتی کفایت اللہ صاحب کے سپرد کر دیا جائے تو یہ مسودہ چند گھنٹوں میں مفتی صاحب تیار کر دیں گے۔ چنانچہ مفتی صاحب نے چند گھنٹوں میں واقعی جمعیۃ علماء کے لیے ایک آئین اور آئندہ طریق کار کا مسودہ تیار کر کے علماء کے سامنے پیش کر دیا۔ اگرچہ یہ اجلاس مختصر تھا مگر فہم اور رہنمائی کے اعتبار سے بہت ہی اہم تھا۔ ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک مسلسل ۱۹ برس مفتی صاحب جمعیۃ کے صدر رہے۔ لیکن انیس برس میں آپ کبھی جمعیۃ کے اجلاس کے صدر نہیں بنے۔ بلکہ ہم صرف دوستوں کی صدارت میں کام کرنا ان کی طبیعت کا خاص وصف تھا۔

آپ آل انڈیا خلافت کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی کے ہمیشہ ممبر رہے۔ ورکنگ کمیٹی میں آپ نے بڑے بڑے اُلجھے ہوئے مسائل کو منٹوں میں حل کر دیا۔ آپ نے کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء میں رہ کر جن جن مسائل میں رہنمائی فرمائی اس کا اندازہ صرف ان ہی حضرات کو ہو سکتا ہے جو آپ کے ہر وقت کے ساتھی تھے۔ لیکن دنیا نے کبھی بھی مفتی صاحب کے نام کو ان کے کاموں کے ساتھ شہرت کی جگہ پر نہیں پایا۔ وہ مٹ کر کام کرنے کے عادی تھے۔

جمعیۃ علماء کا حقیقی وجود اور اس کی تعمیر مفتی صاحب کے ہاتھوں سے ہوئی۔ اور مولانا احمد سعید صاحب نے پورے اخلاص اور دیانتداری سے مفتی صاحب مرحوم کا ہمیشہ ساتھ دیا۔ مفتی صاحب اپنے ساتھیوں اور اچھے کام کرنے والوں کو آگے بڑھا کر خوش ہوتے تھے۔ بہت سے غلط کار آدمیوں کو محبت اور پیار سے سیدھے راستہ پر ڈال دیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ آپ اپنے وقت میں آفتاب سیاست تھے تو اس سچ میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ اور کون ہے جو اس کی شعاعوں کی روشنی میں ملک کی رہنمائی نہیں کر تا رہا۔ اور آج بھی سوائے چند ایک کے اس آفتاب سیاست کے غروب ہونے کے بعد صحیح راستہ کی تلاش میں دشواریاں محسوس نہیں کرتے۔

جہاں آپ کو فہم رسا کی وجہ سے سیاسیات میں غیر معمولی درجہ حاصل تھا۔ وہاں آپ کی شخصیت کو بحیثیت عالم دین ہونے کے نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ "علم دین" میں آپ کا درجہ کتنا بلند تھا اس کا اندازہ آپ کو حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان الفاظ سے بخوبی ہو جائے گا کہ جب کبھی حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی صاحب مرحوم کا ذکر کرتے تو ان کے لیے۔ "عالم الدین والدینا مفتی کفایت اللہ" فرمایا کرتے۔

تحریک خلافت میں حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم ڈاکٹر انصاری مرحوم اور گاندھی جی نے جیل جانے سے روک دیا تھا۔ لیکن ۱۹۳۰ء کی نمک سول نافرمانی میں مفتی صاحب بحیثیت کانگریس کی ورکنگ کمیٹی

کے ممبر جیل میں تشریف لے گئے۔ تقریباً چھ ماہ مجھے آپ کی خدمت کرنے کا موقعہ ملا۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ ۱۹۳۱ء میں آپ کو پھر ڈیڑھ سال کے لیے جیل میں بند کر دیا گیا۔ اور آپ کو دہلی جیل سے نیو سینٹرل جیل ملتان میں بھیج دیا گیا۔ چنانچہ اس مرتبہ مجھے ایک سال آپ کی خدمت میں رہنے کا موقعہ ملا۔ میری سزا ایک سال تھی۔ اور مجھے لاہور جیل سے ملتان جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ مجھے جس قدر آپ کا قرب حاصل ہوتا گیا۔ اتنی ہی آپ کی عقیدت، عزت اور محبت میرے دل میں گھر کرتی گئی۔ آپ اپنے ساتھیوں کے علاوہ جیل میں اخلاقی قیدیوں سے بھی ہمیشہ محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آتے۔ آپ جیل میں ان قیدیوں کی خدمت کرتے۔ اور ان کے کپڑوں کی مرمت کرتے۔ جو ان کو ان کی خدمت کے لیے ملے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے اس کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ یہ بھی ہماری طرح قید ہیں۔ ہمیں ان سے کام لینے کا حق نہیں یہ حکومت کا جبر و قہر ہے کہ ان کو اس طرح ہماری خدمت کے لیے معین کر رکھا ہے۔ اس کی تلافی اسی صورت سے ہو سکتی ہے کہ ہم بھی ان کی خدمت کریں۔ یہ ایک شرعی نکتہ تھا۔ اس کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ آپ کو کسی شخص کا کوئی کام کرنا بھی بوجھ نہیں معلوم ہوتا تھا۔

۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود کے پاس جمعیۃ علماء کی طرف سے ایک وفد بھیجا گیا۔ جس کے صدر حضرت مفتی صاحب مرحوم تھے۔ یہ وفد حج کے موقعہ پر گیا تھا۔ میں اس سفر میں بھی آپ کا ساتھی تھا۔ اس پورے سفر میں مفتی صاحب کی استقامت تقویٰ اور دیانت داری کا جو منظر میں نے دیکھا وہ حیرت انگیز تھا۔ ہم نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کے لیے اونٹوں پر سفر اختیار کیا۔ ہر منزل پر ساتھی تکان کی وجہ سے آرام کرتے یا سو جاتے۔ لیکن مفتی صاحب سب کے لیے کھانا پکانے اور تیار کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ اس تمام سفر میں کبھی آپ کی پیشانی پر کسی نے بھی بل آتے نہیں دیکھا۔ اور نہ ہی آپ کے مشاغل دینی اور معمولات میں کسی دن فرق آیا۔

علاوہ فقیہ ہونے کے فہم قرآن میں بھی آپ کا درجہ بہت بلند تھا۔ جب کبھی مشکل مقامات میں نے مفتی صاحب کے سامنے پیش کیے۔ اسے آپ نے فوراً حل فرمادیا۔ ملتان جیل میں آپ نے ترجمہ کی ابتداء کی۔ افسوس کہ یہ بات آگے نہ بڑھ سکی۔

حضرت مفتی صاحب کے یہ مختصر حالات میں نے بیماری کی حالت میں لکھوائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کو جنت الفردوس میں بلند مرتبے عطا فرمائے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مادۂ تاریخ

مقبول صاحب سیوہاروی

فقیہ الامّت مولانا کفایت اللہ	طغرائے عالم بود
۱۳۷۲ھ	۱۳۷۲ھ

از جناب محمد عمر خاں صاحب ثمرؔ چھتاروی، مدیر "جمہور" علی گڑھ

مفتیٔ اعظم کی رحلت آہ آہ! نائب ماہِ عجمؑ ماہِ عربؐ
سالِ رحلت کا ثمرؔ مصرعہ یہ ہے "مردِ مومن جنتی ہے پیشِ رب"

۱۹۵۲ء

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب امروہی شیخ الادب والحدیث دار العلوم دیوبند

ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ محررۂ بالا نام عوام تو بجائے خود خواص کے قلوب میں بھی بصد عظمت متمکن تھا۔ زبانوں کا یہ حال تھا کہ کوئی اس کے مسمّی کو جبل علوم کہتا تھا۔ کوئی حلاّل حوادث و فتاوا۔ اگر قومی مدارس کے طلبہ "زینت دہ مسند تدریس" کہتے تھے تو ملک و قوم کے ہمدردان کو قدوۂ اہل سیاست کہتے تھے۔ غرض یہ کہ جتنی زبانیں تھیں اتنی باتیں تھیں۔ آپ کے رعب کا صحیح نمونہ دیکھنا ہو تو اس وقت کا تصور کرو جبکہ صبح صادق طلوع ہو رہی تھی۔ کوچہ چیلان کی دیندار جماعت سوتے ہوؤں کو نماز فجر کے لیے بیدار کر رہی تھی کہ کثیر التعداد پولیس اپنے چھوٹے بڑے افسران سمیت آئی بیدار کرنے والی جماعت کو آواز نکالنے سے منع کیا اور پوری خموشی کے ساتھ اس مجسمۂ حریت کو گرفتار کر کے لے گئی اور اس طرح لے گئی کہ کوچہ چیلان کے بہت سے باشندے بھی اس وقت اس حادثۂ فاجعہ سے باخبر ہوئے جبکہ آپ دہلی جیل میں پہنچ چکے تھے۔

جن لوگوں نے یہ سماں اپنی نظروں سے دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس گرفتاری کے وقت پولیس کا ایک ایک فرد اس طرح سراسیمہ اور بدحواس تھا کہ پاؤں کی چاپ بم کے گولہ کی طرح گھبرا دینے کا کام کرتی تھی۔ شاید بہادر شاہ بھی دہلی سے اس پردہ داری کے ساتھ روانہ نہیں کیے گئے ہوں گے۔

مادی طاقتیں اجسام وابدان ہی پر حکومت کر سکتی ہیں۔ مگر روحانی طاقت اور انسانی کمالات سے قلوب پر حکومت کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ کی اس مغرور حکومت کو (جس کی نسبت کہا جاتا تھا کہ اس کی سلطنت میں آفتاب غروب ہوتا ہی نہیں ہے) بھی ڈر تھا کہ آپ کی گرفتاری بچوں کا کھیل نہیں ہے۔

انگریزی حساب سے ۱۹۵۲ء کے ختم ہونے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا کہ آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور ۱۹۵۳ء کے پہلے ہی دن میں تقریباً شام کے چار بجے ہم نے اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کر دیا۔ ۵۳ء کی آئندہ کارگذاری اسی سے ظاہر ہے:

سالے کہ نکوست از بہارش پیدا

میرے الفاظ سے آپ کو غلط فہمی نہ ہو کہ آپ یہ سمجھ لیں کہ اعزاز علی بھی آپ کے مرقد کو مٹی سے بھرنے میں شریک تھا۔ میں تو ان بدنصیبوں میں ہوں کہ یکم جنوری کو حضرت مہتمم صاحب دار العلوم دیوبند کو تار کے ذریعہ سے نو بجے صبح کو اس سانحہ کی اطلاع ملی۔ آپ نے جہاں اور اپنے خدام کو بلا کر اس سے مطلع فرمایا۔ مجھ کو بھی بلا کر مطلع فرمایا۔ اور میں اس امر کا ہمیشہ شکر گذار رہوں گا کہ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ کار تیار ہے۔ ہمارے ساتھ چلو۔ میں اسی وقت آپ کی ہم رکابی میں روانہ ہوا۔ مگر راستہ میں اضطراری اور غیر اختیاری طریقہ پر گھنٹہ بھر سے زائد تاخیر ہوگئی۔ اور یہ کار اس وقت پہنچی کہ مسلمانوں کا ٹھاٹیں مارتا ہوا ہجوم نماز سے فارغ ہو چکا تھا۔ ہم سے کہا گیا کہ دہلی دروازہ جاؤ جنازہ وہاں ملے گا۔ ہم سب کو ظہر کی نماز پڑھنی تھی آگے چلے گئے پرانی دہلی میں مہرولی کی اس مسجد میں نماز ظہر پڑھی جس کے دروازے کے باہر اس وقت آپ کی آرام گاہ ہے۔

کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا کہ جنازہ آگیا۔ ہم سب باہر آئے۔ تو جہاں تک نظر کام کرتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ حضرت مہتمم صاحب اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی عمت فیوضہ تو کسی نہ کسی طرح قبر پر پہنچ گئے مگر میرے لیے کوئی امکان ہی نہ تھا، ہجوم میں کچل جانے کے ڈر سے میں تو پھر کار ہی میں بیٹھ گیا۔

اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں تو جنازہ کی زیارت

کر ہی نہ سکا۔ یکایک معلوم ہوا کہ قبر میں مٹی ڈالی جانی شروع کر دی گئی کہ کسی جلے ہوئے دل والے شخص نے نہایت مؤثر آواز میں کہا کہ:

مرتے مرتے بھی ہمیں مرنا سکھا کر چل دیئے

اس مصرع کو سن کر خیال آیا کہ دہلی کی زبان اور لہجہ دونوں اب بھی کسی حد تک باقی ہیں۔ صحیح یہی ہے کہ حضرت مفتی اعظم ہند کی موت نے اصحاب بصیرت کو سمجھادیا کہ:

یاد داری کہ وقت زادنِ تو
ہمہ خنداں بود و تو گریاں
آنچناں زی کہ بعد مردنِ تو
ہمہ گریاں بود و تو خنداں

پرعمل اس طرح ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ لوگوں کے پاس تسخیر کا عمل ہوتا ہے جس سے وہ قلوب کو مسخر کر لیتے ہیں۔ میں مستبعدات زمانہ کو دیکھ دیکھ کر اس درجہ پر پہنچ گیا ہوں کہ کسی چیز کو ناممکن کہنا دشوار ہو گیا اس لیے ممکن ہے کہ ایسے عمل ہوں۔ مگر تسخیر قلوب کا عمل اگر تیر بہدف ہے تو وہ "طرز زندگی" ہے جو اس مجسمۂ علم واخلاق کا تھا۔ اور یہ سبق تھا۔ جو "من کان لہٗ قلب او القی السمع وھو شھید" کے لیے تھا۔

پچاس برس یا اس سے کم زمانہ گذرا کہ میں بھاگلپور کے قصبہ پورینی میں ایک ابتدائی مدرسہ میں مدرس تھا۔ وہاں ایک کتاب میں (جس کا نام اس وقت یاد نہیں آتا ہے) دیکھا کہ سکندر اعظم کے مرنے پر اس کے درباری حکماء نے طے کیا کہ نعش کے ارد گرد کھڑا ہو کر ہر ایک شخص کوئی مختصر اور حکمت آمیز بات کہے۔ چنانچہ ہر ایک نے چھوٹے چھوٹے اور مختصر مختصر جملوں میں کلمات حکمت ادا کیے۔ اس کتاب میں ہر ایک کے قول اور اس کے قائل کی تعیین تھی۔ مجھ کو صرف ایک قول یاد رہا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ قائل کا نام بھی یاد نہیں۔ میرے نزدیک ان سب میں اچھا اور جامع حکم کلمہ یہی تھا کہ:

"انت میتاً اوعظ منک حیاً"

یعنی تم ہمیشہ ہم کو زمانہ کی اونچ نیچ سمجھایا کرتے تھے مگر مرکر دنیا کی بے ثباتی وغیرہ کا جو عملی نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کر دیا ہے یہ زندگی بھر کی تمام نصیحتوں سے بڑھ کر ہے۔

میرا خیال ہے کہ حضرت مفتی صاحب کی وفات نے بھی جو سبق دیا ہے وہ ان کے زمانۂ حیات کے تمام اسباق سے زیادہ مؤثر اور مفید ہے۔ حمیت اسلامی، عزم واستقلال، بے خوفی کے ساتھ اعلان کلمۃ الحق وغیرہ وغیرہ اوصاف آپ کے فطری اور خلقی تھے۔ یہ امر آخر ہے کہ دہلی جا کر یہ اوصاف نمایاں ہو گئے۔

میں آپؒ سے شاہجہاں پور میں سکندر نامہ پڑھتا تھا کہ معلوم ہوا کہ سبزی منڈی (شاہجہاں پور) میں عیسائیوں نے اسلام اور داعی اسلام کے خلاف کچھ کہنا شروع کر دیا ہے۔ اسی روز حضرت مفتی صاحب مجھ کو اور مولوی اکرام اللہ خاں مرحوم ندوی اڈیٹر "مکانفرنس گزٹ" (علی گڈھ) کو ساتھ لے کر مجمع میں جا گھسے۔ اور ان بد زبانوں پر اعتراضات شروع کر دیئے۔ اول تو وہ سمجھے کہ کوئی ناواقف بول رہا ہے مگر اعتراضات کی اہمیت نے اُن کو بتایا کہ معترض معمولی انسان نہیں ہے تو مناظرہ سے انکار کر کے سب نے گانا شروع کر دیا۔ حضرت مفتی صاحب نے تقریباً دس قدم کے فاصلہ پر کھڑے ہو کر اُن کے اعتراضوں کے جواب اور خود ان کے مسلمات سے اُن پر اعتراض کرنا شروع کر دیئے۔

عیسائیوں کے اسٹیج میں رہ کر میں ان کی تقریر کے نوٹ حضرت مفتی صاحب کو مہیا کرتا تھا۔ اور وہ ہاتھ کے ہاتھ جوابات دیتے تھے۔ غالباً یہ سلسلہ دو ہفتے جاری رہا۔ پھر ختم ہوا۔ اور اس طرح ختم ہوا کہ عیسائیوں کی تقریر میں بجز میرے (کہ میں یادداشت مرتب کرنے کی غرض سے وہاں موجود ہوتا تھا) کوئی ایک متنفس ان کے پاس نہ جاتا تھا!

اس سے غالباً دو ایک سال کے بعد امریکن مشن کے ایک مشہور مبلغ پادری جوالا پرشاد نے رمضان المبارک (اور وہ بھی شدید موسم گرما کے رمضان) میں جلسہ کا اعلان کیا۔ اور اشتہار میں شائع کیا کہ آریوں اور اہل اسلام کو بھی رفع شبہات کا موقع دیا جائے گا۔ یہ اجلاس مشن اسکول کے وسیع ہال میں ہوا۔ حضرت مفتی صاحب اور

حضرت مولانا عبدالکریم صاحب بنوی (مؤخرالذکر حضرت بھی غالباً دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں) ظہر کے بعد سے موجود تھے۔ پادری صاحب وقت معینہ سے دو گھنٹے بعد تشریف لائے۔ تقریر شروع کی۔ عشاء کا وقت آگیا۔ حضرت مفتی صاحب اور مولانا عبدالکریم صاحب کے ساتھ ہم نے ایک مسجد میں پانی کے ساتھ افطار کرلیا تھا۔ مگر اب بھوک زیادہ لگی۔ اُدھر یہ خیال کہ قرآن شریف تراویح میں پڑھنا ہے چلا آیا۔ مگر یہ دونوں حضرات وہاں شب کے بارہ بجے تک رہے۔

یہ جلسہ کس طرح ختم ہوا مجھ کو معلوم نہ ہوا لیکن صبح کو ہر کہ ومہ کی زبان پر یہ تھا کہ ان دونوں مولویوں نے اسلام کی لاج رکھ لی۔ خدا جانے یہ کہاں سے آگئے تھے (ان دونوں سے شاہجہاں پور کے عوام عموماً ناواقف تھے) میں بہادر گنج کے بازار میں پہنچا تو مسلمانوں کی ٹولیاں اسی کا تذکرہ کررہی تھیں کہ ایک شخص نے کہا کہ "مگر ان میں جو ایک دبلا پتلا سوکھا سا آدمی تھا۔ تم نے دیکھا وہ شیر کی طرح غراتا تھا اور اس کی ہر بات پر پادری صاحب کو پسینہ آجاتا تھا۔

اسی زمانہ میں شاہجہاں پور کے ایک تاجر چونہ حاجی عبدالقدیر اور حافظ سید علی اور حافظ مختار احمد کے ذریعہ سے "فتنۂ قادیانیت" نے ہاتھ پیر پھیلانے شروع کیے۔ مولوی محمد اکرام اللہ خاں مرحوم نے حضرت مفتی صاحبؒ ہی کے زیر سرپرستی اخبارات میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ جن کی شہرت جلد ہوگئی۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کو ناکافی سمجھ کر خود ایک رسالہ "البرہان" جاری کیا۔ وہ زمانہ تقریر کی آزادی کا زمانہ نہ تھا۔ اس رسالہ کی بمشکل اجازت ملی۔ غالباً یہ رسالہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ آپؒ نے دہلی میں اقامت طے نہ فرمائی۔

ان کے خصائص میں تھا کہ "دوسروں سے خدمت نہ لو بلکہ ان کی خدمت کرو اور اپنی خدمت خود کرو۔" چنانچہ جب آپؒ ملتان جیل سے واپس آئے تو اس وقت بچہ بچہ آپ کی عظمت سے واقف ہو چکا تھا۔ میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ آپ بازار سے دودھ خرید کر دیگچی ہاتھ میں لیے ہوئے جارہے ہیں۔ میں نے لپک کر دیگچی ہاتھ میں لینی چاہی تو پیچھے پھر کر مجھ کو دیکھا۔ اور دیگچی ہاتھ میں دے دی۔ میں نے عرض کیا کہ گھر میں اور کوئی نہ تھا جو اس خدمت کو انجام دیتا۔ تو فرمایا کہ:

"سب سے بڑا متکبر وہ ہے جو اپنی خدمت کو اپنے لیے عار سمجھے۔"

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن ہونے سے پہلے آپؒ دیوبند تشریف لائے تو ایسا اتفاق بھی ہوا کہ آپ نے رات میرے حجرے ہی میں گذاری۔ عشا کے بعد آرام فرمایا تو میں نے پیر دبانا شروع کردیئے۔ پیر پھیلا دیئے۔ اور ایک دفعہ بھی تو نہ فرمایا کہ پیر نہ دباؤ۔ جوتے سیدھے کیے تو یہ نہ فرمایا کہ نہ کرو۔ مجمع میں تو بے شک مولانا اعزاز علی یا مولانا کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ مگر تنہائی میں اعزاز علی یا زیادہ سے زیادہ مولوی اعزاز علی فرمایا کرتے تھے۔ میرے لیے اب کوئی ایسا نہ رہا کہ شفقت آمیز لہجہ میں اعزاز علی یا مولوی اعزاز علی کہے:

ہائے استاذ ہمارا نہ رہا
ہم غریبوں کا سہارا نہ رہا

جس زمانہ میں آپ ملتان جیل میں "طلب حریت" کے جرم میں محبوس تھے۔ میں نے عریضہ لکھا۔ مگر کچھ تاخیر کے ساتھ۔ تو جواب میں چند شعر تحریر فرمائے جن میں سے ایک شعر یہ بھی تھا:

نسیتم اخاً اذ خانه الدهر لم یکن
بعرضة نسیان وکان مصافیا

حضرت کے اس حبس بے جا سے تکلیف ضرور تھی۔ مگر قلب خزینۂ احزان نہ تھا۔ اس لیے میں نے بھی فوراً اسی بحر و قافیہ پر ۷۵ اشعار کا ایک طویل قصیدہ لکھا۔ اور حضرت کی خدمت میں بھیج دیا جس کا ایک اقتباس یہ ہے:

لطرتُ الی ملتانَ لوکنتُ طائراً
ولـکن قضاءَ اللّٰهِ قصَّ جـناحیا
بعینی دُموعٌ کالدماء تتابعت
وَأستاذنا العلاّم ینشدُ شاکیا

نسيتُم أخاً إذ خانه الدهر لم يكن
بعرضةِ نسيانٍ وكان مصافيا
فقلتُ مجيباً يا رجاءَ قلوبنا
رجاءُ جميع الخلق دُونَ رجائيا
انسى الذى لولا محياه وجهتى
لما كنت ادرى ما الحذاقة ماهيا
آ انسىٰ الذى لولا اهتديتُ بهديه
لما كان لى وقتٌ منَ العمرِ صافيا
آ انساكم ، فى الاسرِ و القلبُ فى شجىً
تناهى ولكن لا اخالُ التناهيا
آ انسىٰ الذى انقادتْ اَزِمّةُ طاعتى
لمرضاته اِذ لم يزلْ بى واقيا
آ انسىٰ الذى اسقت غيوث كمالِهٖ
رياضَ العلومِ الرائقات الخواليا
آ آنسىٰ الذى اسقى الانامَ جميعهم
كؤوساً منَ التقوىٰ مبورِكت ساقيا
آ انسىٰ وحيد العصرِ علماً وَ حِكمةً
وَ فى ذكرهِ الميمونِ كانَ شفائياً
اَضاءَ بسيطَ الارضِ كالشمس فى الضحىٰ
ولازال حرّاً آمراً ثمَّ ناهيا
وما ضرّه سجنٌ وغيظ عدوّه
لانّ له صيتاً على الدهر باقيا

آخر شعر یہ ہے

سقاك اله العالمين بفضله
شراب رضاءٍ منه عذباً صافيا

آپ نے اس قصیدہ کو پڑھ کر ہمت افزائی کے طور پر الفاظ تحسین فرمائے۔ اور اس کے ساتھ نفس مضمون کے متعلق جو خیال ظاہر فرمایا وہ میرے زاویۂ خیال سے سہیل و ثریا کے برابر بلند تھا۔
یہ اور اسی قسم کی چند تحریریں میرے پاس ہیں جو خدا ہی جانے کہ کہاں رکھی گئی ہیں۔ میں نے ان کو ڈھونڈھنا شروع کر دیا ہے اگر کسی صاحب عزم صمیم نے حضرت مفتی صاحبؒ کی سوانح کی طباعت کا ارادہ کیا تو عرض کروں گا کہ ان تحریروں کا فوٹو شائع کر دیا جائے۔

آپ کی وفات کے بعد اہل علم حضرات نے جودت طبع سے کام لیا۔ قطعات، قصائد کہے۔ تاریخیں نکالیں جو شائع ہوئیں اور اب تک شائع ہوتی ہیں۔ مگر میں اپنی اس کوتاہی کا معترف ہوں کہ ایک شعر بھی نہ لکھ سکا اور یہ نہیں کہ میں نے توجہ نہیں کی۔ فکر کو کام میں نہیں لایا۔ یہ سب کچھ کیا، بمشکل چار شعر غیر مرتب لکھے آخر مجبور ہو کر ارادہ ہی ترک کر دیا۔ اس کا قوی سبب تو غالباً یہی ہو کہ ایک مدت سے ادبی کتب اور اعزاز علی میں بون بعید ہو گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا سبب یہ بھی ہے کہ "کس سے اصلاح لینے کو جائیں" حضرت مفتی صاحبؒ کے سانحۂ ارتحال کا زیادہ قلق ان حضرات کو ہوگا جو نظر بظاہر اسباب دنیا میں کچھ زیادہ دنوں تک رہیں گے۔ ہم جیسوں کے لیے یہ خیال موجب تسلی ہے:

آج وہ کل ہماری باری ہے

(از مرقومات معراج دھولپوری)

پردۂ رحمت کشیدہ آں فقیہ بے بدل
چون نہفتہ از نگاہِ طالب دیدار شد
در تلاشِ سالِ ہجری خاطرم معراج بُود
گفت ہاتف رہ نوردِ عالمِ اسرار شد
۱۳۷۲ھ

حضرت مفتی اعظمؒ کے چند فتاوی

از مولانا غلام حسین مہتمم مدرسہ اصلاح المومنین چمپا نگر، بھاگلپور

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ فتاویٰ نویسی میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ برجستہ جواب تحریر کرنا آپ کی عادت ثانیہ تھی۔ راستہ چلتے اگر کوئی فتویٰ معلوم کرنے آجاتا تو آپ کسی مناسب جگہ بیٹھ کر اس کا جواب مرحمت فرما دیتے۔ فتاویٰ میں اصابت رائے آپ کا طرۂ امتیاز تھا اور یہی وجہ تھی کہ آپ کے اساتذہ بالخصوص شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی سے کوئی شخص فتویٰ طلب کرتا تو آپ اسے مفتی صاحب کی خدمت میں بھیج دیا کرتے تھے۔ جس وقت حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں ترک موالات کے سلسلہ میں ایک فتویٰ آیا تو اس کا جواب مرتب کرنے کے لیے جن تین حضرات کو آپ نے منتخب کیا حضرت مفتی اعظمؒ کا نام ان میں سرفہرست تھا۔ آپ کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ کا فتویٰ ہمیشہ مختصر اور جامع ہوتا تھا۔ دوسرے مفتیان کرام جس بات کو صفحات میں لکھ کر دیتے تھے حضرت مفتی اعظمؒ اسے چند لائنوں میں رقم فرمادیا کرتے تھے۔ ذیل میں اس کے چند نمونے پیش کیے جارہے ہیں۔ یہ سوالات خود راقم نے بھیجے تھے جن کے مختصر اور شافی جوابات خود حضرت مفتی صاحبؒ کے تحریر کردہ ہیں۔

سنیما کے متعلق

سوال: عام طور پر مسلمان سنیما بینی کو معمولی گناہ سمجھتے ہیں۔ آیا یہ مکروہ ہے یا حرام؟

الجواب: سنیما دیکھنا حرام ہے۔ اس میں غیر محرم عورتوں کی نیم برہنہ تصاویر کا مظاہرہ اور بولتا ہوا ہو ان کا گانا ہوتا ہے۔ نیز اخلاقیات میں خلاف شریعت بہت سے افعال واعمال کی تمثیل ہوتی ہے جو اخلاق اسلامی پر بے حد مضر اثر ڈالتی ہے اس لیے مجموعہ منہیات بن جاتا ہے۔ پھر اسراف سب پر مستزاد ہے۔

عورتوں کے لیے جوتا استعمال کرنے کے متعلق

سوال: عورتوں کے لیے جوتا پہننا جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب: مردوں کی مشابہت مکروہ ہے اگر جوتا پہننے کا عورتوں میں عام رواج ہو گیا تو مباح ہے۔

صدقۃ الفطر کے متعلق

سوال: صدقۃ الفطر کے اندر کنٹرول کے حساب سے گیہوں کی قیمت دی جائے گی یا بلیک مارکیٹ کے حساب سے؟

الجواب: کنٹرول کے حساب سے گیہوں دینا جائز ہے اور بلیک مارکیٹ کے حساب سے دینا افضل ہے۔

شب قدر کے متعلق

سوال: شب قدر کے متعلق جو فضائل واحادیث سے ثابت ہیں وہ اس رات کی کسی ساعت کے ساتھ مخصوص ہیں یا پوری رات؟

الجواب: اس کی برکت تمام رات ہوتی ہے۔ کسی مخصوص ساعت کے لیے نہیں ہے۔

امامت کے متعلق

سوال: نماز کے لیے امام منتخب کرنے کی کیا صورت ہے۔ علماء کی جماعت امام منتخب کر کے مقتدیوں کے سامنے اعلان کردے گی یا عام مقتدی منتخب کریں گے؟

الجواب: علماء سے انتخاب کرایا جائے تو بہتر ہے۔ مقتدی خود افضل کو منتخب کرلیں یہ بھی جائز ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ، دہلی

امام العلماء حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ

حضرت مولانا احمد علی صاحب، امیر انجمن خدام الدین، دروازہ شیرانولہ، لاہور

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تمام اُن صفات حمیدہ سے متصف فرمایا تھا۔ جو ایک عالم ربانی میں ہونی چاہئیں۔ آپ کی علمی قابلیت ہندوستان بھر میں مسلمہ تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ ہندوستان کے مفتی اعظم سمجھے جاتے تھے۔ میں اپنی معلومات کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ مفتی صاحب کے جواب استفتاء معلوم ہونے کے بعد کسی بڑے سے بڑے جیّد عالم کو بھی اُس کے خلاف کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ حضرت مفتی صاحبؒ کی معلومات کی وسعت ہر عالم کے ہاں مسلّم تھی۔ اسی لیے ہر عالم کو اُن کے فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم ہی کرنا پڑتا تھا۔

علمی صدقہ جاریہ

آپ نے عمر بھر درس و تدریس کے ذریعہ جو کتاب و سنت کی خدمت کی ہے۔ اُس سے سینکڑوں علماء دین کی خدمت کے لیے تیار ہوئے ہیں۔ ان فیض یافتہ علماء کرام کی دینی خدمات حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا صدقہ جاریہ ہیں۔ جن کی برکت سے بعد از وصال بھی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درجات عالیہ قرب الٰہی میں اضعافاً مضاعفہ ہوتے رہیں گے۔

ذکر خیر

اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کو ایک یہ انعام بھی عطا فرمایا کرتے ہیں کہ آئندہ آنے والی نسلیں ان کا ذکر خیر کرتی رہیں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے اس شرف سے بھی مشرف فرمایا ہے ان کے تلامذہ کا سلسلہ انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک جاری رہے گا اور اُن کے متوسلین فخریہ طور پر اپنی نسبت ان کی طرف کرتے رہیں گے۔

اخلاق حمیدہ

انسان کے اخلاق کا صحیح معیار اس وقت معلوم ہوتا ہے۔ جب مصائب میں مبتلا ہو۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر آدمی مصائب میں اپنا اخلاقی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں نیو سینٹرل جیل ملتان میں کچھ وقت ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ آپ کے اخلاق حمیدہ کا منظر جو جیل میں دیکھا وہ جیل سے باہر دیکھنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اے کلاس میں تھے۔ اور آپ کی قید بامشقت تھی۔ اے کلاس کا قیدی باہر سے ہر چیز منگوا سکتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جو خدام قیدیوں میں سے ملے ہوئے تھے۔ مثلاً حجام دھوبی کھانا پکانے والے بھنگی وغیرہ وغیرہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہفتہ عشرہ بعد باہر سے اپنی جیب سے تین چار سیر گوشت منگواتے تھے اور گھی وغیرہ ڈال کر بہت اچھی طرح پکواتے تھے اس کے بعد وہ سارا گوشت مذکورۃ الصدر خادموں کو پیالے بھر بھر کر دے دیا کرتے تھے۔ جب خربوزوں کا موسم آیا تو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی جیب سے بیس پچیس سیر متعدد مرتبہ خربوزے منگواتے تھے۔ اور تمام احباب کو تحفۃً تقسیم فرما دیا کرتے تھے اس کے علاوہ گرمی کی شدت کے باعث پنکھوں کی ضرورت ہوتی تھی مفتی صاحب اپنی جیب سے پنکھے منگواتے تھے۔ اور احباب کو تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔

پان کا لنگر

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لیے دہلی سے اعلیٰ درجہ کے پانوں کے ٹوکرے آیا کرتے تھے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جیل کی کوٹھری ایک لنگر خانہ تھی مسلمان ہندو سکھ عیسائی حتیٰ کہ بھنگی بھی حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں پان کے لیے سائل ہو کر آتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہایت خندہ پیشانی سے ہر ایک کو پان دے دیا کرتے تھے۔

ایک "عجیب" واقعہ

نیو سینٹرل جیل ملتان میں فجر کی نماز کے بعد میں جیل خانے کی بالائی منزل پر ٹہل رہا تھا احرار کے کشمیر ایجی ٹیشن کا ایک قیدی جو بی کلاس میں تھا۔ ڈاڑھی منڈایا کرتا تھا۔ اور نماز نہیں پڑھا کرتا تھا۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ چارپائی پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے سر میں درد تھا اور مفتی صاحب چارپائی سے نیچے کھڑے ہوئے اس کا سر دبا رہے ہیں۔ امام العلماء اور ہندوستان کے مفتی اعظم کا یہ واقعہ میرے لیے حیران کن تھا اور آپ کے اخلاق عالیہ کا ایک بہترین نظارہ تھا۔

آپ کی شاعری

نیو سینٹرل جیل ملتان میں تقریباً ہفتہ میں ایک دن مجلس مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ اس مشاعرے میں ہندو مسلمان سب شریک ہوتے تھے حسن اتفاق کہ اکثر شاعر مسلمان ہوتے تھے ہندوؤں میں سے بہت آدمی اس مشاعرے میں حصہ لیا کرتے تھے۔ اس مشاعرے میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار بھی پڑھے جاتے تھے۔ اشعار تو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہوتے تھے۔ البتہ مجلس مشاعرہ میں آپ تشریف نہ لایا کرتے تھے۔ آپ کی طرف سے مخدوم العلماء والفضلا حضرت مولانا احمد سعید صاحب دامت برکاتہم سابق ناظم جمعیۃ العلماء ہند وہ اشعار مجلس مشاعرہ میں پڑھ کر حاضرین کو محظوظ فرمایا کرتے تھے۔

سیاست میں بلند پایہ

آپ جانتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد کی سیاست میں ہندوستان کے سیاستدانوں کا بہترین شغل ہوتا تھا۔ جو چیزیں دوسرے ہندوستان کی سیاست میں طے پاتی تھیں ان پر سخت ترین تنقید ہوتی تھی۔ لیکن حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہوتی تھی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دماغ ایسے گوشے نکال کر سامنے لاتا تھا کہ دوسرے ہندوستانی خالی دماغ سیاستدان بھی وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ حتیٰ کہ ہندوستان کے اعلیٰ درجہ کے سیاستدان بھی حضرت مفتی صاحب کی تنقید کے منتظر رہتے تھے کہ ان کی تنقید آئے تب اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

سادگی

بایں ہمہ کمالات عالیہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت ہی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لباس میں اپنی شان کے شایاں کوئی کروفر نہیں ہوتا تھا۔ رفتار اللہ تعالیٰ کے منکسر المزاج بندوں کی سی ہوتی تھی۔ گفتار میں کوئی متکبرانہ طرز نہیں ہوتا تھا۔

دعا

اللہ تعالیٰ امام العلماء حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جنت الفردوس کا مستحق بنائے اور ہمیں آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا الٰہ العالمین۔ □□

مدح صحابہ واجب ہے اگر.....

مفتی اعظم کا بیان

اگر کوئی مدح صحابہ کو جبر اروکے یا کسی جلسہ یا تقریر میں صحابہ کا ذکر نہ کرنے سے غیر مسلموں سے مشابہت ہونے کا اندیشہ ہو اور یا مدح صحابہ کے ذریعہ تبلیغ اسلام کی نیت ہو تو صحابہ کرام کی تعریف کرنا واجب ہو جاتا ہے..... جلوس کے ساتھ مدح صحابہ پڑھنا جائز ہے لیکن اگر اس کو روکا جائے گا تو یہ واجب ہو جائے گا تعزیہ نکالنا ناجائز ہے اور مکروہ و حرام بھی ہے کیوں کہ اسلام میں غم کی یادگار قائم کرنا ناجائز ہے.... صحابہ کی تعریف کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو صحابہ سے محبت کرے گا وہ مجھ سے محبت کرے گا اور جو ان سے عداوت کرے گا وہ مجھ سے عداوت کرے گا۔

سفر مصر کے چند مشاہدات

جناب مولانا عبد الحق صاحب مدنی مدیر جامعہ قاسمیہ، مدرسہ شاہی مراد آباد

آپ کا ارشاد ہے کہ میں حضرت مفتی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے متعلق کچھ لکھوں۔ میں متردد ہوں کہ کیا لکھوں۔ اگر میں مفتی صاحب کے مرتبہ کا ہوتا یا ان کے بلند مرتبہ کے کچھ قریب ہی ہوتا تو کچھ لکھ سکتا تھا۔ مگر یہاں تو کوئی نسبت ہی قائم نہیں ہوتی، لکھوں تو کیا لکھوں—— بہر حال چند واقعات عرض کر رہا ہوں۔ شاید اس طرح آپ کے ارشاد کی تعمیل ہو جائے۔

حضرت الحاج مولانا محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ سے میری پہلی ملاقات غالباً ۲۴ء میں ہوئی تھی۔ جب مراد آباد میں جمعیۃ علماء ہند کا مشہور اجلاس ہوا تھا اور میں مدینہ طیبہ سے نووارد تھا۔ کراچی میں مقیم تھا۔ شرکت اجلاس کے لیے کراچی سے مراد آباد آیا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے مجھے اجنبی صورت دیکھ کر لوگوں سے میرے متعلق دریافت فرمایا۔ اگلے روز احاطہ اجلاس سے باہر ایک خیمہ کے پاس میں کھڑا ہوا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا کہ حضرت مفتی صاحب ادھر سے گذرے۔ مجھے دیکھ کر بڑے تپاک سے معانقہ کیا۔ پھر مصافحہ کر کے خیریت دریافت فرمائی۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر خیمہ میں لے گئے۔ تقریباً پون گھنٹہ تک بڑی بے تکلفی، محبت اور ہمدردی سے اس طرح باتیں کرتے رہے جیسے کوئی بہت پرانا دوست، عرصہ کا بچھڑا ہوا ملا ہو۔ میں حیران تھا کہ ایک عجیب غریب الوطن پر یہ شفقت؟ حضرت مفتی صاحب کی اس غریب نوازی اور شفقت نے میرے دل کو عظمت و احترام سے بھر دیا۔ آپ کی اس مخلصانہ شفقت کا غیر فانی نقش میرے دل و دماغ سے کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ یہ پہلی ملاقات تھی اس کے بعد بارہا ملاقات و زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ لیکن ہر دفعہ کی تازہ شفقت و نوازش پہلے نقش کو ابھارتی اور مستحکم سے مستحکم تر کرتی رہی۔

مؤتمر قاہرہ

حسنِ اتفاق! مجھے ایک طویل رفاقت کا موقعہ ملا۔ یہ سفر مصر کی رفاقت تھی۔ جب قاہرہ میں ایک اسلامی کانفرنس کی گئی تھی۔ اور اس میں شرکت کے لیے جمعیۃ علماء ہند کے نمائندے طلب کیے گئے تھے۔ مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے حضرت صدر یعنی حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو منتخب کیا اور رفاقت اور دوسرے فائدے کی حیثیت سے "قرعہ فال بنام من بے چارہ زدند"۔

اس حسن اتفاق کے ساتھ سوءِ اتفاق یہ تھا کہ جیسے ہی بحری جہاز پر سوار ہو کر ممبئی سے روانہ ہوئے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر ملیریا کا حملہ ہو گیا۔ اور تیسرے روز ملیریا میعادی بخار میں تبدیل ہو گیا۔ بخار شدید تھا۔ اور ہر وقت غفلت رہتی تھی۔ ایک بزرگ شخصیت کی خدمت کا موقعہ تو ملا۔ مگر جاتے وقت علمی فیوض و برکات سے استفادہ کا موقعہ نہیں مل سکا۔

میں ایک عجیب و غریب تماشہ دیکھا کرتا تھا اور حیران رہتا تھا۔ وہ تماشہ یہ کہ بخار کی شدید غفلت میں قلب مبارک یادِ خدا سے غافل نہیں تھا۔ چنانچہ جیسے ہی نماز کا وقت آتا خود ہوشیار ہوتے اور تیمم کر کے نماز ادا کرتے اور پھر اسی طرح دنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتے۔

جب پورٹ سعید کے قریب جہاز پہنچا۔ میں نے اطلاع دی۔ فوراً ہوشیار ہو کر اُٹھے۔ بکس میں سے کپڑے اور شیروانی نکلوا کر زیب تن کئے اور تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ ایک جماعت استقبال کے لیے آئی تھی۔ آپ نے ہر ایک سے ملاقات اور گفتگو کی اور پھر بلا کسی سہارے کے اپنی چھتری لے کر جہاز سے بندرگاہ پر اُتر آئے۔ چند گھنٹہ کے لیے ایک ہوٹل میں قیام کا انتظام کیا گیا۔ جیسے ہی آپ قیام گاہ پر پہنچے۔ اسی طرح غفلت طاری ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے معائنہ کیا۔ ٹائیفائڈ تجویز کیا۔ شام تک بہت تکلیف رہی۔

پورٹ سعید سے قاہرہ تک ٹرین سے جانا ہوتا ہے۔ شام کے

وقت ٹرین جاتی تھی۔ جب گاڑی کا وقت آیا پھر اسی طرح تیار ہو گئے۔ اس وقت غفلت بھی نہیں رہی اور خود ہی پلیٹ فارم پر چل کر ٹرین میں سوار ہو گئے۔ لیکن ٹرین میں سوار ہونے کے بعد غفلت کی وہی حالت تھی کہ کہیں کی خبر نہ رہی۔

اسماعیلیہ کا اسٹیشن آیا تو وہاں "انجمن اخوان المسلمین" کی جانب سے استقبالیہ کا عظیم الشان انتظام تھا۔ نعروں کی آواز نے حضرت مفتی صاحب کو بیدار کر دیا۔ آپ نے ملاقات کرنے والوں سے اطمینان سے گفتگو کی۔ ہر ایک بات کا صحیح جواب دیا۔ اور جب گاڑی روانہ ہوئی تو غفلت کی پھر وہی حالت تھی۔ قاہرہ اسٹیشن پر پہنچے تو ایک ہجوم نے استقبال کیا۔ آپ قیام گاہ تک اچھی حالت میں پہنچ گئے۔ مگر قیام گاہ پر پہنچ کر پھر غفلت ہو گئی۔ پورٹ سعید اسماعیلیہ اور قاہرہ کے اسٹیشنوں پر اترنے چڑھنے اور گفتگو کے وقت قطعاً اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ آپ پر غفلت کا یہ اثر ہے۔ مگر جب واپسی میں میں نے تذکرہ کیا تو حضرت مفتی صاحب کو کوئی چیز یاد نہیں تھی۔ استقبال کرنے والوں سے جو گفتگو ہوئی جن حضرات سے ملاقاتیں فرمائیں، میں نے ان کا تذکرہ کیا۔ حضرت مفتی صاحب نے بڑے تعجب سے ان تمام باتوں کو سنا۔ مفتی صاحب کو خود تعجب تھا کہ انھیں کوئی بات یاد نہ تھی۔ بہر حال ایک عجیب و غریب طاقت ان تمام موقعوں پر کار فرما رہی۔ اس کو روحانی طاقت کہنا چاہیے یا احساس فرض کا وہ قوی جذبہ جو غفلت کی حالت میں بھی دل و دماغ سے محو نہیں ہوا۔

بہر حال قاہرہ اسٹیشن پر آپ کا بہت شاندار استقبال کیا گیا۔ ہندوستانی دوست جو اپنی ضرورتوں کی وجہ سے "مصر" میں مقیم تھے، ان کا بیان تھا کہ اتنا شاندار استقبال دنیا کے کسی نمائندہ کا نہیں کیا گیا۔ عربی بولنے والوں کی فضا "مفتی اکبر زندہ باد" --- "ہندی وفد زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی۔ عظیم الشان جلوس نے آپ کو قیام گاہ تک پہنچایا۔ لیکن قیام گاہ پر پہنچ کر بخار کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔

۷/ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو شام کے پانچ بجے اجلاس شروع ہوا۔ صدر کے دائیں جانب آپ کے لیے کرسی مخصوص کی گئی تھی۔ سبجیکٹ کمیٹی کے ارکان میں آپ کا نام سب سے پہلے لکھا گیا تھا۔ مگر حالات کے باعث آپ اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے۔ اور آپ کا بیان آپ کے رفیق سفر کو پڑھنا پڑا۔

عرب اور مصر کے باشندے رکھ رکھاؤ کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ کسی غیر عربی کا احترام مشکل سے کرتے ہیں۔ مگر اہل مصر کے دلوں میں آپ کا احترام یہاں تک تھا کہ مصر کے سب سے زیادہ واجب الاحترام پیشوا یعنی شیخ الازہر آپ کی مزاج پرسی کے لیے دو مرتبہ قیام گاہ پر تشریف لائے۔ اس زمانہ میں شیخ الازہر سے ملاقات کے لیے شاہ مصر خود ان کی خدمت میں آتے تھے۔ شیخ الازہر کسی سے ملنے کے لیے کہیں نہیں جاتے۔ یہ حضرت مفتی صاحب کا غیر معمولی اعزاز تھا کہ شیخ الازہر دو مرتبہ مزاج پرسی کے لیے آئے۔

مصر سے واپسی اور فوٹو کا مسئلہ

واپس ہونے سے ایک دو روز پہلے بخار اترا مگر نقاہت اور کمزوری بہت تھی۔ ضرورت تھی کہ جب تک صحت بحال ہو قاہرہ میں قیام کریں۔ مگر ہندوستان کے مشاغل میں علماء اور عمائدین مصر جو پہنچانے کے لیے تشریف لائے تھے، مصر کے عام قاعدہ کے مطابق ان کی خواہش ہوئی کہ پارٹی کا فوٹو لیا جائے۔ حضرت مفتی صاحب نے منع فرما دیا۔ علمائے مصر کا ایک گروہ فوٹو کو جائز قرار دیتا ہے۔ ان حضرات نے بحث شروع کر دی۔ بحث مختصر مگر بہت دلچسپ تھی۔ سوال و جواب کے مختصر جملہ اب تک ذہن میں ہیں۔ جہاں تک حافظہ کام کر رہا ہے، سوال و جواب کے الفاظ یہ تھے:

علماء مصر: التصوير الممنوع انما هو الذي يكون بصنع الانسان و معالجة الايدى وهذا ليس كذلك انما هو عكس الصورة۔ (ممانعت تو صرف اُس تصویر کی ہے جو انسان کے عمل اور ہاتھوں کی کاریگری سے ہو۔ فوٹو میں کچھ نہیں کرنا پڑتا یہ تو صورت کا عکس ہوتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب: كيف ينتقل هذا العكس من الزجاجة الى الورق ۔ (یہ عکس کیمرہ لینس سے کاغذ پر کس طرح منتقل ہوتا ہے)

علماء مصر: بعد عمل کثیر (بہت کچھ کاریگری کرنا پڑتی ہے)
حضرت مفتی صاحب: ای فرقٍ معالجه الایدی و صنع الانسان والعمل الکثیر (انسان کے عمل ہاتھوں کی کاریگری اور بہت کچھ کاریگری میں کیا فرق ہے؟)
علماء مصر: نعم ھو شئٌ واحد (کوئی فرق نہیں صرف الفاظ کا اختلاف ہے)
حضرت مفتی صاحب: اذا حکمھا واحد (لہذا حکم بھی اس کا ایک ہے)
علماء مصر حضرت مفتی صاحب کی حاضر جوابی اور صحیح جواب سے بے حد متاثر ہوئے اور کچھ ایسے خاموش ہوئے کہ جواب نہ دے سکے۔□□

فقیہ الامت مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا سیّد سلیمان ندویؒ

ولادت ۱۲۹۲ھ وفات ۷۲ ۱۳ھ ۔عیسوی سال ۱۹۵۲ء کے ختم کو ایک گھنٹہ ۳۵ منٹ باقی تھا کہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو دس بج کر ۲۵ منٹ پر حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی نے اپنے گھر کوچہ چیلان دہلی میں وفات پائی، یہ خبر یکم جنوری ۱۹۵۳ء کی صبح کو کراچی پہنچی۔اور لوگوں کو اس حادثۂ فاجعہ کے علم سے بڑا صدمہ ہوا۔ مختلف علماء نے اپنے تاثرات اخباروں میں چھپوائے۔اور جمعیۃ علماء اسلام کی مجلس عاملہ اور ۳۲ علماء کی دستوری مجلس نے جس میں سارے پاکستان کے منتخب علماء موجود تھے۔اس حادثہ پر غم کا اظہار کیا اور دعائے خیر کی۔

مرحوم کے نام سے واقفیت مجھے ۱۹۱۴ء میں ہوئی۔جب ندوۃ العلماء کا اصلاحی اجلاس حکیم اجمل خاں صاحبؒ کی طلب پر دہلی میں منعقد ہوا تھا۔اور ارکان کی باہمی مخالفت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ مولانا شبلی کی تکفیر کا فتویٰ دہلی میں مرتب ہوا، جس پر مفتی صاحب مرحوم کے دستخط تھے۔اس کے بعد یہ نام ذہن سے اتر گیا۔اور یکایک ۱۹۱۹ء میں جب مسلم لیگ کا استقبالیہ خطبہ ڈاکٹر انصاری نے پڑھا اور اس میں خلافت اور جزیرۃ العرب سے متعلق فقہی اور لغوی بحث پیش کی تو خیال ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کو یہ مواد کس نے بہم پہنچایا۔اس سلسلہ میں مفتی صاحب کا نام پھر سنا اور اتفاق وقت دیکھیے کہ ایک ہی سال کے بعد ۱۹۲۰ء میں مجلس خلافت کی تحریک کے سلسلے میں حکیم صاحب مرحوم کے دولت کدہ پر ایک جلسہ تھا جس میں مفتی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔سب سے اوّل ان کی ظاہری صورت اور متواضع لباس کی بنا پر قیافہ نے ان کے فضل و کمال سے حسن ظن پیدا نہ ہونے دیا، مگر تھوڑی بات چیت سے پتہ چل گیا کہ اس غلاف کے اندر تلوار کیسی ہے۔اس کے بعد خلافت اور جمعیۃ العلماء کے اجلاسوں میں بار بار ملاقات اور خلط ملط ان کے علمی، ذہنی اور اخلاقی علوئے شان کی نشاندہی کرتا چلا گیا۔پھر تو یہ حال ہوا:

یزیدُكَ وَجهُهٗ حسناً اِذا ما زِدْته نظراً

ترجمہ: ممدوح کا چہرہ حسن میں اتنا ہی ترقی کرتا چلا جاتا ہے، جتنا تم اس کو دیکھتے جاؤ۔

کئی دفعہ مرحوم کے ساتھ یکجائی سفر کا اتفاق ہوا جس میں سب سے طویل سفر ۱۹۲۶ء میں حجاز کی مؤتمر اسلامی میں شرکت اور حج کی غرض سے کیا گیا تھا۔ایک جہاز سے ہم سب کا جانا اور آنا اور مکہ معظمہ میں قریب قریب قیام اور مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک اونٹوں پر ایک ہی قافلہ میں روانگی اور عرفات میں ایک ہی اونٹ پر مسجد نمرہ تک سواری نصیب ہوئی۔

دوسرا موقع یہ آیا کہ مفتی صاحب کے صاحبزادے کی بات میں نے اعظم گڑھ میں ایک خاندان میں چھیڑی اور مفتی صاحب مع حافظ احمد سعید صاحب اعظم گڑھ میں دارالمصنفین آکر میرے مہمان ہوئے اور چند روز قیام فرمایا۔وہ بات پکی نہیں ہوئی، لیکن اس اثناء میں ہماری دوستی پکی ہوگئی۔آخری ہمرہی و ہمسفری ۱۹۴۱ء میں دہلی سے بھوپال تک ہوئی۔جہاں ہم دونوں ریاست کی دعوت پر اس کے نکاح و طلاق کے ضابطوں پر نظر ثانی کرنے کو بلائے گئے تھے۔اور ساتھ ہی سرکاری مہمان خانہ کے ایک ہی کمرہ میں ٹھہرے تھے۔

وطن اور خاندان

مرحوم کا وطن شاہجہانپور تھا۔مرحوم کا وجود اسلام کے عظیم الشان کا عملی ثبوت تھا۔مولوی حافظ احمد سعید صاحب نے جو اُن کے سب سے زیادہ قریب رہنے والے اور ان کے دست راست تھے، مجھے بتایا کہ مرحوم کے مورث اعلیٰ یمن سے آئے تھے۔روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ یمن سے سوداگروں کا ایک قافلہ بادبانی کشتی میں بیٹھ کر ہندوستان کی جانب روانہ ہوا لیکن ہندوستان کے ساحل پر پہنچنے سے

پہلے وہ ایک طوفان میں پھنس کر تباہ ہو گیا۔ اس قافلہ میں شیخ جمال نام ایک کمسن لڑکا بھی سوار تھا، وہ کشتی کے ایک تختہ پر بیٹھ کر کنارہ لگ گیا۔ وہاں بھوپال کا ایک شخص اس کو اپنے ساتھ بھوپال لے آیا اور اس کو اپنی تربیت میں رکھ کر اپنے ہی خاندان کی ایک لڑکی سے اس کی شادی کر دی۔ یہی شیخ جمال مفتی صاحب مرحوم کے مورث اعلیٰ تھے۔ بھوپال سے یہ خاندان شاہجہانپور میں منتقل ہوا اور محلہ سن زئی میں سکونت اختیار کی۔ اور گذر بسر کے لیے ایک معمولی پیشہ اختیار کیا۔ اور یہ اسلام کی علمی تاریخ کے لیے کوئی نیا واقعہ نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں کتنے ہی علمائے حدیث و فقہ اور مسند نشینیاں فضل و کمال جوتہ بنانے والے، کپڑا بننے والے، تیل بیچنے والے، جوتہ گانٹھنے والے اور دوسرے معمولی پیشہ کرنے والے بزرگ تھے اور آجتک وہ خصاف، نساج، حلاج، دباغ، حلوائی، حصیری، جریری کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور درس و ارشاد کی مسند پر قریش و سادات کے پہلو بہ پہلو بٹھائے جاتے ہیں اور ساری دنیائے اسلام، ان کے آگے اپنے احترام کا سر جھکاتی ہے۔ یہ کوئی نہ کہے کہ یہ اسلام کی گذشتہ روایات کا سماجی واقعہ ہے، مرحوم مفتی صاحب کا وجود اسلام کی معاشرتی مساوات کا آج بھی ناقابل تردید واقعہ ہے۔ انھوں نے مسلسل بیس برس تک سارے علمائے ہند کے رئیس کی حیثیت سے جمعیۃ علماء کی صدارت کی، اور کسی نے ان کے اس استحقاق سے سرتابی نہیں کی۔ اور وہ بڑے سے بڑا احترام جو ایک انسان، دوسرے انسان کو دے سکتا ہے، وہ تمام عمر مسلمانوں میں ان کو حاصل رہا اور دنیا نے مفتی اعظم ہند کہہ کر پکارا۔

مرحوم کے والد ماجد کا نام شیخ عنایت اللہ تھا۔ اور شیخ جمال یمنی تک ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

شیخ عنایت اللہ بن فیض اللہ بن خیر اللہ بن عباد اللہ۔

بھوپال کا شہر، امیر دوست محمد کی حکومت میں ۲۱ھ میں آباد ہوا، اس سے ظاہر ہوا کہ شیخ جمال یمنی کی بھوپال میں آمد زیادہ سے زیادہ تیرہویں صدی ہجری کے آغاز کا ہو سکتا ہے جو اُنیسویں صدی کے مطابق ہے۔

تعلیم و تربیت

مرحوم کے والد گو غریب تھے، مگر ہمت عالی رکھتے تھے۔ اور بچہ کو عالم دین بنانے کی تمنا دل میں رکھتے تھے۔ پانچ سال کی عمر میں شہر کے ایک محلہ میں حافظ برکت اللہ صاحب کے مکتب میں داخل ہوئے۔ اور یہیں قرآن مجید ختم کیا۔ اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم محلہ وَرگ زئی میں حافظ نسیم اللہ کے مکتب میں ہوئی۔ اسی زمانہ میں محلہ خلیل شرقی میں مولوی اعزاز حسن صاحب کا مدرسہ اعزازیہ قائم ہوا تھا، مکتبی تعلیم سے فارغ ہو کر اسی مدرسہ میں داخل کیے گئے۔ یہاں انھوں نے فارسی کی اعلیٰ اور عربی کی ابتدائی کتابیں حافظ بدھن صاحب سے پڑھیں۔ یہاں کے اساتذہ میں ایک ولایتی افغان عالم مولانا عبید الحق خاں صاحب تھے۔ (جو مولانا فضل اللہ خاں صاحب شاہجہانپوری کے جن کو بمبئی اور کراچی کے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں اور جو بالفعل جمعیۃ الفلاح کراچی کے ناظم ہیں، والد بزرگوار تھے) بچپن ہی سے مفتی صاحب مرحوم کی ذہانت و طباعی آشکارا تھی، ان کے استاذ ان سے محبت کرتے تھے۔ مولانا عبید الحق صاحب نے اپنے ہونہار شاگرد کی طرف بیش توجہ کی اور شیخ عنایت اللہ صاحب کو مجبور کر کے ۱۳۱۰ء میں ان کو مراد آباد کی شاہی مسجد کے مدرسہ میں بھجوا دیا، جہاں انھوں نے وہاں کے مدرسین مولانا عبد العلی صاحب میرٹھی، مدرس اوّل سے جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے شاگرد تھے اور بعد کو مدرسہ عبد الرب دہلی میں صدر مدرس ہوئے اور مولوی محمد حسن صاحب اور مولوی محمود حسن سہوانی سے کتابیں پڑھیں۔

مفتی صاحب دو سال کے بعد یہاں سے ۱۳۱۲ھ میں مدرسۂ دیوبند چلے گئے۔ اور وہاں کے مدرسین میں مولانا منفعت علی صاحب دیوبندی، مولانا حکیم محمد حسن صاحب (حضرت شیخ الہند کے چھوٹے بھائی) اور مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی اور مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی سہارنپوری سے اسباق پڑھے۔ اور کتب حدیث کا درس مولانا عبد العلی صاحب میرٹھی اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب سے حاصل کیا۔

صحاح ستہ کے دورہ میں اٹھارہ حضرات شریک تھے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

مولانا انور شاہ صاحب کشمیری، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی (حال شیخ الحدیث مدرسہ عبدالرب دہلی) مولوی محمد امین الدین صاحب، ابولوی بانی مدرسہ امینیہ دہلی، ۱۳۱۵ھ میں ۲۲ برس کی عمر میں دیوبند سے فراغت ہوئی۔

مولانا عبید الحق صاحب نے شاہجہانپور میں ۱۳۱۴ھ میں ایک مدرسہ عین العلم قائم کیا تھا۔ مولانا کفایت اللہ صاحب جب فراغت کے بعد وطن واپس آئے، شفیق استاذ نے ان کو اسی مدرسہ میں جگہ دی۔ اور تقریباً پانچ سال اس میں کام کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں شاہجہانپور میں قادیانیت کی تحریک پہنچی تو اس کے رد میں ۱۳۲۱ھ میں البرہان نام ماہانہ رسالہ جاری کیا۔ مدرسۂ عین العلم میں جن اصحاب نے آپ سے پڑھا ان میں سے حسب ذیل اصحاب کے نام قابل ذکر ہیں۔ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب استاذ الادب والفقہ دیوبند، مولانا مفتی مہدی حسن مفتی دارالعلوم دیوبند، مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی ایڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ۔

مدرسہ امینیہ دہلی کو جس سے مفتی صاحب کا پچاس برس تعلق رہا، ان کے رفیق درس مولوی امین الدین صاحب ابولوی نے ۱۳۵۶ھ میں قائم کیا تھا۔ موصوف ابولہ احاطہ بمبئی کے باشندے تھے۔ مگر اپنی علمی و عملی کوششیں دہلی میں خرچ کیں۔ اس مدرسہ کے سب سے پہلے مدرس حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری مقرر ہوئے تھے۔ حضرت شوق نیموی عظیم آبادی کی کتاب آثار السنن جب شائع ہوئی ہے تو مولانا کاشمیری امین الدین صاحب شاہجہانپور جاکر مفتی کفایت اللہ صاحب کو ۱۳۲۱ھ میں یہاں لے آئے اور مولوی صاحب کی زندگی تک وہ صرف مدرس رہے۔ ۱۳۱۸ھ مطابق ۶/جون ۱۹۲۰ء میں مولوی صاحب کا انتقال ہوا تو اہل شوریٰ نے مفتی صاحب کو مہتمم بھی بنادیا جس کے کام کو وہ آخر تک بناہتے رہے۔

یہ مدرسہ امینیہ پہلے سنہری مسجد میں تھا، یہاں جانے کا مجھے صرف ایک دو دفعہ اتفاق ہوا۔ آخر میں مفتی صاحب کے اہتمام میں ایک اور مسجد کے پاس مدرسہ کی موجودہ عمارت بنی، اس میں بھی مفتی صاحب کی ملاقات کا جذبہ کئی دفعہ مجھے کھینچ کر لے گیا۔ ☐☐

ارشادات

حضرت الحاج مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

افسوس کہ جن مولانا مفتی محمد کفایت اللہ کو آج سے چند دن پہلے ہم سلمہ اللہ اور دام ظلہٗ کہا کرتے تھے آج رحمۃ اللہ اور مرحوم و مغفور کی صفت سے یاد کر رہے ہیں۔ افسوس مرحوم و مغفور ہونے پر نہیں کہ یہ تو زندگی کا انتہائی مطلوب اور متمنا ہے۔ افسوس اُن کے وصال پر نہیں کہ وصال بحق تو حصول مقصود ہے۔ افسوس فراق پر ہے کہ ایک روشنی ہم میں تھی اور نہ رہی۔ علم و عمل کی کتنی ہی خصوصیات ہم میں جلوہ پیرا تھیں اور چھن گئیں۔ وہ انشاء اللہ واصل اور مرحوم و مغفور ہیں اور بنائے ہی گئے تھے رحمت و مغفرت کرنے کے لیے بقول امام محمد رحمہٗ اللہ۔ جب ان کے وصال کے بعد بعض عارفین نے اُنھیں خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اے محمد! حق تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ تو فرمایا کہ حق تعالیٰ نے مجھے بخش دیا اور فرمایا کہ اے محمد! اگر مجھے تیری مغفرت منظور نہ ہوتی تو میں اپنا علم ہی تیرے سینہ میں کیوں ڈالتا؟ پس حضرت مفتی صاحب انشاء اللہ مغفور اور واصل ہیں۔ اگر مغفرت و وصل منظور نہ ہوتا تو یہ علم کتاب و سنت ان کے سینہ میں ڈالا ہی کیوں جاتا؟ اس لیے ان کے وصال و مغفرت پر ان کا رونا نہیں رونا اپنا اور اپنی محرومی کا ہے کہ ایسا جاذبِ مغفرت خزانہ ہم سے جاتا رہا۔

حضرت مفتی صاحب اپنے علم و عمل کے لحاظ سے یقیناً مردہ نہیں بلکہ زندہ اور زندہ جاوید ہیں۔ مگر فراق بہر حال فراق ہے بلکہ زندہ کا فراق مردہ کے فراق سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ مردہ چلا جائے تو صبر آکر اُس کی یاد فراموش ہو جاتی ہے۔ لیکن زندۂ جاوید کے انمٹ کارنامے ہمہ وقت سامنے رہتے ہیں جو اسے بھولنے نہیں دیتے اس لیے غم فراق بھی ہمہ وقت تازہ رہتا ہے اس لیے مردہ کا غم تو ہنگامی ہوتا ہے اور زندہ کے فراق کا دوامی، جس کی تسکین کچھ اس کے تذکرہ ذکر ہی سے ہوتی ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ وقت کے اُن چیدہ اور منتخب روزگار علماء میں سے تھے جو بیک وقت عالم و فاضل، فقیہ و محدث، ادیب، وشاعر، ناظم، وناثر، وقور، وغیور، تقی ونقی، خلیق و مجاہد اور صاحبِ سعی و عمل ذکاوت و فطانت میں بے مثل۔ ان کی ذکاوت کے نمونے خود بھی دیکھے اور بزرگوں سے بھی سنے۔ غالباً ۱۳۵۶ھ میں ایک بار میں نے حضرت تھانوی رحمہٗ اللہ سے عرض کیا کہ کاش اس وقت سارے مسلمان کسی ایک مرکز پر جمع ہوتے اور یہ نہیں تو کم از کم اپنی جماعت کے تو ایک مرکز پر جمع رہتے جس کی سہل صورت یہ ہے کہ آپ اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب کسی ایک مشترکہ نقطہ پر اجتماع فرمالیں تو بڑی آرزو سے فرمایا کہ ہاں میرا جی بھی چاہتا ہے کہ اگر ایسا ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہو اور تم اس بارے میں سعی کرو۔ میں اپنی جماعت میں اس وقت مولانا کفایت اللہ صاحب کے حسن تدبر اور ذکاوت کا معتقد ہوں۔ پہلے ان سے ملو اور پھر انھیں لے کر مولانا حسین احمد صاحب سے ملاقات کرو۔ دہلی جانے کے لیے مجھے اور مولانا شبیر علی صاحب اور مولانا مفتی عبدالکریم صاحب، مفتی خانقاہ تھانہ بھون کو منتخب فرمایا۔ جیب سے پچاس روپیہ نکال کر بڑی اُمنگ اور آرزو کے ساتھ دیئے اور بہت ہی نرمی کے ساتھ فرمایا کہ خوب مٹھائی کھاتے ہوئے دہلی جاؤ اور اس مقصد میں جد و جہد کرو۔ واقعہ طویل ہے، اس کی حکایت مقصود نہیں۔ ظاہر یہ کرنا ہے کہ اکابر جماعت بھی جو حضرت مفتی صاحب سے طبقہ میں اوپر تھے ان کے علم و ذکاء کے گرویدہ اور معتقد تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب انگریزوں سے ترک موالات کا استفتاء پیش کیا گیا تو غایت انکسار نفس اور حدود شناسی

کے ساتھ فرمایا کہ مجھے انگریزوں سے غیر معمولی بغض و نفرت ہے۔ ان کے بارے میں فتویٰ دینے میں مجھے اپنے نفس پر اعتماد نہیں ہے کہ وہ حدود کی رعایت رکھ سکے۔ دوراں حالیکہ قرآن حکیم کا فیصلہ ہے کہ اِعۡدِلُو هُوَ اَقرَبُ لِلتَّقوىٰ اور یہ فرمایا کہ اپنے مخصوص تلامذہ میں سے فتویٰ لکھنے کے لیے جن تین حضرات کا نام لیا ان میں اوّلین نام حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ گویا حضرت کو اپنے نفس پر اس بارے میں اتنا اعتماد تھا نہ تھا جتنا اُن پر تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اپنے نفس پر بے اعتمادی یہ عین کمال بلکہ منتہائے کمال اور احتیاط و تقویٰ کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ اور اس لیے فتویٰ صادر فرمانا درحقیقت ایسے ہی اہل اللہ کا حق تھا۔

مگر اسی سے ظاہر ہے کہ ایسے اکابر جن پر خود اعتماد فرمائیں اور اپنے مقابلہ میں اعتماد کا اظہار کریں وہ کتنے محتاط اور متدین ہوں گے؟ کسی کے مقبول عند اللہ ہونے کی علامت ہی یہ ہے کہ خواص اہل اللہ کے قلوب میں اس کی وقعت اور منزلت قائم ہو۔

اس سے واضح ہے کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اپنے چھوٹوں یا ہم عصروں ہی میں معتمد علیہ نہ تھی بلکہ اپنے اساتذہ و شیوخ اور اپنے سے اوپر کے طبقات میں بھی قابل اعتماد اور لائق بھروسہ تھی۔ اور بڑے چھوٹے سب ہی ان کے علم و فضل، اعتدال، رعایت حدود اور موقع شناسی کے قائل تھے جن کے چھوٹے ایسے تھے ان کے بڑے کیسے ہوں گے اور جن کے بڑے ایسے تھے ان کے چھوٹوں کا کیا کہنا؟

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی علمی ذکاوت اور تفقہ فی الدین کی خداداد قوت مشکل سے مشکل مسائل کی گتھیوں کو چٹکیوں میں سلجھا دیتی تھی۔ ۱۹۳۰ء کے اجلاس جمعیۃ علماء لاہور کی سبجیکٹ کمیٹی میں کسی مسئلہ کے ضمن میں حضرت مفتی صاحب اور مولانا ثناء اللہ صاحب مرتسری (اہل حدیث) کے درمیان مسلک کے بارے میں ایک بحث آپڑی تو علماء جانتے ہیں کہ حضرت مفتی صاحب نے برجستگی کے ساتھ کیا کیا باریکیاں اور نکات اس میں پیدا کیے اور کس کس طرح مرتجلاً حقائق فقہ بیان فرمائے کہ علماء بھی حیران تھے اور مولانا ثناء اللہ صاحب بھی مداح تھے کیونکہ وہ خود بھی ذہین وفطین تھے۔

فوجوں کی طرف سے وہیل مچھلی کے بارے میں استفتاء کیا گیا جس کا نام وہ نہیں جانتے تھے۔ صرف یہ کہ ایک مہیب قسم کا دریائی جانور جس کی صفات فلاں فلاں ہیں جائز ہے یا نہیں؟ حضرت مفتی صاحب نے اس کے بارے میں لغوی فقہی اور تاریخی تحقیقات پر مشتمل جو فتویٰ لکھا اور اس وہیل کو وہ مچھلی ثابت کیا جو قرن اوّل میں صحابہ کے لیے خدا نے دریا سے نکال کر کنارۂ سمندر پر پھینک دی تھی اور عنبر کے نام سے یاد کی گئی تھی تو علماء جانتے ہیں کہ یہ تدقیق انھی کا حصہ تھا۔

۱۳۵۸ھ میں احقر کے سفر افغانستان کے موقع پر جب کہ میں کابل میں تھا صدر اعظم سردار محمد ہاشم خاں صاحب کے یہاں مدعو تھا۔ حاضرین مجلس میں سے بعض ذمہ داران حکومت نے علماء ہند کو سیاسی اور قومی حیثیت سے کچھ معطل اور جامد ثابت کرنے کی طرف اشارے کیے تو میں نے وقت کے مجاہد اور مفکر علماء کی فہرست اور ان کے کارنامے شمار کرتے ہوئے جب حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی فکر و تدبر اور قومی جدوجہد کا ذکر شروع کیا تو سب کے سر جھک گئے اور بالآخر انھیں علماء کی سیاسی، قومی اور ملکی مساعی کو ماننا پڑا۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند سے ۱۳۱۵ھ میں فارغ التحصیل ہو کر نکلے جو احقر کی پیدائش کا سال ہے۔ فراغ تحصیل کے بعد ایک عرصہ تک شاہجہاں پور اپنے وطن میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ آپ کے اس دَور کے تلامذہ میں جہاں علماء فضلاء ہیں وہیں گریجویٹ بھی ہیں جن میں سے جناب حافظ ذاکر علی صاحب آپ کے ممتاز شاگرد ہیں جو شاہجہانپور کے بااثر اور مشہور وکلاء میں سے ہیں۔ میں نے ان کی ہی زبانی سنا کہ اُسی زمانہ میں شاہجہانپور میں کوئی عیسائی پادری آگیا۔ اور اُس نے اسلام اور مسلمانوں کو چیلنج کیا۔ وہ اپنی لائن کا فاضل تھا ہر ایک کو اس کے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ حضرت مفتی صاحب اس وقت ایک غیر معروف مدرس تھے۔ بحثوں اور مناظروں سے الگ تھلگ ہمہ

وقت درس و مطالعہ میں وقت گذارتے تھے۔ کسی کو یہ تصور بھی نہ تھا کہ وہ پادری کے مقابل آجائیں گے لیکن پادری کی تحدی سن کر حضرت مفتی صاحب میدان میں آگئے اور اس طرح اس سے نبرد آزما ہوئے کہ بحث و مناظرہ میں اسے عاجز کردیا۔ حتیٰ کہ خود انجیل کے حوالوں سے اس پر حجتیں قائم کردیں۔ یہ انتہائی ذکاوت کی بات تھی کہ وقت کے وقت انجیل کا مطالعہ اس گہری نظر سے کیا کہ آدھ شب ہی میں اس سے استخراج مسائل اور اتمام حجت پر قدرت حاصل کرلی۔ جس سے پادری کا منہ بند ہوگیا اور وہ شکست کھاکر فراری ہوا۔ اس مناظرہ سے حضرت مفتی صاحب کی ذکاوت کا چرچا ہوا۔ شاہجہانپور کے بعد حضرت ممدوح مدرسہ امینیہ دہلی میں بحیثیت صدر مدرس تشریف لائے۔ اور تقریباً ۵۲ برس استقامت کے ساتھ دہلی میں مسندِ درس و افتاء پر بیٹھ کر خواص و عوام کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ آپ کے درس اور بالخصوص درس حدیث کی یہ خصوصیت تھی کہ نہ لمبی تقریر فرماتے نہ بیان میں طول ہوتا۔ بلکہ اپنے استاد (شیخ الہندؒ) کے نقش قدم پر مختصر تقریر اور توجیہات حدیث کے سلسلہ میں نہایت مختصر جامع اور آخری توجیہ بیان فرمادیتے جس سے حدیث کا مغز طالب علم کے مغز میں اتر جاتا تھا اور مستفید کی استعداد مضبوط ترین استعداد بن جاتی تھی۔ اسی ذیل میں تصانیف کا سلسلہ بھی قائم رہا۔ اور متعدد مفید رسالے تالیف فرمائے جن میں سے تعلیم الاسلام آپ کی بہترین تالیف ہے جو عموماً دینی اور قومی مدارس میں ابتدائی نصاب کا جزو اور مقبولِ عام ہے۔ آپ کے ادیبانہ قصائد واشعار سے دینی رسالے مزین ہوئے۔ القاسم دور اول میں بھی آپ کے بعض عربی قصائد طبع ہوئے ہیں۔ ایک قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

عرفت اللّٰہ ربی من قریب — فکم بین الالٰہ والعبید

اردو میں بھی کبھی کبھی اشعار موزوں فرماتے جیسا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کی ملتان جیل سے رہائی کے وقت (جب کہ وہ اور مفتی صاحب دونوں اسیر حکومت کی حیثیت سے ملتان جیل میں تھے اور موصوف کے لیے مفتی صاحب سے پہلے رہائی کا حکم آگیا) اردو کا قصیدہ لکھ کر انھیں ایک جلسہ میں سنولیا جو جیل ہی میں منعقد کیا گیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ممدوح کے نام کا نہایت ہی موزوں تجع بھی حضرت مفتی صاحب نے خود ہی موزوں فرمایا۔ جو یہ ہے:

خدمتِ خلق بود خلق حبیب الرحمان

جس سے ان کی ادبیت اور طبیعت کی موزونیت واضح ہے۔ ان ہمہ وقت کی علمی اور درسی مصروفیات نے آپ کو قومی درد اور قومی خدمات سے بھی غافل نہیں رکھا۔ تحریک خلافت کے وقت آپ نے نہ صرف ملک و قوم کی سیاسی خدمات انجام دیں، بلکہ جماعت علماء میں سیاسی تحریکات اور قومی خدمات کے سلسلہ میں آپ کی حیثیت ایک بانی کی حیثیت ہے۔ ۱۹۱۹ء میں آپ نے جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد ڈالی۔ اور امرتسر میں اس کا پہلا اجلاس منعقد کیا جس میں آپ جمعیۃ علماء کے منتخب (حضرت مفتی صاحب حضرت شیخ الہندؒ کی وفات تک جمعیۃ علماء ہند کے عارضی صدر رہے) صدر قرار پائے۔ اور ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک بلا فصل آپ ہی جمعیۃ علماء کے صدر منتخب ہوتے رہے جو سیاسی خدمات کی لائن میں علماء ہند کے یہاں آپ کے مقبول عام اور معتمد علیہ خاص ہونے کی دلیل ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کی طبیعت کے اعتدال اور جامعیت نے جمعیۃ علماء ہند کا دائرہ اثر وسیع سے وسیع تر کردیا جس کو نہ صرف ہندوستان کے ہر طبقہ کے علماء نے اپنا سیاسی مرکز تسلیم کرلیا بلکہ بیرونِ ہند تک جمعیۃ علماء کی مرکزیت اور سیاسی نہضت تسلیم کرلی گئی۔

۱۹۲۴ء میں جب سلطان ابن سعود نے مؤتمر عالم اسلامی کا اجلاس مکہ مکرمہ میں طلب کیا تو آپ کو بحیثیت صدر جمعیۃ علماء خصوصی طور پر دعوت دی گئی۔ ۱۹۳۸ء میں مصر میں جب عالم اسلام کا ایک مشترکہ اجلاس بلایا گیا تو آپ کو اس کی صدارت کے لیے چنا گیا جن سے واضح ہے کہ مذہبی اور ملکی دونوں حیثیت سے علماء ہند و بیرونِ ہند اور سیاسی زعماء بلکہ قائدین سیاست آپ کو اپنا مسلمہ رہنما اور معتمد علیہ زعیم سمجھتے ہیں۔

اس سب پر مستزاد یہ کہ آپ مرکز علوم دینیہ دارالعلوم دیوبند کی

انتظامی (مجلس شوریٰ) کے رکن رکین تھے اور اکثر و بیشتر آپ کی موجودگی میں مجالس شوریٰ کی صدارت آپ ہی کے لیے مخصوص رہتی تھی۔ گویا آپ علمی، دینی، سیاسی اور انتظامی مجالس کے ایک بنے بنائے صدر تھے کہ صدارت آپ سے اور آپ صدارت سے متجاوز نہ ہوتے تھے۔ اس کا منشا حضرت ممدوح کی عظمت کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ مجلسی تجاویز کے بنانے میں آپ کی قابلیت ممتاز اور مسلمہ تھی۔ ماقل ودل الفاظ کے ساتھ ایسی جامع تجویز لکھتے تھے کہ واقعات کا خلاصہ مباحث کا نچوڑ اور منشاء مجوزین کا فحوی پورا کا پورا اس میں سمایا ہوتا تھا۔ بہت سی ایسی معاملاتی پیچیدگیاں جو بظاہر لاینحل نظر آتی تھیں ان کے اعتدال مزاج اور علمی استحضار کی بدولت بآسانی حل ہو جاتی تھیں۔ رائے فیصلہ کن دیتے تھے اور پھر اسے ایسی خوبصورتی سے قلمبند فرماتے تھے کہ گویا اس میں کوئی نزاع و جدال تھا ہی نہیں۔ اور سب ہی اس پر متفق ہو جاتے تھے۔

اخلاقی حیثیت سے نہایت وقور غیور اور باوضع تھے۔ اپنے چھوٹوں سے خلق وادب سے پیش آتے تھے۔ عام حالات میں ساکت وصامت اور خاموش رہتے تھے اور جب بولتے تو سنجیدگی میں ڈوبا ہوا کلام کرتے اور بقدر ضرورت بولتے تھے۔ اس علم وفضل پر سادگی اور بے تکلفی یہ تھی کہ اپنے لیے کوئی ممتاز وضع نہیں بنائی۔ عام سادہ لباس بے تکلف معاشرت اور وہی طالب علمانہ زندگی مرتے دَم تک قائم رکھی۔ سفر دہلی کے موقع پر جب کبھی احقران کے دولت خانہ پر ملنے کے لیے چلا گیا تو اس طرح پیش آتے تھے کہ گویا وہ خورد ہیں اور آنے والا بزرگ ہے۔ اس شخصیت اور علم ووقار پر سادگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے گھر کا سودا اور سامان خود ہی بازار سے خرید کر لاتے تھے۔ اس دور آخر میں دارالعلوم دیوبند کے مشہور مفتی اعظم اور میرے استاد حضرت الحاج الشیخ مولانا عزیزالرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندی قدس سرہ کی سادگی اپنے وقت میں ضرب المثل تھی۔ شیخ وقت اور مفتی ہند ہونے کے باوجود حضرت ممدوح کا روزانہ کا معمول تھا کہ بعد نماز عصر اپنے گھر کا سودا اور ضروریات خانہ خود بازار تشریف لے جا کر خریدتے حتیٰ کہ محلہ کی غریب عورتوں اور بیواؤں سے پوچھتے پھر جاتے کہ کسی کو بازار سے کچھ منگانا ہو تو کہہ دیں۔ غریب پردہ نشین عورتیں روزمرہ کے خورد ونوش نمک مرچ سبزی ترکاری وغیرہ کے لیے پیسے حوالہ کر دیتیں اور حضرت مفتی اعظم اپنے گھر کی ضروریات کے ساتھ محلہ کے ان گھرانوں کا سامان بھی خود ہی خریدتے۔ خود ہی اٹھا کر لاتے اور گھر گھر گھوم کر خود ہی پہنچا آتے۔ اس بے مثال بے نفسی کا عملی نمونہ اس دَور میں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہؒ تھے۔ آپ کا بھی علاوہ اور سادگیوں اور بے تکلفیوں کے یہ روزانہ کا معمول تھا کہ اپنے گھر کا روزانہ کا سامان خورد ونوش سبزی ترکاری وغیرہ اور ساتھ ہی جس نے آپ سے کچھ منگوانا چاہا وہ بھی خود ہی بازار جا کر خریدتے۔ زنبیل ہاتھ میں رہتی۔ سامان سے بھر کر ہاتھ میں لٹکا کر بازار سے لاتے اور کبھی بھی انھیں اپنی شخصیت اور اپنی مسلمہ قابلیت وعظمت کا دھیان نہ آتا تھا کہ وہ مفتیٔ اعظم ہند، صدر مدرسۂ امینیہ دہلی، صدر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند اور عالم اسلامی کی متعارف شخصیت ہیں۔

اس عظمت پر یہ بے نفسی اور فروتنی ای [illegible] ات سے متوقع ہو سکتی ہے جس میں علم کے ساتھ پاکیزگی نفس کا اخلاقی جوہر بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہو۔ ورنہ فی زمانہ اگر کسی شخص کو چار آدمی پوچھنے لگیں یا اتفاق سے کسی اخبار یا اشتہار میں اس کا نام آجائے تو اسے سڑک پر پیدل چلنا بھاری ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ ہاتھ میں بوجھل زنبیل لٹکا کر اپنے ہی معتقدوں اور نام لیواؤں کے درمیان سے بے تکلف گزر جانا اور گذرتے رہنا۔ یہ کسر نفسی انھیں قدسی صفت انسانوں کو دی جاتی ہے، جنھیں حق تعالیٰ اپنے دین کی مخصوص مہمات کے لیے منتخب فرما لیتے ہیں۔ اس کے مخصوصین قباہ شاہی اور رسمی کروفر میں نہیں بلکہ گدڑیوں، کمبلوں اور عام وضع کے سادہ کرتوں ہی میں نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ اس جہان میں مساکین ہوتے ہیں، مگر اُس جہان میں سلاطین۔ اور اگر قلوب کی دنیا میں تلاش کیا جائے تو اس جہانِ فانی میں بھی وہ سلطان ہی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ سلاطین خود بھی ان کے آگے جھکتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ سلاطین اپنے تیغ و تفنگ سے قبضہ پاتے ہیں۔ اور وہ بھی صرف اجسام پر اور یہ اپنی خاموش زندگی اور

اخلاص کی زبان سے قبضہ پاتے ہیں اور اجسام پر نہیں بلکہ دِلوں اور جانوں پر۔

مبین حقیر گدلیان عشق را کیں قوم
شہان بے کمر و خسروانِ بے کلُہ اند

اسی انتخاب خداوندی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ مخلوق بھی ہر اچھے منصب، ہر اچھی خدمت اور ہر اچھی ذمہ داری کے لیے انھیں ہی منتخب کرتی ہے۔ یہ چند سطریں حضرت مفتی صاحب کی سوانح نہیں، ان کے مناقب کی داستان نہیں۔ اس کے لیے دفتروں کی ضرورت ہے۔ یہ تو صرف "اذکرو محاسن موتاکم" کے تحت ان کے تذکرہ سے اپنے دِلوں کی تسلی اور تسکین ہے اور بس۔ تذکرہ ان کا ہمیشہ رہے گا۔ ہر زبان اور قلم پر رہے گا۔ جب اللہ کا ذکر ہوگا تو ان اللہ والوں کا بھی ذکر ہوگا۔ اور اللہ کا ذکر دائمی ہے تو یہ بھی اپنے ذکر کے لحاظ سے دائمی ہیں۔ یہ چند سطری تذکرہ اسی دوامی ذکر کی ایک شاخ ہے جس کا مقصد محض یاد ہے استقصاء ذکر نہیں۔ اور نہ وہ ان سطروں میں ہو ہی سکتا ہے۔ ایک جامع شخصیت کا ذکر ایک شخص کیا کر سکتا ہے۔ پوری جامعہ بشری کرتی ہے۔ چنانچہ آج حضرت مفتی صاحب کی وفات کو کوئی ایک حلقہ ہی نہیں رو رہا ہے علمی حلقے الگ ماتم کناں ہیں۔ انتظامی دائرے الگ پژمردہ ہیں۔ خواص الگ اشکبار ہیں۔ اور عوام الگ سوگوار ہیں۔ جامع کو جوامع ہی روتے ہیں کیونکہ حضرت مفتی صاحب فرد نہیں تھے امت تھے۔ اس لیے یہ رونا پوری ہی امت کا ہے، کسی فرد کا نہیں۔

لیس علی اللہ بمستنکرٍ ان یجمع العالم فی واحدٍ

حق تعالیٰ حضرت مرحوم کو اعلیٰ غرف فردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ مقام صدق میں اپنی نزدیکی بخشے اور رحمتوں کی بارش ان پر ہمیشہ ہمیشہ برستی رہے۔ آمین۔ ◻◻

موتُ العالِم موت العالَم

از جناب حافظ صاحب غازی آبادی مقیم کراچی

چھین لیے ہیں دستِ قضا نے
محسنِ ملت مفتیٔ اعظم
سارا چمن مصروف فغاں ہے
سنبل و ریحاں لالہ و شبنم
جاتی رہی بے لوث قیادت
چھن گیا ہم سے رہبر اعظم

لٹ گئی ہے اخلاص کی دنیا
افسردہ ہے زُہد کا عالم
کون سے دل میں درد نہیں ہے
کون سی آنکھ نہیں ہے پرنم
حافظؔ شمس نے ٹھیک کہا ہے
موت العالِم موت العالَم

آہ مفتی اعظم ہند!

مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدیر رسالہ برہان دہلی

کواحسرتا! ۳۱ر دسمبر ۵۲ء کو شب کے ساڑھے دس بجے یعنی ٹھیک اس وقت جبکہ ایک سال شمسی اپنی حیاتِ دوازدہ ماہ کی مقررہ مدت پوری کر کے ہمیشہ کے لیے گوشۂ عدم میں آسودۂ سکون ہو جانے کی تیاری کر رہا تھا علم و عمل کے آسمان کا ایک آفتابِ عالم تاب غروب ہوگیا۔ یعنی حضرتنا الاستاذ مولانا الحاج المفتی محمد کفایت اللہ الدہلوی نے اسّی سال کے لگ بھگ عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر جان جان آفرین کے سپرد کی! اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مفتی صاحب کا وجودِ گرامی اپنی چند در چند علمی و عملی خوبیوں اور گوناگوں دماغی و اخلاقی کمالات کے باعث صرف ہندوستان اور پاکستان کا نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا ایک ایسا متاعِ گراں مایہ اور سرمایہ بلند پایہ تھا کہ آج اس کے اُٹھ جانے پر جتنا بھی ماتم اور اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ حضرت مرحوم خود جلیل القدر بزرگ اور بزرگوں کی یادگار تھے۔ اُنھیں دیکھ کر اور ان کی صحبت میں دو چار لمحے گذار کر سلف الصالحین کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ قدرت نے ان میں دل اور دماغ دونوں کی خوبیاں اور ان کے فضائل و کمالات کچھ اس طرح بیک وقت جمع کر دیئے تھے کہ ان کی ہستی "اے تو مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم" کا مصداق بن گئی تھی۔ وہ ایک طرف بہت بڑے عالم، مفسر، محدث اور فقیہ تھے تو دوسری جانب علوم عربیہ کے جامع تھے اور ان میں بہت ٹھوس استعداد رکھتے تھے۔ پھر معاملات میں سمجھ بوجھ اور سیاسی اور دنیوی امور و مسائل میں ان کی فرزانگی و دانشمندی کا یہ عالم تھا کہ جس طرح علماء کی بزم کے وہ صدر نشین تھے اسی طرح اربابِ سیاست و تدبر کی محفل میں بھی اپنا مقامِ خاص رکھتے تھے۔ "جو بات کہتے تھے" اور جو لفظ ان کے قلم سے نکلتا تھا وہ اس قدر جچا تلا اور ناپا تلا ہوتا تھا کہ کسی بڑے سے بڑے نکتہ چیں کے لیے بھی اس پر حرف گیری آسان نہ ہوتی تھی۔ یوں تو اللہ تعالیٰ نے آں مرحوم کو سب ہی علوم اسلامیہ میں غیر معمولی درک و بصیرت اور فہم و فراست عطا فرمائی تھی۔ تاہم آپ کا اصل طغرائے امتیاز تفقہ فی الدین تھا۔ بڑے سے بڑا پیچیدہ مسئلہ ان کے سامنے آتا تھا اور وہ قرآن و حدیث اور احکامِ فقہ کی روشنی میں اس کا صحیح حل اس طرح علی وجہ البصیرت معلوم کر لیتے تھے کہ پھر کسی کے لیے اس کا خلاف کرنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ یہی وہ صفت تھی جس کے باعث ملتِ بیضاء نے ان کو مفتی اعظم کا خطاب دیا تھا۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ اس خطاب کا جامہ ان کے تفقہ کے قامتِ موزوں پر بالکل چست آتا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت مفتی صاحبؒ کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کافی غور و خوض اور تفکر و تدبر کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچتے تھے اور اس تفکر کے وقت مسئلہ کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا تھا جو ان کی نظر توجہ سے اوجھل رہ گیا ہو۔ اور پھر ان کا فیصلہ ایسا اٹل اور مستحکم ہوتا تھا کہ اس کو بدلوا دینا ممکن نہ تھا۔ اس حیثیت سے وہ بلاشبہ اسرار و غوامض شریعت کے بڑے محرم اور احکام و تعلیماتِ اسلام کے ایک دیدہ ور نباض تھے۔ ان کے فتاویٰ مختصر مگر نہایت جامع اور مدلل ہوتے تھے۔ وہ عام اربابِ افتا کی طرح اپنی تحریروں میں کتبِ فقہ کی طول طویل عبارتوں اور مختلف اقوالِ ائمہ کے نقل کرنے کے عادی نہ تھے۔ مگر جتنا کچھ لکھتے تھے مسئلہ کی اصل روح اور اس کے اصل مغز کا حامل ہوتا تھا۔ اسی بنا پر ۱۹۲۶ء میں مکہ معظمہ کی مؤتمر عالم اسلام میں جمعیۃ علماء ہند کے صدر وفد کی حیثیت سے انھوں نے شرکت کی اور اس کے بعد قاہرہ کی مؤتمر میں تشریف لے گئے تو ہر جگہ حجاز و مصر اور عالم اسلام کے دوسرے ملکوں کے علماء وفضلاء نے آپ کے غیر معمولی تفقہ فی الدین اور اصابت رائے کو

تسلیم کیا۔ اور آپ کی علمی عظمت و برتری کا علانیہ اعتراف کیا۔ قاہرہ کے دوران قیام میں آپ کی علمی سیادت کا اعتراف اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا کہ شیخ جامع ازہر علامہ مراغی جو اپنے عہدہ کی حیثیت سے شاہ مصر کے محل میں جانے کے علاوہ اور کسی کے مکان پر جا نہیں سکتے تھے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مزاج پرسی کے لیے دو مرتبہ آپ کی قیام گاہ پر تشریف لائے۔ نہ صرف علماء مصر بلکہ پوری مصری قوم کی طرف سے یہ سب سے بڑا خراج عقیدت تھا جو عالم اسلام کی کسی عظیم المرتبت ہستی کو پیش کیا جا سکتا تھا۔

حضرت مفتی صاحبؒ طبعاً نہایت ٹھنڈے دماغ سنجیدہ فکر متین طبیعت اور مرنجاں مرنج مزاج کے بزرگ تھے۔ ہنگامہ آفرینی یا انقلاب پسندی سے ان کی طبیعت کو کوئی لگاؤ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود ہندوستان کی تاریخ جدوجہد آزادی کے نہایت نازک دور میں جمعیۃ علماء ہند کے پہلے صدر کی حیثیت سے جب انھوں نے ایک نہایت اہم اور بھاری ذمہ داری اپنے سر لی تو اب وقت آیا کہ اُن کی قوت عمل اور کیرکٹر کی پوشیدہ خوبیاں بروئے کار آئیں۔ چنانچہ کانگریس کی تحریک آزادی اور جمعیۃ علماء ہند کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے اس تمام مدت میں جس تدبر، فراست، عزم و ہمت، استقلال و پامردی اور راہِ حق میں بے خوفی و بیباکی کا ثبوت دیا ہے اسے دیکھ کر یہی کہا جا سکتا تھا کہ "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔"

حضرت مفتی صاحبؒ کو اگر رئیس العلماء یا امیر العلماء کہا جائے تو ایسا کہنا صورۃً و معنیً، ظاہراً و باطناً دونوں طرح بالکل موزوں ہو گا کیونکہ وہ جس طرح علم و فضل کے اعتبار سے سرخیل علماء تھے، معاشی خوشحالی اور مالی رفاہیت کے لحاظ سے بھی علماء میں انھیں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ انھوں نے ایک کتب خانہ قائم کر کے خود اپنی قوت بازو سے دولت پیدا کی۔ پھر ان کی کتاب تعلیم الاسلام کے مختلف حصے گھر گھر اس قدر مقبول ہوئے کہ اب تک لاکھوں کی تعداد میں ان کی اشاعت ہو چکی ہے اور ان کے ذریعے ہزاروں روپیہ کا ان کو فائدہ ہوا۔ اس مالی رفاہیت اور معاشی فارغ البالی کے باعث وہ نہایت خودداری اور حد درجہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ رہتے تھے۔ خرچ کرنے کے موقع پر بے دریغ خرچ کرتے تھے اور اس معاملہ میں بھی ان کا ہاتھ ہمیشہ اونچا اور اربابِ تمول کی امداد سے بے نیاز و مستغنی رہتا تھا۔

مجموعی حیثیت سے حضرت مفتی صاحبؒ کا سب سے بڑا جوہر کمال یہ تھا کہ انھوں نے قدرت کی بخشی ہوئی ظاہری اور باطنی صلاحیتوں کو اپنی خاص توجہ اور محنت سے اس طرح اُبھارا اور انھیں پروان چڑھایا کہ اپنی شخصیت کی تعمیر اس انداز سے کی تھی کہ علم و فضل کے علاوہ اندرونِ خانہ اور بیرونِ خانہ زندگی کے کسی کام میں عاجز اور تہی مایہ نہ تھے۔ انھوں نے ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود اپنی دنیا آپ پیدا کی تھی جو دینی حیثیت سے جس طرح مکمل تھی دنیوی حیثیت سے بھی کہیں سے تشنہ اور خام نہیں تھی۔ چنانچہ گوناگوں علمی و عملی اور روحانی و معنوی کمالات و فضائل کے علاوہ وہ اعلیٰ درجہ کے خطاط بھی تھے اور خیاط بھی۔ ایک بہترین انجینئر بھی تھے اور طباخ بھی، خوش لباس خوش غذا تھے اور ورزشی جسم رکھتے تھے۔ ملتان جیل میں بیڈمنٹن کھیلنا شروع کیا تو چند روز کی مشق میں ہی سب ساتھیوں پر بازی لے گئے۔ حساب دانی میں مشکل سے کوئی عالم ان کا حریف ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھی عربی، فارسی اور اردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ بات چونکہ جچی تلی کہنے کے خوگر تھے اس بناء پر ان کی تقریر اگرچہ پرمغز اور مدلل ہوتی تھی لیکن ہنگامہ آفریں اور ولولہ انگیز نہیں ہوتی تھی۔ بزمِ احباب میں ایک بذلہ سنج مگر باوقار و متین یار شاطر اور اربابِ معاملہ کی مجلس میں ایک غائر النظر مدبر و مفکر تھے۔ اس حیثیت سے ان کی زندگی بے شبہ علومِ دینیہ کے علماء و طلبا کے لیے ایک کامیاب نمونۂ عمل اور اس بات کی شہادت تھی کہ علومِ عربیہ و اسلامیہ کا ایک بوریہ نشین طالب علم اگر چاہے اور کوشش کرے تو قوم کے عطیات اور چندوں سے، سرکاری ملازمت وغیرہ کی غلامی سے بے نیاز ہو کر اپنی دنیوی زندگی بھی ایک معیاری اور خوشحال زندگی بنا سکتا ہے۔

صد حیف! کہ اب یہ بزرگ صورتیں، یہ علم و عمل کی جیتی جاگتی شکلیں، اسلام کی دیرینہ روایات کی حامل و علمبردار یہ شخصیتیں اپنوں

اور پرایوں کا غم کھانے والی اور بنی نوع انسان کی ہمدرد و غمگسار یہ ہستیاں روز بروز عنقا ہوتی جارہی ہیں۔ اور ایک وقت آئے گا کہ لوگ ان صورتوں کے دیکھنے کو ترسیں گے۔ بطن ارضی کا خزانہ ان سے مالامال ہوگا لیکن مادر گیتی کی کوک ان سے خالی ہوگی۔ آئندہ نسلیں تاریخ کے صفحات میں ان کے تذکرے پڑھیں گی لیکن ظہر ارض پر ان کی سی ایک صورت وسیرت بھی نہ ملے گی۔ اللّٰھم اغفره وارحمه رحمة واسعة وامطر عليه شآبيب لطفك السنى وكرمك الهنى تامةً و كاملةً:□□

قطعہ تاریخ وفات

چل دیئے حیف مفتیٔ اعظمؒ — جامع صد کمال عقل و نقل
ہاتف غیب نے کہی تاریخ — بجھ گئی آہ آہ شمع فضل

۱۴۰۲ھ

ملتان جیل میں حضرت مفتی صاحب کا علمی شاہکار

جناب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی فاروقی، امروہی

مفتی اعظم نمبر کے لیے سوچتا تھا کہ کچھ لکھوں مگر مجھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات اقدس سے ایسی نزدیکی حاصل نہ تھی کہ میں ان کی سیرت کا تفصیلی مطالعہ کر سکتا۔ نہ براہ راست معتد بہ عرصہ تک علمی استفادہ کا موقع مل سکا کہ میں ان کی زندگی کے کسی پہلو پر سیر حاصل روشنی ڈال سکوں۔ ہاں جمعیۃ علماء کے کئی اجلاسوں میں حضرت مفتی صاحبؒ کو دیکھا۔ مجلس مضامین میں ان کی باتوں کو سنا۔ ان کے متعدد فتاویٰ نظر سے گزرے۔ اور ان کی ذکاوت و ذہانت، تقویٰ و لیانت اور معاملات کی صفائی کے واقعات دوستوں اور بزرگوں سے سنتا رہا۔ جس کی وجہ سے میرے قلب میں ہمیشہ ان کی عظمت و محبت جاگزیں رہی۔ سب سے پہلے ۲۹ء میں مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ کے دستار بندی کے جلسہ میں ان کو دیکھا۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحب مدظلہ کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔

دستار بندی کے جلسہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے عام مجمع کے اندر بھی تقریر فرمائی تھی۔ میں اس وقت ابتدائی تعلیم پا رہا تھا۔ لیکن میں نے اس وقت حضرتؒ کی تقریری خصوصیت کا جو اندازہ لگایا تھا آخر تک درست نکلا۔ اور وہ یہ کہ اگر ان کی تقریر کو من و عن لکھ لیا جائے تو قلم بند ہونے کے بعد وہ ایک مستقل مضمون کی شکل میں نظر آئے۔ حشو و زوائد کا نام و نشان بھی نہ ہو۔ یہ بات مقررین میں بہت کم حضرات کو نصیب ہوتی ہے۔

دستار بندی کے جلسہ میں چونکہ جمعیۃ علماء کے صدر و ناظم دونوں تشریف لائے تھے۔ اس لیے اہل امروہہ نے جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس عام کی بات چیت ابتدائی درجہ میں ان حضرات سے کر لی تھی۔ بالآخر درخواست منظور ہوئی اور امروہہ کی سرزمین پر ایک تاریخی اجلاس حضرتؒ کی آمد کے طفیل میں منعقد ہوا۔ ایک مرتبہ جب ایک کتاب "نفحۃ العرب" کی طباعت کے سلسلہ میں دہلی گیا کتاب کا نام کس طرز کا ہو، آیا سادہ رسم الخط میں یا طغریٰ کے طریقہ پر؟ حضرتؒ نے کئی طریقہ پر نام اپنے دست خاص سے لکھ کر جس طرز کو تجویز فرمایا اسی کے مطابق عمل در آمد کیا گیا۔ کتاب کی کاپیاں میرے ہمراہ تھیں اپنی نظم کی کتابت کو ملاحظہ فرمایا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جبکہ میں نے یہ کمال مشاہدہ کیا کہ حضرتؒ نے ایک سرسری نظر تمام صفحہ ڈال کر فوراً ایک زبردست غلطی کا پتہ چلا لیا۔ اور اس غلط لفظ کو کاٹ کر حاشیہ پر صحیح لفظ بنایا۔ اور فرمایا کاتب نے اس مصرعہ میں "ینا غی" غلط لکھ دیا ہے۔ "یغانی" ہونا چاہیے۔ مصرع یہ ہے:

وكم بين حرٍّ اذ يغاني غزالةً

میری معلومات بہت محدود ہیں لیکن اس ناقص اور محدود معلومات کے مطابق اگر تمام اوصاف قلمبند کروں تو ایک مستقل رسالہ بن جائے۔ فی الحال مفتی اعظم نمبر میں شرکت کے لیے حضرت مفتی صاحبؒ کی عربی نظم کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ یہ نظم خود ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ نظم ملتان سینٹرل جیل کی یادگار ہے۔ یہ نظم عید کے موقع پر سینٹرل ملتان جیل میں لکھی گئی ہے۔ میجر فضل الدین اس نظم کے مخاطب ہیں۔ میجر فضل الدین کے متعلق خود حضرت مفتی صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ عربی سے خوب واقف اور بہت قابل آدمی تھے۔ اس نظم کا جواب انھوں نے عربی نثر میں حضرت مفتی صاحبؒ کو لکھا تھا۔

ترجمہ سے پہلے اتنا اور عرض کر دوں کہ اس نظم میں حضرت مفتی صاحبؒ نے جس فصاحت و بلاغت کو استعمال فرمایا ہے اور جس مؤثر اسلوب سے اپنے جذبات کو ظاہر کیا ہے اس کا اندازہ اصلی نظم سے ہی ہو سکتا ہے۔ میں اپنے ترجمہ میں وہ تاثیر کہاں سے لاؤں جو عربی نظم میں

کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔

اصل نظم از دل خیزد بر دل ریزد کا صحیح صحیح مصداق ہے۔ سچ ہے:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اس نظم کی وجہ تصنیف یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب ملتان جیل میں ہیں۔ عید آئی ہے۔ پوری رعنائی کے ساتھ۔ مسرت اس کے جلو میں ہے عیش وسرور اس کے ہم رکاب ہے لیکن تمام مسرت پاشیاں جیل کے باہر ہی ہیں۔ جیل میں ایک ضعیف اور بیمار انسان اہل وعیال سے دور اعزاء و اقرباء سے مہجور بیٹھا ہوا ہے۔ نہ وہ عید کی نماز باجماعت ادا کر سکتا ہے نہ اپنے بیوی بچوں سے مل سکتا ہے۔ ایسی حالت میں دل پر جو گزرتی ہوگی اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے قید وبند کے مصائب جھیلے ہیں، قید کی حالت میں راحت کہاں۔ لیکن اگر راحت کے ظاہری سامان مہیا بھی کر دیے جائیں تب بھی قلب کا وہ چین کہاں نصیب ہو سکتا ہے جو گھر بار کی یاد آوری میں برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

ہزار اسباب راحت ہوں اسیری پھر اسیری ہے
قفس میں آہی جاتا ہے خیال آشیاں پھر بھی

حضرت مفتی صاحب" میجر فضل الدین (جو کہ جیل کے افسر تھے) کو تہنیت عید بھیجتے ہیں اور اس میں اپنے سچے جذبات کا پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی حمیت اسلامی اور حریت طلبی اور اپنے بلند نصیب العین کو ظاہر فرما رہے ہیں۔ اور اسی ضمن میں یہ بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ "الدین النصیحة" کو پیش نظر رکھ کر میجر فضل الدین کو بھی ضروری نصیحت فرمائیں۔ میں پچیس اشعار میں سے صرف چودہ کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔ شروع میں بطور تمہید چند اشعار ہیں جن میں میجر فضل الدین کو عید کی مبارکباد پیش کی ہے اس کے بعد فرماتے ہیں:

اذا العیدُ یاتی المرأ والمرأ محتظٍ
باھلٍ و مغنیً اورثَ اللطف والھنا

جب عید آتی ہے ایسی حالت میں کہ انسان اہل وعیال اور گھر بار سے بھی محظوظ ہو رہا ہو تو بڑی خوشگوار و مسرت بخش ہوتی ہے۔

ولکنّہٗ ان حلّ والسجن مؤصَدٌ
علی المرأ لم یورث سوی الحزن والشجی

لیکن جبکہ عید اس حال میں آئے کہ انسان قید خانہ میں محبوس ومقید ہو تو عید سوائے رنج وغم کے اور کچھ نہیں پہنچاتی۔

وکم بین حرٍ اذ یغانی غزالۃً
وبین المعانی محنۃ السجن والعنا

بہت بڑا فرق ہے اس شخص میں جو بیوی بچوں میں آزادانہ زندگی بسر کر رہا ہو اور اس شخص میں جو قید خانہ کی مصیبت جھیل رہا ہو۔

وکم بین حرّ قرّ عیناہ بالھویٰ
وبین اسیرٍ یصطلی ضرمنۃ النویٰ

بہت بڑا فرق ہے اس شخص جو من بھاتی چیزوں سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے اور اس شخص میں جو جدائی کی آگ سے ہاتھ تاپتا ہے۔

ولکننا قوم نلاعب بانطبیٰ
و نقلی ظباء اذ تداعت الی الونیٰ

لیکن ہم تلوار کی دھار سے کھیلنے والی قوم ہیں۔ ہم بگڑ جاتے ہیں غزالہ صفت بیویوں سے جبکہ وہ مداہنت کی دعوت دیتی ہیں۔

و نحن کرام نملك الخیر فی الندیٰ
و نحن لیوث نحسم الشرّ فی الوغیٰ

اور ہم شریف و نجیب ہیں داد و دہش کے وقت مال ہمارے ہاتھ میں ہوتا ہے اور شیر ہیں جو جنگ میں شر و فساد کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔

ابینا اباء اللیث ذُلَّ التعبدِ
فلاسبۃ اخزیٰ من الذلِّ للعِدیٰ

ہم نے غلامی کی ذلت قبول کرنے سے شیر کی طرح انکار کر دیا۔ دشمن کے سامنے جھکنے سے زیادہ عار کی کوئی بات نہیں۔

حُبِسْنا واوذینا بغیر جریمۃ
فما ذنبنا الا الدفاع عن الحمیٰ

ہم بلا کسی جرم کے قید کیے گئے اور ایذا دیئے جا رہے ہیں۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ وطن عزیز سے دشمن کو نکالنا چاہتے ہیں۔

بلوح تربت ماپا فتند از غیب تحریرے
کہ ایں مظلوم را جز بے گناہی نیست تقصیرے

وان غاشم عدّ الدفعَ جریمةً
فانا نریٰ ھذاك من سودد الفتیٰ

اگر ظالم (انگریز) نے دفاع کو جرم قرار دیا ہے تو ہم اس کو عین عزت خیال کرتے ہیں۔

و ان خاننا الدھر الغشوم فلاتکن
یداً لخوّنٍ واقف حقاً اذا انجلیٰ

اگر ظالم اہل زمانہ نے ہمارے ساتھ خیانت کی ہے تو اے فضل الدین جب حق تمہارے سامنے واضح ہو گیا ہے تو خائن کے مددگار نہ بنو۔

فانت کریم ابن الکریم ولم نجد
کریماً معیناً للذی جارو اعتدیٰ

تم کریم ابن کریم ہو اور ہم نے کسی کریم شخص کو ظالم و جابر کا معین و مددگار بنتے نہیں دیکھا۔

نریٰ الاسر لاحرِّ الوفی کرامةً
وان کان رجزاً للمواقع فی الخنا

ہم قید کو احرار کے لیے کرامت تصور کرتے ہیں۔ اگرچہ اخلاقی مجرم کے لیے قید عذاب ہوتی ہے۔

و ما السجنُ للمظلوم الا عطیةً
یَمُنّ بھا المولیٰ علی عبدٍ اصطفیٰ

جیل خانہ مظلوم کے لیے ایک عطیہ ربانی ہے جس کو وہ اپنے کسی منتخب بندے کو ہی عطا کرتا ہے۔

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں
یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
(ایضاً)

شہپر زاغ و زغن زیبائے قید و بند نیست
ایں سعادت از پئے شہباز و شاہیں کردہ اند

فیا ربّ تثبیتاً و صبراً علیٰ البلا
و یاربّ عوناً و انتصاراً من العدیٰ

اے اللہ! ہمیں ثابت قدم رکھ اور بلاؤں پر صبر نصیب فرما۔ ہماری مدد فرما اور دشمنوں سے ہماری طرف سے خود ہی انتقام لے لے۔

قطعہ بہ صنعت ضرب وجمع کہ پانچ تاریخیں بر آمد ہیں

رقم طراز از بندہ محمد ادریس نسیمؔ دہلوی کان اللہ لہ

مفتی اعظم ، شیخ یگانہ، مردِ مجاہد، فخر زمیں
موت ہے ان کی ، موت جہاں کی، آپ ہی خود تھے اپنی مثیل

فردِ جہاں	و	مہر زماں	عقل مجسم	و	اہلِ وقار
۳۴۳=۱۳۷۲ھ		۳ ۴ ۳	۳ ۴ ۳		۳ ۴ ۳
۴		۴	۴		۴
۱۳۷۲ھ		۱۳۷۲ھ	۱۳۷۲ھ		۱۳۷۲ھ

چاروں کا ماتم چار طرف ہے جس سے ہے ظاہر سالِ رحیل

مجلس تحفظ ناموس شریعت اور حضرت مفتی اعظمؒ

اس دنیائے فانی میں یوں تو آنے اور جانے کا سلسلہ روز ازل سے ہی قائم ہے لیکن بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے اس دنیا سے سدھار جانے پر پوری عالم انسانیت متاثر ہوتی ہے۔ مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ جو اپنی عالمانہ بصیرت اور بزرگانہ شفقت سے نہ صرف مسلمانان ہند کی بلکہ پورے عالم اسلام کی خدمت پر مامور رہے۔ ایک ایسی عظیم شخصیت کے مالک تھے جنھوں نے جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے ابنائے وطن کی خدمت کی۔ یوں تو مفتی اعظم کی علمی اور فقہی خدمات کا دائرہ وسیع ہے جس کا اس مختصر سے مضمون میں احاطہ نہیں کیا جاسکتا تاہم مجلس تحفظ ناموس شریعت کے حوالے سے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، وہ رہتی دنیا تک یاد کی جاتی رہیں گی۔

ملک ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا تو مسلمانوں کے سامنے مختلف طرح کے مصائب اور مسائل تھے۔ تقسیم وطن کا نعرہ لگانے والے یہاں سے جاچکے تھے۔ مسلمانوں کے کارواں کی باگ ڈور اب جمعیۃ علماء ہند کے ہاتھ میں تھی اور اس کے سپہ سالار حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ تھے، جو اپنی سادہ زندگی اور علمی تبحر کے سبب ہر ایک کے دل میں جگہ پائے ہوئے تھے۔ لیکن انھوں نے کبھی بھی مفادات کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا بلکہ وہ زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکے قند۔

۲۲ر اپریل ۱۹۳۰ء کو قصہ خوانی بازار پشاور میں برطانوی حکومت نے سرحد کے غیور پٹھانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے۔ سینکڑوں جوان شہید ہوئے تو جمعیۃ علماء ہند کے صدر مولانا مفتی محمد کفایت اللہ ایک وفد لے کر ظالم سامراجی حکومت کے خلاف تحقیقات کے لیے گئے مگر حکومت نے اس وفد کو جائے واردات پر جانے سے روک دیا تو آپ نے راولپنڈی میں قیام کیا اور وہاں کی رپورٹ مکمل کی۔

۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی میں جمعیۃ علماء کے صدر مولانا مفتی محمد کفایت اللہ اور اس کے ناظم اعلیٰ مولانا احمد سعید دہلوی کو قانون تحفظ عامہ وسفارت کے جرم میں گرفتار کرکے قید بامشقت کی سزا دی۔

۱۹۵۳ء میں لکھنؤ میں علمائے دہلی کی جو کانفرنس ہوئی، اس میں بعض مجبوریوں کے باعث شریک نہ ہوئے مگر آپ نے فرمایا کہ:

"لکھنؤ میں امتناع مدح صحابہ کے سلسلے میں جو قیامت خیز مظالم برپا ہیں، ان کی ذمہ داری حکام کے ناعاقبت اندیشانہ رویے پر ہے۔ صحابہ کرام میں مدح وثنا پر قانونی پابندی عائد کرنا ایک کھلی ہوئی غلطی ہے۔"

ستمبر ۱۹۲۹ء میں سارد ا ایکٹ کے ذریعے حکومت نے اسلامی قانون ازدواج میں مداخلت کی کوشش کی۔ اس ایکٹ میں کم عمری کی شادی کو جرم قرار دیا گیا تھا۔ اس موقع پر جمعیۃ علماء ہند نے اس ایکٹ کی شدید مخالفت کی۔

مرسلہ: عبدالوکیل امینی

مفتی اعظم کی زندگی کا ایک ورق

جناب فتح چند صاحب نسیم

حیاتِ انساں ہے شمع صورت ابھی ہے روشن ابھی فسردہ
نہ جانے کتنے چراغ یونہی جلا کریں گے بجھا کریں گے

اگر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیں تو اس میں ہندوستان کو پنجۂ اغیار سے چھٹکارہ دلانے میں لاتعداد علمائے کرام کی قربانیاں مستقل اور سنہری باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگرچہ اس وقت عوام کی بے حسی اور سرد مہری نے شمع وطن کے پروانوں کی جاں نثاریوں کو عروسِ کامیابی سے ہمکنار ہونے کا موقع نہ دیا اور ان کی بیل منڈھے نہ چڑھنے دی، لیکن اس ارضِ مقدس کے لیے ان کا بہایا ہوا خون رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ اور ان کی جدوجہد بیکار ثابت نہ ہوئی۔ ۱۹۱۹ء میں جب دوسری جنگِ آزادی چھڑی اور تحریکِ خلافت کی بھی ابتداء کی گئی تو لاکھوں برادرانِ ملّت کے دلوں میں حکومت غیر کے خلاف احساسات، جذبات بیدار ہونے میں دیر نہ لگی۔ اور وہ ایک دم مادرِ وطن کو برطانوی اقتدار سے نجات دلانے کے لیے کمربستہ و مستعد ہوگئے۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کی قائمی بھی اسی سلسلہ کی ایک شاندار کڑی ہے جس کی بے غرضانہ اور بے لوث قربانیاں تاریخ آزادی کا ایک عدیم النظیر اور قابل فخر حصہ ہیں۔ یقیناً یہ جماعت ہر دل عزیز و مقبولِ عام ہرگز نہ ہو سکتی اگر شیخ الہند (قدس سرہ) شیخ الاسلام کی مساعی جمیلہ اور مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مرحوم ایسے بلند پایہ حضرات کی مخلصانہ سرگرمیاں اور انہماک شامل حال نہ ہوتا۔

قید و بند کے مرحلے

ہندوستان بھر کی تمام قومی جماعتوں میں یہ امر خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ مفتی اعظم صاحب ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۹ء تک متواتر اور مستقل صاحب صدر رہے۔ اور سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب بھی بیس سال لگاتار ان کے ہمرکاب ناظم اعلیٰ رہے اور پھر مفتی اعظم صاحب گرفتار ہو کر چھ ماہ کے لیے گجرات (پنجاب) جیل میں بند کیے گئے تو سحبان الہند صاحب بھی گجرات جیل میں آپ کے ساتھ رہے۔ اسی طرح جب ۳۲ء میں آپ دوسری بار ملتان جیل بھجوائے گئے تو یہاں بھی سحبان الہند آپ کی رفاقت کا دم برابر بھرتے رہے۔ بلاشبہ قید و بند کے یہ تمام مرحلے خندہ پیشانی سے طے کیے۔ اور ان سختیوں نے متحدہ قومیت کی پرورش اور وطن عزیز کی آزادی کے جذبہ میں آپ کو زیادہ اُستوار اور استحکام بخشا۔ بقول کسے

ہزاروں سختیاں سنگِ مزاحم بن کے آتی ہیں
مگر مردانِ حق اس بات کی پروا نہیں کرتے
مصائب جھیلتے ہیں اور طوفانوں سے لڑتے ہیں
صداقت کیش بندے حق کی خاطر کیا نہیں کرتے

انیس کا زمانہ

۱۹۱۹ء میں جب جمعیۃ علماء ہند کی پہلی کانفرنس آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ امرتسر کے شانہ بشانہ ہوئی، تو یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپ کی پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ ہندوستان نے ہوم رول دیئے جانے کے وعدہ پر اتحادیوں کی امداد میں اپنے ملک کی اجناس اور قومی سرمایہ کے علاوہ لاکھوں نونہالانِ وطن بھینٹ کیے تھے۔ لیکن برطانوی حکومت نے ہوم رول کی بجائے رولٹ ایکٹ دے دیا تھا جس سے ہندوستان کی رہی سہی آزادی کا گلہ گھٹ گیا۔ تمام خوشگوار امیدیں مایوسیوں میں بدل گئیں۔ خود مختاری کے سہانے خواب مٹی میں مل گئے۔ انگریزوں کی اس طوطا چشمی، وعدہ شکنی خلاف توقع کجروی اور ریاکارانہ پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سخت غصہ اور

ناراضگی کی لہر پھیل گئی۔ چنانچہ اسی ماحول میں کانگریس اور جمعیۃ کے سالانہ اجلاس امرتسر ایسے قدیمی اور تاریخی شہر میں خوب جوش و خروش سے ہوئے۔ جلیانوالہ باغ اپنے واقعہ پر ہندوستان کے علمائے کرام اور کانگریس کے سیاسی لیڈروں نے مشترکہ اور متحدہ طور پر فرنگی استعماریت کو بیخ و بن سے اُکھیڑنے کے لیے پروگرام طے کیے۔

کانگریس کے سالانہ اجلاس کے پریزیڈنٹ پنڈت موتی لال نہرو (پردھان منتری نہرو جی کے والد محترم) اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی تھے۔ (دوسری نشست کے لیے آپ کا ہاتھ مفتی اعظم صاحب نے بھی بٹایا تھا) دونوں جماعتوں نے ملک کے سامنے ہر شعبہ میں ٹکر لینے کا لائحہ عمل رکھا، جس پر عمل کرتے ہوئے فرزندانِ وطن ایک ساتھ غیر ملکی حکومت کا نشانۂ عتاب بنتے رہے۔

ان دنوں مسلم لیگ نے بھی ہر دو جماعتوں کا پورا پورا ثبوت یگانگت دیا تھا۔ چنانچہ اس کا سالانہ اجلاس بھی امرتسر ہی میں زیر صدارت حکیم اجمل خاں صاحب منعقد ہوا تھا۔ حکیم صاحب موصوف نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پہلی بار ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کرنے کی غرض سے اپنے خطبۂ صدارت میں آنے والی بقر عید کے موقع پر گائے کی بجائے بکرے کی قربانی دینے کی اپیل کی تھی۔ حکیم صاحب کی اس تحریک کا اثر آپس کے تعلقات پر بہت خوشگوار پڑا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوؤں نے خلافت اسلامی کے سلسلے میں بیش بہا قربانیاں پیش کی تھیں اور مسلمانوں نے بھی قربانی گاؤ ترک کر کے ہندوؤں کے دلوں اور آنکھوں میں جگہ حاصل کی تھی، مگر غیر ملکی حکمرانوں نے ہندو مسلمانوں کے اس بڑھتے ہوئے اتحاد سے خوفزدہ ہو کر اپنی قدیم عیاریوں کو بروئے کار لانا اپنا فرض مقدس سمجھا۔ اور مسلمانوں کی سرکار پرست جماعتوں کے افراد نے تعصبات کو بھڑکانے میں سر تاپا کوششیں کیں۔ تاکہ مندرجہ بالا تین قومی جماعتوں کے نصب کیے ہوئے سنگ بنیاد پر قومی اتحاد کی پھر ایک عظیم الشان عمارت تعمیر نہ ہونے پائے۔

یہی وہ زمانہ تھا جسے سیاسی زندگی کا نصف النہار کہہ سکتے ہیں۔

مفتی اعظم صاحب کی دوراندیشانہ کارگزاریوں کی بدولت یہ اظہار کم قابلِ فخر نہیں کہ کانگریس نے تو کامل آزادی کا ریزولیوشن ۱۹۳۰ء میں لاہور بر لب راوی پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں پاس کیا تھا، مگر جمعیۃ علماء ہند نے روزِ پیدائش سے مکمل آزادی کو اپنا نصب العین بنا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ جمعیۃ کا یہ اقدام بھی نہایت مستحسن تھا کہ جب کانگریس نے تمام سرکاری خطابات چھوڑ دینے کا اعلان کیا تو حکیم اجمل خاں صاحب نے (اپریل ۲۰ء میں) اپنا خطاب "حاذق الملک" اور تمغہ قیصر ہند گورنمنٹ آف انڈیا کو واپس کر کے حکومتِ وقت کے جبر و تشدد کے خلاف اپنے رنج و بیزاری کا عملی ثبوت دیا تھا۔ اس کے چند روز بعد جمعیۃ علماء ہند نے اپنے کانپور کے اجلاس میں حکیم صاحب موصوف کو اپنے متفقہ فیصلہ سے مسیح الملک کا قومی خطاب دے کر ان کی قدر و منزلت کو چار چاند لگائے۔

مسلم لیگ تو چند ہی سالوں بعد انگریزوں کے دام فریب کا شکار ہو گئی۔ مگر جمعیۃ علماء ہند نے کسی قیمت پر بھی انگریزوں کی چال میں آنا قبول نہ کیا کیونکہ اس کے صاحبِ صدر مفتی اعظمؒ صاحب اور ناظم اعلیٰ سحبان الہند تھے، جو فولادی دل و گردہ کے مالک اور ان ہر دو حضرات میں انگریزی اقتدار پر کاری چوٹیں لگانے کی بچی تڑپ تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ جب کبھی چرچل پارٹی یا اس کے مریدان کرام کی طرف سے آل انڈیا نیشنل کانگریس کو ایک ہندو جماعت قرار دینے کا غوغا بلند ہوتا تو کانگریس ان کی تردید میں مولانا آزاد، شیخ الاسلام، مفتی اعظم، حکیم اجمل خاں صاحب، ڈاکٹر انصاری صاحب، علی برادران، فخر افاغنہ، عبدالغفار خاں (سرحدی گاندھی) اور سیّد عطا اللہ شاہ صاحب بخاری کے نام نامی کا اظہار کرتی ہوئی جمعیۃ علماء ہند جرگہ خدائی خدمت گاران، انجمن احرار اور دوسری مسلم قومی جماعتوں کے دلی تعاون کا ثبوت پیش کرتی مگر یہ نہایت رنج دہ بات ہے کہ ہندوستان کی جبری تقسیم سے خدائی خدمت گاروں اور انجمن احرار کے مقتدر رہنمایان اور کارکنان سے پاکستان کی مسلم لیگی حکومت انگریزوں سے بدترین سلوک روا رکھ رہی ہے، جو آج کسی سے پوشیدہ نہیں۔ خان برادران تو خصوصیت سے ان کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق

بنے ہوئے ہیں۔

تیس کا زمانہ

سرحدی گاندھی کے دیش یعنی پشاور میں جمعیۃ علماء کے ایک ناقابلِ فراموش اور عظیم الشان جلسہ کے بعد سرحد کے غیور پٹھانوں اور خدائی خدمت گاروں نے شراب اور بدیشی کپڑوں کی دوکانوں پر زبردست پکٹنگ کی جس پر انگریزی حکومت نے کھسیانا ہو کر بے تحاشا گولی چلادی اور قصہ خوانی بازار میں نہتے اور پرامن لوگوں کو اندھا دُھند موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ شہید ہونے والے لوگ جمعیۃ کی شمعِ ہدایت کے پروانے اور کانگریس کے سرچشمہ سے آبِ حیات پئے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ چال بازار اور سر فروش سامراجی ظلم و ستم کی آتش فشانی اور خونریزی کا جام شہادت بصد شوق و ذوق لنڈھاتے رہے اور مرتے مرتے بھی "انقلاب زندہ باد" اور "بادشاہ خاں زندہ باد" کے نعرے بلند کرتے رہے۔ اس روح فرسا اور خونچکاں واقعات کی تحقیقات کے لیے آل انڈیا نیشنل کانگریس نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جس کے ارکان صدر پٹیل اور مفتی اعظم صاحبؒ تھے۔ صوبہ سرحد کے فرعون مزاج گورنر نے اس کمیٹی کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ راولپنڈی میں بیٹھ کر تحقیقات مکمل کی گئی۔ یہ رپورٹ ہر پہلو سے مستند اور انگریزوں کے اخلاق و انصاف کی ننگی تصویر تھی۔ اس لیے گورنمنٹ آف انڈیا نے رپورٹ مذکور ضبط قرار دیدی، لیکن جو حصے بھی عوام کے سامنے آسکے، ان حصوں پر مفتی صاحب کی قابلیت اور افضلیت کا اعتراف ہر ایک نے کیا۔

ہندوستان مولانا محمد مفتی کفایت اللہ صاحب کے تبحر علمی، اصابت رائے، خداداد قوتِ حافظہ، بلند فکری اور دُوراندیشی کا تو گرویدہ تھا ہی، مگر بیرونی اسلامی ممالک بھی ان کے کم مداح نہیں تھے۔ چنانچہ آپ کو ۱۹۳۸ء میں سلطان ابن سعود کی مؤتمر اسلامی اور پھر مصر کی مؤتمر اسلامی میں شامل ہونے کا فخر حاصل ہوا۔

مصر کی مؤتمر اسلامی میں صدہا علماء اور فضلاء کے شریک ہونے کے باوجود اس کی کرسی صدارت آپ ہی کو سونپی گئی۔ مگر آپ اتفاقاً بیمار ہوگئے۔ اور از ہر یونیورسٹی قاہرہ کے شیخ الجامع بہ نفس نفیس آپ کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ الغرض آپ کی ذات گرامی کے اوصاف آپ کی بیش بہا خدمات مادرِ وطن کے پاؤں سے بیڑیاں کاٹنے کی مساعی جمیلہ اور تہائی صدی سے زائد عرصہ تک یعنی مرتے دَم تک حب الوطنی اور قوم پرستی کا دَم بھرتے رہنا کیونکر بھلایا جاسکتا ہے۔ آپ کے طویل ترین کارناموں کو ان چند سطور میں بیان کیا جاسکے، یہ از حد ناممکن ہے اس لیے میں اپنے قلم کو یہیں روکتا ہوں۔ اور بدرگاہِ ایزدی دست بدعا ہوں:

تیری رحمت سے الٰہی پائیں یہ رنگ قبول
پھول کچھ میں نے چنے ہیں ان کے دامن کیلئے

قطعہ تاریخ وفات حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ

مرزا سلطان بیگ صاحب سلطاںؔ، دہلی

تاریخ وفاتِ مفتی پوچھی جو کسی نے مجھ سے
ہاتف نے کہا اے سلطاںؔ تیرہ سو بہتر گن دے

۱۳۷۲ھ

مفتی اعظمؒ اور سحبان الہندؒ

ایک استاد اور ایک شاگرد

جنھوں نے رفاقت کا حق ادا کردیا

از: مولانا حفیظ الرحمٰن واصف

دلّی کی خاک سے جو چند باکمال ہستیاں اٹھیں مولانا کی ہستی ان میں سے ایک باکمال ہستی تھی۔ صورت شکل کے لحاظ سے بھی مردانہ حسن کا عمدہ نمونہ۔ اور علم و فضل کے لحاظ سے بھی جوہر قابل۔

میدہ شہاب رنگ۔ طوطے کی چونچ کی سی کھڑی ناک۔ چوڑا چکلا وجیہ اور مسکراتا ہوا چہرہ پیشانی اونچی اور روشن، قدو قامت بلند اور بھاری بھرکم، ہر مجلس و محفل میں ممتاز اور جاذب توجہ۔ شیرینی گفتار انداز کلام اور علم مجلسی سے مجمع پر چھاجانے والے۔

خدا بخشے! مولانا بہت سی متضاد صفات اپنے اندر رکھتے تھے۔ پرائیوٹ محفلوں میں شھٹا کر خندار ی انداز کی ظرافت بھی تھی۔ اور اورو وظائف کا شغل بھی تھا۔ سیاسی مجلس میں عالمی سیاست پر سیر حاصل بحث بھی تھی۔ علمی مجلس میں قرآنی نکات کا بیان اور اسرار و حکم کا انکشاف بھی تھا۔ صوفیا کی محفل میں دقائق تصور کی تحقیق اور عالم جذب و کیف بھی تھا۔ ادبی محفل میں سخن سنجی اور سخن فہمی بھی تھی۔ شاعر بھی تھے۔ شعر کی داد بھی خوب دیتے تھے۔ جنگ آزادی کے میدان میں قید و بند کی مشقت بھی جاری تھی۔ ملکی سیاست کے میدان میں الیکشن بازی کی گھوڑ دوڑ بھی تھی۔ اگرچہ اپنی شیریں بیانی کی دھاک تمام ہندوستان میں بٹھادی۔ اور اپنی ٹھوس خطابت کا لوہا دشمنوں سے بھی منوالیا۔ مگر الیکشن بازی کی گھوڑ دوڑ میں ٹھوکر بھی کھاجاتے تھے۔ عجیب و غریب ہستی تھی مولانا کی۔ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ کہتے نہیں بنتی غم الفت کا فسانہ۔

ابتدائی تعلیم

مولانا نے ہوش سنبھالتے ہی بولنا اور چہچہانا شروع کردیا تھا۔ کچھ زیادہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا کہ وعظ کہنے لگے تھے۔ اَن پڑھ آدمی کا وعظ اور تقریر ہی کیا جن لوگوں کے اندر ذاتی جوہر اور دماغی صلاحیت موجود ہوتی ہے ان کو کسی استاد کامل کا انتساب اور رہبری حاصل نہ ہو تو اکثر وہ بھٹک جاتے ہیں۔ ان کا حوصلہ بے لگام ہوجاتا ہے۔ کس قدر عظیم الشان برکت و سعادت ہے اس انتساب میں۔ اور یہی انتساب تو ہے جس کے بغیر سلسلۂ سند مکمل نہیں۔ رسول عربی فداہ امی وابی سے ہم تک دین کے پہنچنے کا ذریعہ یہی انتساب تو ہے۔

اس منظر کے دیکھنے والے اب بھی یقیناً موجود ہیں جبکہ ایک نوجوان واعظ چاندنی چوک میں فوارے کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوا مخالفین اسلام کے اعتراضات کے جواب دے رہا ہے۔ تقریر میں بڑا زور ہے ایسا زور کہ علماء پر بھی حیرانی چھاجاتی ہے۔

ایک مرد حق آگاہ نے اس بلبل ہزار داستان پر اپنی دور رس نگاہیں ڈالیں۔ بھانپ لیا۔ کھینچ لیا کندن بناکر چھوڑا فوارے کے سامنے سنہری مسجد میں مدرسہ امینیہ تھا۔ اس کے صدر مدرس مولانا مفتی کفایت اللہ تھے۔ ان کے ایک شاگرد مولانا حافظ قاری محمد یاسین سکندر آبادی، مولانا کو ابتدائی کتابیں پڑھانے پر مامور ہوئے۔ پھر باضابطہ داخلہ ہوگیا۔ تعلیم کے دوران میں ہی حضرت مفتی صاحب کی توجہ و تربیت شروع ہوگئی تھی۔

علم مجلسی

اب سے کوئی پچاس برس پہلے کی بات ہے جبکہ مولانا ایک طالب علم کی حیثیت سے مدرسہ امینیہ میں پڑھتے تھے۔ طلبائے مدرسہ کی انجمن اصلاح الکلام کی طرف سے ایک عظیم الشان جلسہ باڑہ ہندو راؤ میں منعقد ہوا۔ بڑا بھاری پنڈال بنایا گیا۔ راقم الحروف کے استاد مرحوم جناب ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی ایک قصیدہ لکھ کر لائے تھے۔ مولانا احمد سعید نے کھڑے ہو کر رسمی تعارف کرایا۔ رسمی اس لیے کہا کہ جلسوں میں دستور ایسا ہی ہے۔ ورنہ سائل صاحب اور ان کے خاندان سے تو دہلی کا بچہ بچہ واقف تھا۔ تعارف کے ساتھ مولانا نے کہا:

"شاہی زمانہ ہوتا تو نواب صاحب جیسے قادر الکلام اور فصیح و بلیغ شعراء کو خلعت ملتے انعامات سے نوازے جاتے۔ ہم غریب طالب علم آپ کو سوائے دعا کے اور کیا دے سکتے ہیں۔"

اس کے بعد نواب صاحب نے قصیدہ پڑھنا شروع کی۔ نواب صاحب نے مجمع کی طرف سے پیٹھ موڑلی۔ اب مولانا ہیں اور نواب صاحب ہیں۔ وہ داد دے رہے ہیں۔ وہ سنائے چلے جارہے ہیں۔ پنڈال بھرا ہوا تھا۔ مجمع میں سے آوازیں آنے لگیں۔ نواب صاحب! نواب صاحب! ادھر بھی! مجمع چیختے چیختے تھک گیا۔ مگر نواب صاحب نے ادھر رُخ نہ کیا۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ اپنے دل میں سوچ رہے تھے کہ کہیں مجمع بے قابو نہ ہو جائے۔ مگر ایک تو یہ کہ نواب صاحب کے علم و فضل اور ان کی خاندانی عظمت سے کون واقف نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ مجمع آج کل کا مہذب اور تعلیم یافتہ مجمع نہیں تھا کہ بے قابو ہو جاتا یا ہونگ کرتا۔ نواب صاحب نے اپنا قصیدہ اسی طرح پورا مولانا کو سنا دیا۔ اور مولانا نے بھی داد و تحسین کا حق ادا کر دیا۔ کیسا اخلاص و محبت سے بھرا ہوا تھا وہ زمانہ!

شاگردی اور تربیت

حضرت مفتی اعظمؒ اور مولانا احمد سعیدؒ کی رفاقت کا زمانہ معمولی زمانہ نہیں ہے۔ یہ پچاس برس کا طویل زمانہ ہے۔ ایک طرف تعلیم و تربیت بھی جاری تھی۔ دوسری طرف تقریر و مناظرہ بھی۔ وہ مناظروں کا دور تھا۔ حضرت مفتی صاحب اپنے ساتھ لے جاکر مولانا کو مناظرے کی مشق بھی کراتے تھے۔ خود معاون بنتے تھے شاگرد مناظرہ کرتا تھا۔ بڑے بڑے معرکے کے مناظرے ہوئے۔ یہ مناظرے اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے مثال مناظرے تھے۔ حضرت مفتی اعظمؒ کی قوت استدلال اور مولانا کی قوت تقریر۔ یہ ایک ایسا عمدہ امتزاج تھا جس کا جواب مناظروں کے دور کی پوری تاریخ میں مشکل ہی سے کہیں دستیاب ہو سکے گا۔

سیاسی دور کی رفاقت

مناظروں کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ہندوستان کی سیاست کا دور شروع ہوا۔ حضرت مفتی صاحب نے جمعیۃ علمائے ہند کی بنیاد ڈالی۔ یہ رفاقت استوار تو ہوتی چلی گئی۔ مولانا احمد سعید ناظم اعلیٰ جمعیۃ علمائے ہند بنائے گئے۔ ہر لمحے کے رفیق۔ ہر کام میں شریک سفر و حضر کے ساتھی۔ زندان میں غمگسار۔ جلسوں میں ترجمان، جلوت میں ہم جلیس، خلوت میں ہم راز غرض کہ زندگی کا کوئی پہلو اور گوشہ نہیں تھا جس میں ان دونوں کی رفاقت نہ پائی گئی ہو۔ عیدین میں عیدگاہ بھی دونوں ساتھ ہی جایا کرتے۔

مرقع رفاقت

ابھی چند روز ہوئے مولوی مشہود حسن صاحب مدرسہ امینیہ نے مجھ سے اپنا خواب بیان کیا۔

"میں خواب دیکھ رہا ہوں کہ حضرت مفتی صاحب مولانا احمد سعید کا ہاتھ پکڑے ہوئے لے جارہے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب بہت تندرست اور تنومند معلوم ہو رہے ہیں۔ مولانا کچھ کمزور اور لاغر ہیں۔ راستے میں جہاں نالیاں آتی ہیں حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں۔ دیکھو نالی ہے۔ مولانا کا قدم نالیوں پر اس طرح پڑتا ہے کہ ایک کنارے پر ایڑی اور دوسرے کنارے پر پنجہ غرضکہ اسی طرح سہارا دیتے ہوئے اور ٹوکتے ہوئے حضرت مفتی صاحب مولانا کو لے جارہے ہیں۔"

مولوی صاحب موصوف کا خواب سن کر میں پھڑک اٹھا اور

بیساختہ زبان سے نکلا "کھینچ کر لے ہی گئے۔" خواب کیا ہے دونوں کی رفاقت کا ایک مکمل اور سچا مرقع ہے۔ رہبر صادق اور استاد کامل ہو تو ایسا ہو۔ یہ رہنمائی مولانا کے لیے زندگی میں بھی شمع راہ بنی رہی اور اب عالم برزخ میں بھی منارۂ منزل ثابت ہوئی۔ اور عالم ظاہر میں دونوں کی قبروں کے درمیان بھی کوئی فاصلہ نہیں۔

کردار کی رہنمائی

حضرت مفتی اعظمؒ کے کردار سے مولانا کی زندگی کس حد تک متاثر ہوئی؟ اس کا جائزہ لینا تو میرے موقف سے بالاتر ہے۔ البتہ قدم قدم پر ان کی رہنمائی ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے۔ ابوالغیاث شیخ کریم الدین صاحب میرٹھی جو ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۵-۱۶ برس تک جنوبی ہند میں بطور سفارت جمعیۃ علمائے ہند کی خدمات انجام دیتے رہے۔ بیان فرماتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی کے موقع پر جمعیۃ علماء پر ایسا تنگی کا وقت آیا کہ فنڈ میں روپیہ بالکل نہ تھا۔ کئی ماہ کی تنخواہیں چڑھ گئیں اور تحریک کو جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔ پنڈت موتی لال نہرو جو دہلی آئے ہوئے تھے اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں قیام پذیر تھے ان کا پیغام آیا کہ لاکھ دو لاکھ جس قدر روپیہ کی ضرورت ہو ہم کانگریس کے فنڈ سے دینے کے لیے تیار ہیں۔ آپ تحریک کو جاری رکھئے۔ مولانا اُس وقت ناظم اعلیٰ تھے۔ یہ پیشکش قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ اور اس میں بظاہر کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ کیونکہ کانگریس کا فنڈ تمام فرقوں کا مشترک فنڈ تھا۔ حضرت مفتی اعظمؒ گرفتار ہو چکے تھے اور اُس وقت تک دہلی جیل میں ہی تھے۔ اس سلسلے میں جب آپ سے مشورہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

"جنگ آزادی کے میدان میں ہم کسی دوسرے سہارے پر نہیں کھڑے ہوئے ہیں۔ استخلاص وطن کی جدوجہد ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ اگر ہم جماعت کو نہیں چلا سکیں گے تو دفتر کو بند کر دیں گے۔"

کیا ہے کردار؟ اور کیا چیز ہے کردار کی بلندی؟ آؤ! دیکھو! یہ ہیں ہمارے اسلاف! جن کی مثال زمانہ کبھی پیش نہیں کر سکے گا۔

میاں سر فضل حسین وزیر تعلیم پنجاب جو وائسرائے کی کونسل کے ممبر بھی تھے۔ انھوں نے حکومت برطانیہ کی طرف سے حضرت مفتی اعظمؒ کو یہ پیغام پہنچایا کہ:

"حکومت برطانیہ یہ درخواست کرتی ہے کہ آپ سیاسی تحریکات سے کنارہ کش ہو جائیں اس کے صلے میں حکومت آپ کو بطور ہدیہ مدرسہ صفدر جنگ کی شاہی عمارت اور اس کا ملحقہ میدان پیش کرے گی اور آپ کی ذات خاص کے لیے ہبہ کر دے گی۔ ہمارا یہ مقصد نہیں کہ آپ حکومت برطانیہ کی حمایت یا پروپیگنڈا کریں۔ نہیں بلکہ آپ صرف اتنا کریں کہ خاموش رہیں اور سیاسیات سے الگ رہیں۔"

یہ ایک رازدارانہ پیغام تھا جو والد مرحوم نے بڑے رازدارانہ انداز میں مجھ سے بیان کیا تھا۔ اور آج پہلی مرتبہ صفحۂ قرطاس پر آرہا ہے۔ حضرت نے جواب دیا:

"میں آزادیٔ وطن کی تحریک میں اپنی ذاتی منفعت کے لیے شریک نہیں ہوا ہوں۔ آپ کی پیشکش کا شکریہ! کوئی لالچ میرے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔"

ابوالغیاث صاحب فرماتے ہیں کہ جنگ آزادی کے پورے دور میں صرف تین آدمی ایسے دیکھے جنھوں نے تحریکات کے سلسلے میں سیکڑوں سفر کیے۔ مگر مصارف سفر ہمیشہ اپنی جیب سے ادا کیے۔ حکیم اجمل خاں۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ اور حضرت مفتی اعظمؒ مولانا کفایت اللہ۔ فرق یہ ہے کہ حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب دولت مند اور غنی تھے۔ حضرت مفتی اعظمؒ فقیر مستغنی۔ جمعیۃ علمائے ہند سے حضرت نے اپنی صدارت کے پورے دور میں اپنا سفر خرچ کبھی نہیں لیا۔ اگر کبھی ہاتھ تنگ ہوتا تو سفر کو ملتوی فرما دیتے تھے۔ مگر التوا کا سبب کچھ اور ظاہر فرماتے تھے۔

پس اے مسلمانو! یاد کرو وہ وقت جبکہ تم جامع مسجد شاہجہانی کے صحن میں کھڑے ہو کر ایسی اولوالعزم ہستیوں پر "کانگریس کے تنخواہ دار" ہونے کا الزام لگایا کرتے تھے۔

اور اے آدمیو! یاد رہے گا یہ وقت جبکہ تم اُن بے لوث مجاہدین کی قربانیوں کو بھول چکے ہو اور ان کا نام صفحۂ تاریخ سے مٹا دینا چاہتے ہو۔ جنھوں نے اپنی ضروریات کے لیے بھی کسی کے سامنے

ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اور آزادی کی جنگ میں ان کا قدم آگے ہی بڑھتا رہا اپنے سر کٹا کر ہمارے سر اونچے کر گئے۔ رضی اللہ عنہم ورضوا منہ۔

تری کوتاہ بینی دوسروں کی قدر کیا جانے
بانداز نظر ہوتا ہے اوج آسماں پیدا

واصف

خدمات جمعیۃ علمائے ہند

قیام جمعیۃ کے وقت سے ۱۹۳۹ء تک پورے بیس برس حضرت مفتی اعظمؒ اس کے صدر اور مولانا احمد سعید ناظم اعلیٰ ہے۔ شروع شروع میں جب تک اس کا دفتر مدرسہ امینیہ میں رہا۔ دونوں حضرات ہر وقت شریک کار رہے۔ جب اس کے لیے مستقل دفتر علیحدہ قائم ہوا تو مولانا ہی اس کے انچارج رہے۔ حضرت مفتی صاحب شام کو مدرسے سے فارغ ہو کر کبھی کبھی دفتر تشریف لے جاتے تھے۔ اور مولانا دن بھر دفتر میں ہی رہتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات رات کو بھی دفتر میں سوتے تھے۔

مولانا اگرچہ حضرت مفتی صاحب کے شاگرد تھے مگر حضرت کا برتاؤ مولانا کے ساتھ ایسا تھا کہ دیکھنے والے ان کو آپس میں دوست اور ہم عصر خیال کرتے تھے۔ تعلیم تعلم کا مشغلہ ۱۹۳۲ء میں ملتان جیل میں بھی رہا۔ یعنی وہاں مولانا مفتی صاحب سے فتح الباری کا آخری پارہ پڑھا۔

مولانا کو قرآن مجید کے معانی و مطالب اور ربط آیات پر بے انتہا عبور تھا۔ اور یہ مولانا کا خاص امتیاز اور ملکہ تھا۔ ذلك فضل الله يوتيه من يشاء:

آنسو رہ وفا میں گراتے گزر گئے
لوٹو! کہ ہم خزانے لٹاتے گزر گئے
دامن کو الجھنوں سے بچاتے گزر گئے
اچھے رہے جو ہنستے ہنساتے گزر گئے
ہستی کے رہگزار میں کس کو قیام ہے
آئے ادھر تو ملتے ملاتے گزر گئے
یہ بھی تری نگاہ کی توفیق تھی کہ ہم
ان رہگزر سے ٹھوکریں کھاتے گزر گئے
آئی بہار غنچۂ خاطر نہیں کھلا
یہ دن بھی یونہیں اشک بہاتے گزر گئے
ملتی نہیں ہر ایک کو یہ دولت جنوں
کتنے ہی آئے خاک اڑاتے گزر گئے
واصفؔ سے ہم ملے جو سر رہگزار عشق
باہم دلوں کے داغ دکھاتے گزر گئے

مرقع کی تکمیل

ایک روز کسی کام سے جمعیۃ علمائے ہند جانے کا اتفاق ہوا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے فرمایا۔ آیئے واصف صاحب! آپ کی بڑی عمر ہے۔ میں آپ کو یاد ہی کر رہا تھا۔ رات کو میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ وہ سنانا چاہتا تھا۔

"میں نے دیکھا کہ ایک عالی شان مکان میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف رکھتے ہیں۔ ان کے سامنے میں اور آپ کے بھائی خلیل الرحمٰن صاحب بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ مختلف قسم کی بات چیت ہو رہی ہے۔ اتنے میں مولانا احمد سعید مسکراتے ہوئے تشریف لائے اور اپنی عادت کے مطابق بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔ میں نے کہا کہ آپ دونوں حضرات دنیا میں بھی ساتھ تھے اور یہاں بھی ساتھ ہیں۔ مولانا احمد سعید ہنسے۔ حضرت مفتی صاحب اپنی عادت کے مطابق سنجیدگی سے مسکرائے۔"

لیجئے تکمیل ہو گئی اس مرقع کی جس کا خاکہ مولوی مشہود حسن کو دکھایا گیا تھا۔ رنگ بھرنے والے نے رنگ بھر کر اس کو قصر علیین میں سجا دیا۔

تدفین

مولانا کے دل میں ہمیشہ سے حضرت مفتی اعظمؒ کے قریب دفن ہونے کی آرزو تھی۔ اور زندگی میں اس کا انتظام بھی کر لیا تھا۔ مہرولی میں دو قبروں کی جگہ محفوظ کر رکھی تھی۔ یہ آرزو پوری ہو گئی۔ اور آج درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب ظفر محل کی دیوار کے نیچے دونوں استاد شاگرد میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العلمين۔

الوداع

حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند

تقریباً نوماہ پیشتر حضرت مفتی صاحب کی زبان مبارک سے چند کلمات صادر ہوئے تھے، وہ میرے دل و دماغ سے آج تک محو نہیں ہوئے اور نہ کبھی محو ہو سکتے ہیں اور یقین ہے کہ سوانح نگار مورخین بھی ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گے اور اس فروتنی اور انکسار خوف وخشیہ اور اپنے نفس سے بدظنی کا بہترین نمونہ ہیں جو پاک باطن اہل اللہ کی خاص صفت پائی جاتی ہے جس کو تمام عبادتوں اور ریاضتوں کا کامیاب نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ الفاظ یہ تھے: "میں نے تو ڈوبنا سیکھا ہے۔ مجھے تیرنا نہیں آتا" ان الفاظ کا شانِ نزول بھی عجیب ہے۔

گذشتہ ماہ شعبان میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ سے واپسی ہو رہی تھی۔ جب بذریعہ کار دیوبند جانا ہوتا تھا تو راستہ میں نہر کے پل پر تھوڑی دیر قیام ضرور ہوا کرتا تھا۔ کھاتولی میں نہر کے پاس ایک نل (اور دلی والوں کی زبان میں "برما") ہے۔ اس کا پانی بہت شیریں، سبک اور بہت ٹھنڈا ہے۔ جاتے آتے اس برمے کا پانی ضرور پیا جاتا تھا۔

واپسی کے وقت پانی پینے کے لیے یہاں قیام ہوا۔ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب میرٹھی ساتھ تھے۔ ماہ مئی کی آخری تاریخیں تھیں۔ گرمی شدید شام کا وقت تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی جلد باز مگر تیلی طبیعت نے نہر کا صاف شفاف پانی دیکھا تو ایک دم لنگی باندھ کر غسل کرنا شروع کر دیا۔ اسی پر کچھ تیرنے اور غوطہ لگانے کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ کچھ بزرگوں کے واقعات بھی زبان پر آئے۔ جو تیراکی کے ماہر تھے غالباً حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے حضرت مفتی صاحب سے بھی دریافت کیا۔ "کیا جناب کو بھی تیرنا آتا ہے؟"

حضرت مفتی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی زبان مبارک سے برجستہ وہ فقرہ صادر ہوا جو اُوپر نقل ہو چکا ہے۔ یہ فقرہ زبان پر تھا۔ اور چشم مبارک میں آنسو تھے۔ تفریح کے موقع پر یہ سنجیدگی اور یہ حضوریٔ قلب کہ فوراً ہی رقت طاری ہو گئی۔ اس کی قدر وہ کر سکتے ہیں جو ریاضت اور مجاہدہ کی غرض و غایت سے واقف اور اس کے متلاشی ہوں، یہ دیوبند کا آخری سفر تھا جو کم از کم ان کو تو ہمیشہ یاد رہے گا جن کو اس سفر میں شرف رفاقت حاصل تھا۔

رمضان شریف کے بعد نزلہ و زکام کی شکایت شروع ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس نے مستقل مرض کی شکل اختیار کر لی آپ اپنے معمولات برابر انجام دیتے رہے۔ لیکن ۱۱ر محرم ۷۲ھ ۲۲ اکتوبر ۵۲ء سے آپ صاحب فراش ہو گئے۔ دہلی کے مشہور اطباء حکیم ظفر خاں صاحب، حکیم عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ، حکیم محمد اسماعیل صاحب (پرنٹر و پبلشر الجمعیۃ و مالک صدیقی دواخانہ) حکیم ذکی احمد خاں صاحب (جید پریس دہلی) حکیم الیاس خاں صاحب صدر جامعہ طبیہ حکیم شریف الدین صاحب اجملی مالک بقائی دواخانہ حکیم فضل مبین صاحب۔ حکیم مظہر الدین صاحب کبھی ساتھ ساتھ اور کبھی یکے بعد دیگرے معالجہ کو آئے۔ بیرونی اطباء میں سے حکیم محمد صدیق صاحب بریلی۔ حکیم محمد یامین صاحب سہارنپوری نے بھی آخر میں علاج کیا۔

دہلی کے تقریباً تمام بڑے بڑے ڈاکٹروں کا معائنہ کرایا گیا۔ خصوصاً ڈاکٹر زیڈ احمد صاحب نے تقریباً دو ماہ تک ایسی ہمدردی و خلوص اور جانفشانی سے علاج کیا جس کی مثال مشکل سے پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن قضائے الٰہی میں نہ کوئی تبدیلی کی جا سکتی تھی نہ کی جا سکی۔ یہاں تک کہ ۱۳ر ربیع الثانی ۷۲ ۱۳ھ ۳۱ر دسمبر ۵۲ء چہار شنبہ شب کو دس بج کر پچپن منٹ پر داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے

"حیاۃ طیبہ" اور پاک زندگی کا سبق پسماندگان کے لیے چھوڑا اور رخصت ہوگئے۔رضی اللہ عنہم وارضاہ۔

صاجزادگان کے علاوہ مولانا ضیاء الحق صاحب تلمیذ خاص حضرت مفتی صاحب نے خدمت کی سعادت خوب خوب حاصل کی تھی۔ مولانا اختر صاحب شاگرد رشید اور جناب حکیم شریف الدین صاحب بھی تقریباً ہمہ وقت حاضر خدمت رہتے تھے۔حضرت مولانا احمد سعید صاحب ساری عمر کے رفیق اور پڑوسی۔حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب معالجہ اور طبی مدارات میں مشیر خاص رہے۔ چند روز پیشتر حکیم محمد یامین صاحب سہارنپوری حکیم محمد اسمٰعیل وغیرہ نے نئے انداز سے علاج شروع کیا ابتداءً مرض میں تخفیف معلوم ہوئی اور یہ اطمینان دلایا گیا کہ مرض روبہ تنزل ہے۔ لہٰذا مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے سی۔پی کا دورہ شروع کردیا جس کا تقاضہ اور تیاریاں تقریباً چھ ماہ پہلے سے ہورہی تھیں۔ چہار شنبہ کے روز شام تک طبیعت حسب معمول رہی تقریباً پونے نو بجے دفعۃً تغیر پیدا ہوا اور تھوڑی دیر بعد مایوسی کی شکل پیدا ہوگئی اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ناگپور ٹیلی فون سے خبر دی گئی لیکن ہوائی جہاز سے سیٹ نہ مل سکی۔ ٹرین سے پہنچنا ناممکن تھا۔ یہ حسرت ہمیشہ کے لیے باقی رہ گئی۔ دیوبند سے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا اعزاز علی صاحب۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب نماز جنازہ میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے لیکن راستہ میں ایسی رکاوٹ پیش آئی کہ جب دہلی پہنچے تو نماز جنازہ ختم ہوچکی تھی۔ اسی وقت سہارنپور سے حضرت مولانا حافظ عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ مظاہر العلوم مولانا مفتی سعید احمد صاحب اور ان کے رفقاء بھی تشریف لائے۔

جنازہ

تیمار دار حضرت کی یہ دوراندیشی قابل قدر ہے کہ وفات کے بعد فوراً ہی غسل دے کر جنازہ تیار کرلیا تھا۔ چنانچہ صبح صادق کے وقت سے ہی ہجوم شروع ہوگیا اور جب ۲ بجے نماز ظہر کے بعد جنازہ کی نماز ہوئی تو پریڈ کا وسیع میدان ایک لاکھ خدا پرستوں سے پٹا ہوا تھا۔حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ شریف کے زیر سایہ قبر پہلے سے تیار تھی، یہ جگہ دہلی شہر سے گیارہ میل کے فاصلہ پر ہے مگر یہاں بھی کم بیش دس ہزار مسلمان پہنچ گئے جو دفن میں شریک ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وقدس سرہٗ۔□□

قطعہ تاریخ وفات

آں مفتیٔ دینِ مبیں — شد با ملائک ہم نشیں
ثروت بگو تاریخ او — زینت دہِ خلد بریں

۱۳۷۲ھ

Scanned by CamScanner

مفتی اعظمؒ کی زندگی کے مختلف پہلو

زہد، تقویٰ، سادگی، اصابت رائے و قومی انہماک

جناب مولانا عمردراز بیگ صاحب منیجنگ پروپرائٹر ڈیلی جدت مرادآباد

راقم الحروف نے حضرت مفتی صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تین زمانوں میں خصوصیت کے ساتھ معائنہ کیا ہے۔ میں ہر زمانہ کے مختصر حالات اس مختصر صحبت میں سپرد قلم کرتا ہوں۔

ابتدائی دَور جمعیة علماء هند

جمعیۃ علماء ہند کا قیام جب عمل میں آیا تھا اس وقت اس کا دفتر بلیماران (جمعیۃ علماء ہند کے قیام کے بعد کافی عرصے تک اس کا دفتر مدرسہ امینیہ میں حضرت مفتی اعظم کے کمرے میں رہا) میں ایک چھوٹے سے مکان کی بالائی منزل میں تھا۔ یہ مکان دفتر الجمعیۃ کے بالکل سامنے ہے۔ اس وقت مفتی صاحب جمعیۃ کے صدر اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب ناظم اعلیٰ تھے۔ مجھ کو جمعیۃ علماء سے روزِ اوّل سے دلچسپی رہی ہے۔ اس بناء پر دہلی کی ایک ملاقات میں حضرت مفتی صاحب و مولانا احمد سعید صاحب نے مجھ کو جمعیۃ علماء کی خدمات انجام دینے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اس مشورہ پر میں جمعیۃ کی خدمات آنریری طور پر انجام دینے لگا۔ میرا قیام دفتر جمعیۃ میں ہی تھا۔ اس زمانہ میں میں نے حضرت مفتی صاحب کے عزم راسخ، اتقاء، اصابت رائے کا بچشم خود معائنہ کیا۔ حضرت مفتی صاحب مدرسہ کی خدمات بھی انجام دیتے تھے۔ فتاویٰ نویسی کا کام بھی کرتے تھے۔ اپنے کتب خانہ کی دیکھ بھال بھی ان کے ذمہ تھی۔ اور اس کے ساتھ جمعیۃ علماء کے دفتر میں روزانہ تشریف بھی لایا کرتے تھے۔ اور مجھ کو ضروری ہدایات دیا کرتے تھے۔ بسا اوقات مفتی صاحب، مولانا احمد سعید صاحب اراکین جمعیۃ کی توسیع و تنظیم پر غور کرتے تھے۔ میں مضطربانہ شان میں مفتی صاحب سے عرض کیا کرتا تھا کہ علماء مختلف عقائد میں بٹے ہوئے ہیں جن کو ایک سطح پر لانا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ مفتی صاحب نہایت استقلال و عزم راسخ کے ساتھ فرمادیا کرتے تھے کہ مرزا صاحب، دیکھیے یہ خدا کا کام ہے علماء جمعیۃ کے ساتھ ضرور آجائیں گے۔ اور انشاء اللہ جمعیۃ ایک دن سارے ہندوستان پر حاوی ہوجائے گی۔ چنانچہ دَورِ حاضرہ میں جمعیۃ ہی مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت ہے جس پر مسلمان بھروسہ کرسکتے ہیں۔ اور اس کے ذریعے اپنے دینی و دنیوی مقاصد حاصل کرسکتے ہیں۔ جمعیۃ کی حضرت مفتی صاحب نے جو خدمات انجام دی ہیں، وہ روز روشن کی طرح ہویدا ہیں۔ اور اس کی تفصیل و توضیح اس مختصر وقت میں کسی طرح بیان نہیں کی جاسکتی۔

مؤتمر اسلامی مکه معظمه کا سفر

حضرت مفتی صاحب کی اعلیٰ قابلیت کا ہندوستان کے علماء و عامۃ المسلمین نے تو اچھی طرح مطالعہ کیا ہی ہے۔ مؤتمر اسلامی کے اجلاسوں میں عالم اسلام کے وفود پر مفتی صاحب نے اپنی نکتہ سنجی، اعلیٰ قابلیت، تبحر علمی کا سکہ جمادیا تھا۔ میں بھی اس وفد میں مکہ معظمہ گیا تھا۔ مؤتمر اسلامی کے تمام ہی اجلاسوں میں شرکت کی تھی۔ جس قدر بھی مسائل آئے تھے، مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی جیسے مسلمہ لیڈر بھی حضرت مفتی صاحب سے مشورہ کرتے تھے۔ قبوں کو ابن سعود (شاہ حجاز) نے چونکہ گروادیا تھا اس پر جمعیۃ کے وفد نے اعتراض کیا تھا۔ ابن سعود نے کہا کہ ہمارے علماء سے اس پر بحث و مباحثہ کرلیجئے۔ چنانچہ جمعیۃ کے وفد اور سعودی علماء کا ایک مشترکہ جلسہ ہوا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی و حضرت مفتی صاحب نے احادیث نبوی کی روشنی میں اپنے دلائل و براہین سعودی علماء سے منوالیے۔

مدینہ منورہ ہم سب اونٹوں پر گئے تھے اور اس وقت بسیں نہ

نہیں۔ نہ موٹر تھے۔ مولانا شوکت علی صاحب چونکہ فربہ زیادہ تھے، اس لیے اونٹ پر ان کے جیسے وزن کا کوئی دوسرا ساتھی نہ ملتا تھا۔ اس وجہ سے ان کے لیے پالکی تیار ہوئی۔ مگر راستہ کی منزلوں میں خلافت کمیٹی و جمعیۃ علماء کا وفد ایک ساتھ ہی قیام کرتا تھا۔ منزلوں پر کھانے پکانے کا انتظام ہوتا تھا۔ اس نظم میں حضرت مفتی صاحب بعض معمولی کام خود اپنے ہاتھ سے انجام دیتے تھے، جس سے ان کی سادگی کا پتہ چلتا تھا۔ مفتی صاحب اپنے مکان پر بھی بعض گھریلو کام خود انجام دیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ انھوں نے اپنے دولت خانہ پر مجھے چائے پر مدعو کیا۔ میرے سامنے کچھ چیزیں خود تیار کیں۔ حضرت مفتی صاحب میں قدرت نے بیک وقت بہت سے اوصاف جمع کردیے تھے۔ وہ قوم وملک کے فداکار بھی تھے اور بہترین مدرس بھی۔ مفتی اعظم بھی تھے اور حد درجہ مفکر و مدبر تھی۔ وہ اہل قلم بھی تھے اور گھریلو کاموں کے منتظم بھی۔ وہ متقی بھی تھے اور سیاسی لیڈر بھی۔ آپ کے اتقا کا حال یہ تھا کہ اپنے رفیقوں سے جیل میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ قیدی جو ہماری خدمت کے لیے مامور کیے گئے ہیں ان کا حق المحنت ہمیں ادا کرنا چاہیے۔ اگرچہ گورنمنٹ نے انھیں ہماری خدمت کے لیے مقرر کیا ہے مگر ہمیں بغیر اُجرت کام نہ لینا چاہیے۔ سب جیل والوں کے ساتھ مفتی صاحب بہت بہتر اور مساویانہ برتاؤ فرماتے تھے اور عام قیدی حضرت مفتی صاحب کو نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ یہ جیل کا حال تو بطور جملہ معترضہ آگیا۔ دراصل تذکرہ تھا مؤتمر اسلامی کے سفر کا۔ واقعی حضرت مفتی صاحب نے مؤتمر اسلامی میں وہ اہم خدمات انجام دی ہیں جن کی مثال دوسرے ممبران نے بہت کم پیش کی ہے۔ وقت بھی کم ہے۔ اخبار کے صفحات بھی محدود۔ پوری تفصیل اس سفر کی کہاں تک لکھی جاسکتی ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ حضرت مفتی صاحب نے اپنے اعلیٰ فہم، خداداد ذہانت، قابل رشک فراست، بے مثال تبحر علمی کا سرزمین عرب پر ڈنکا بجادیا تھا۔

جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس مراد آباد

جمعیۃ علماء کا جو شاندار اجلاس مراد آباد میں منعقد ہوا تھا حضرت مفتی صاحب نے اجلاس کے زمانہ میں غریب خانہ پر ہی قیام کیا تھا۔ اس زمانہ میں مجھ کو مفتی صاحب کی محنت، علمی تبحر، سیاسی غور و فکر کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا۔ مفتی صاحب صبح سے رات کے دو بجے تک حد درجہ مصروف رہتے تھے۔ اجلاسوں پر مقدس علمائے کرام کے پاس جانا اور ان کی خبر گیری کرنا ضروریات کو دریافت کرنا، یہ کام بھی حضرت مفتی صاحب انجام دیتے تھے۔

تجاویز (رزولیوشن) بنانے میں حضرت مفتی صاحب کو حد درجہ ملکہ تھا۔ بڑے بڑے لیڈر رزولیوشن کے معاملے میں اپنے تنازعات مفتی صاحب سے ختم کرالیا کرتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے، جامع مسجد دہلی کے سامنے بہت بڑا جلسہ ہو رہا تھا۔ سر شفیع صاحب (پنجاب) اور مولانا محمد علی صاحب کے درمیان کسی رزولیوشن پر اختلاف ہوا۔ دونوں اصحاب نے رزولیوشن کو حضرت مفتی صاحب کے سپرد کردیا۔ مفتی صاحب نے ایسے الفاظ میں رزولیوشن بنادیا جس سے ملک کے یہ دونوں مسلمہ لیڈر مطمئن ہوگئے۔

چھوٹوں پر شفقت

اجلاس کے زمانہ میں ایک روز کھانے کے وقت فرمانے لگے۔ مرزا صاحب (مجھ کو حد درجہ شفقت کے ساتھ مرزا صاحب فرمایا کرتے تھے) یہ کھانا مہمان خانہ سے آتا ہوگا۔ میں نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ نہیں یہ تو میرے گھر کا ہے۔ اس پر فرمایا ہم آپ کو اس قدر زیر بار نہیں کرنا چاہتے۔ آپ جمعیۃ کی اس قدر تو خدمات انجام دیتے ہیں کہ رات دن ایک کردیتے ہیں اور اپنی جیب سے خرچ بھی کریں۔ مگر میں نے وہی سلسلہ جاری رکھا۔ میری منشاء اس واقعہ کے لکھنے سے صرف یہ تھی کہ مفتی صاحب اپنے خوردوں کا اور قومی ورکروں کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ کسی کو تکلیف مالا یطاق نہ دیتے تھے۔

اس مختصر صحبت میں حضرت مفتی صاحب کی اعلیٰ قابلیت، تدبر، فہم، فراست، ذکاوت، خدمت قومی، نکتہ سنجی کی تفصیل کس طرح نہیں لکھی جاسکتی۔ کس کس وصف کی مدح سرائی کی جائے۔ اب تو صرف ان کے لیے جنت الفردوس عطا ہونے کی دعا کرنی چاہیے۔ اور ان کے متوسلین کو ان کی شاہراہ پر گامزن ہونا چاہیے اور بس۔

یادِ ایّام

جناب مولانا محمد ظہور علی صاحب بھوپال

۱۹۱۸ء ختم ہو رہا تھا۔ دہلی میں کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کانگریس کے صدر پنڈت مدن موہن مالویہ اور لیگ کے صدر مسٹر فضل الحق منتخب ہو چکے تھے۔ دونوں کی استقبالیہ کے صدر علی الترتیب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری رحمہم اللہ تھے۔

ڈاکٹر انصاری صاحب کا مطب اس زمانہ میں مسجد فتح پوری کے مشرقی دروازہ کے شمالی حصہ میں تھا۔ کبھی ڈاکٹر صاحب کے مطب میں اور کبھی حکیم صاحب کے دوا خانہ پر غیر رسمی جلسے ہوتے تھے اور دونوں اجلاسوں کو کامیاب بنانے کے لیے غور کیا جاتا تھا۔

ایک روز ڈاکٹر صاحبؒ کے مطب میں جناب حکیم صاحبؒ بھی تشریف رکھتے تھے۔ اور حاجی حافظ نور الدین احمد صاحب مہاجر، حاجی عبد الغفار صاحب (مالک کوٹھی حاجی علی جان صاحب) شیخ عبد اللہ صاحب آٹے والے، لالہ دیش بندھو گپتا، شعیب قریشی اور چند دوسرے بزرگ شریک تھے۔ راقم الحروف بھی حاضر تھا۔ باہمی مشورہ سے یہ طے پایا کہ دونوں اجلاسوں کو کامیاب بنانے کے لیے حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو (جو اپنے علمی تبحر اور بے لوث سادہ زندگی کے لحاظ سے شہر میں بڑی عزت کے مالک ہیں اور اہل شہر پوری عقیدت کے ساتھ ان کے ارشادات کو سنتے ہیں) اور سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب کو (جو اپنی خوش بیانی سے سامعین کو مسحور کر لیتے ہیں) ان اداروں میں شریک کیا جائے تاکہ دونوں اجلاس زیادہ سے زیادہ کامیاب ہو سکیں۔ اس وقت تک دونوں حضرات اگرچہ اپنا ایک سیاسی مسلک رکھتے تھے لیکن عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ چنانچہ دونوں حضرات سے عرض کیا گیا اور دونوں عملاً شریک ہو گئے۔ حضرت مفتی صاحب چونکہ عام جلسوں میں زیادہ نہیں بولتے تھے اس لیے وہ تو کم لیکن حضرت سحبان الہند برابر اشاعتی جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کا خطبۂ استقبالیہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہی مرتب فرمایا تھا جو اپنی اہمیت اور جامعیت کے لحاظ سے مسلم لیگ اور سیاسیات ہند کی تاریخ میں خاص مقام رکھتا ہے۔

اسی سال پنڈت نہرو نے الٰہ آباد وغیرہ سے پانچ سو کسانوں کو پہلی مرتبہ کانگریس کے اجلاس میں لا کر شریک کیا جو قرول باغ میں ٹھہرائے گئے تھے۔ اس وقت قرول باغ دہلی سے بالکل علیحدہ تھا اور باڑہ ہندو راؤ سے قرول باغ تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ اس وقت حاجی حافظ نور الدین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہمان نوازی اور اس کے متعلق انتظام میں ایک مسلمہ شخصیت سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ کانگریس اور لیگ دونوں حافظ صاحب کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن کافی بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے ہوا کہ لیگ کا کام حاجی عبد الغفار صاحب بہ مشورہ حافظ صاحب انجام دیں۔ اور قرول باغ میں کسانوں کی خدمت و تواضع کا کام حافظ صاحب انجام دیں۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ حال تھا کہ کانگریس اور لیگ دونوں کے اجلاسوں میں شرکت فرماتے تھے اور پورے انہماک سے حصہ لیتے تھے۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۵۲ء تک دہلی میں کوئی سیاسی یا مذہبی تحریک ایسی نہیں ہے جس میں حضرت مفتی صاحب کی رہبری پوری صداقت و صفائی کے ساتھ نظر نہ آئے۔ اگرچہ حضرت رحمہم اللہ علیہ کو اپنی راست بازی اور استقامت کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دینا پڑیں، لیکن کبھی مرحوم کا قدم مبارک صراطِ مستقیم سے نہیں ڈگمگایا۔

مفتی صاحبؒ کو اپنے عقیدۂ سیاسی کی بدولت چند بار جیل بھی

جانا پڑا۔ لیکن ان کو غالباً انفرادیت کا ممتاز درجہ حاصل ہے کہ کبھی جیل جانے کے وقت یا رہائی کے وقت نہ تو کوئی جلوس نکالا گیا اور نہ نعرے لگائے گئے۔ ورنہ وہ اس طبقہ کے بزرگوں میں سے تھے۔ اگر پسند فرماتے تو صرف دہلی ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی فضا آپ کے لیے نعروں سے گونج اُٹھتی۔ وہ اگر چاہتے تو اپنی اس پوزیشن سے مختلف طریقوں سے فائدہ حاصل فرماتے لیکن انھوں نے کبھی اپنے کام کو اپنے لیے اشتہار نہیں بنایا۔

آج کی جمعیۃ علماء، مرحوم کی سیاسی و مذہبی اعلیٰ بصیرت اور فداکاری کی زندہ نشانی ہے۔ مرحوم تقریباً بیس سال تک اس کے صدر ایسے وقت میں رہے جبکہ جمعیۃ علماء کا نام لینا خطرناک اور ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ غالباً آخری مرتبہ اس جلسہ میں شریک ہوئے تھے جو امرت پتریکا کے رسوائے عالم فعل پر اظہارِ نفرت کے لیے اردو پارک دہلی میں ۱۴؍اگست ۱۹۵۲ء کو منعقد ہوا تھا۔

●●●●●●●●●●●

Scanned by CamScanner

تحدیث نعمت-رویائے صادقہ

۱۳۲۳ھ جمادی الاخریٰ کی آخری تاریخوں میں عاصی پر معاصی راقم الحروف مرغوب احمد غفراللہ والوالدیہ والمشائخہ الکرام کو دہلی مدرسہ مولوی عبدالرب صاحب مرحوم میں عالم رویا میں حضرت خلیل اللہ سیدنا ابراہیم صلوات اللہ علیہ وعلیٰ نبینا وعلیٰ جمیع الانبیاء والمرسلین کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی مدرسہ میں تشریف آوری کی اطلاع ہوتے ہی فقیر نے عالم شوق میں مدرسہ کے طلبہ کو یہ کہتے ہوئے بیدار کیا کہ بزرگان دین کی ملاقات سے ہمیں کس قدر مسرت ہوتی ہے۔ آپ تو خلیل اللہ ہیں۔ جلدی دوڑ کر شرف زیارت حاصل کرو۔ چنانچہ طلبہ حاضر خدمت ہوگئے۔ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام۔ شمالی جانب صحن مسجد میں مولانا محمد شفیع صاحب کی درسگاہ کے حجرے کے سامنے قبلہ رو دوزانو تشریف فرما تھے۔ اور مواجہہ میں حضرت کے حضرت مولانا عبدالعلی صاحب محدث وصدر مدرس وناظم مدرسہ غایت ادب سے بیٹھے تھے۔ دیگر مدرسین وطلبہ اطراف میں نہایت ادب سے بیٹھے ہوئے زیارت سے مشرف ہورہے تھے۔ حضرت خلیل اللہ کا حلیہ مبارک آج پچاس سال کے بعد بھی ذہن میں محفوظ ہے۔ میانہ قامت لیکن قریب کشیدہ قامت کے رنگت نہایت سرخ وسفید جسم اطہر نہ ہلکانہ بھاری لیکن بھرا ہوا۔ سیاہ جبہ وعمامہ باندھے ہوئے۔ میری خوشی کا اُس وقت جو عالم تھا اُس کے اظہار سے قاصر ہوں۔ حضرت مولانا عبدالعلی صاحبؒ نے نہایت ادب سے عافیت مزاج اقدس دریافت کرنے کے بعد تشریف آوری و تصدیعہ فرمائی کا سبب دریافت کیا تو حضرت خلیل اللہ نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ "میں مولوی رشید احمد کو لینے آیا ہوں۔ (اسی ماہ میں مورخہ ۸/جمعہ کو مولانا کا انتقال ہوگیا تھا۔ یہ واقعہ انتقال کے کچھ روز بعد کا ہے) اس کے بعد حضرت خلیل اللہ نے مولانا عبدالعلی صاحبؒ سے فرمایا کہ مولوی صاحب مجھے آپ کے جوان صاحبزادے عبدالجلیل کے انتقال کی اطلاع ہوئی تھی۔ مرحوم بہت آرام سے ہے، آپ صبر کیجئے۔ اس کے بعد حضرتؑ نے فرمایا کہ میں مدرسہ امینیہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ حضرت خلیل اللہؑ کے ہمراہ طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ فقیر بھی سنہری مسجد میں گیا۔ مدرسہ کی سیڑھی کے سامنے اوپر میں مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا حجرہ تھا۔ سیڑھی چڑھ کر اوپر تشریف لے گئے۔ پھر واپس اُترے۔ ہم نیچے کھڑے تھے۔ حضرت کا حجرہ کی سیڑھی سے اُترنے کا سماں اب تک میری نظروں میں گھوم رہا ہے۔ حضرتؑ کی شکل وشباہت، قدو قامت اور خوبصورتی کی مثال وشباہت میں اگر ناقص تشبیہ کسی کے ساتھ دے سکوں تو مولانا عبدالحق صاحب حقانی مرحوم اور میرے والد مرحوم کو دے سکتا ہوں۔ الحمد للہ والشکر للہ۔

(مرسلہ: مولوی اسمٰعیل سلمہ، فرزند ارجمند مولانا مفتی مرغوب احمد لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ)

خانۂ علم بے چراغ ہوا

سیّد عزیز حسن بقائی مدیر ہفتہ وار حریت دہلی

۳۱/دسمبر کی رات کو حضرت علامہ محمد کفایت اللہ مفتی اعظم ہند نے اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

یہ دنیا فانی ہے۔ جو آیا ہے اسے جلد یا بدیر جانا ہی پڑتا ہے۔ اس لیے حضرت مفتی اعظم بھی اپنے مولا کو پیارے ہو گئے۔ لیکن بعض افراد کی موت طبعی ہونے کے باوجود اس قدر اندوہناک ہوتی ہے کہ اس کا اثر مرنے والے کی چہار دیواری سے نکل کر محلہ، حلقہ، شہر اور پوری اسلامی دنیا پر پڑتا ہے۔ اور حضرت مفتی اعظم مرحوم کی (آہ کہ ان کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم لرزتا ہے) بھی اسی قسم کی موت تھی۔

حضرت مفتی اعظم کی موت علم کی موت ہے، شرافت کی موت ہے، دیانت کی موت ہے، جرأت و بے باکی، سنجیدگی و علم کی موت ہے۔ اخلاص ورواداری، محبت ودرگذر کی موت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ موت کی خبر سنتے ہیں سارا شہر ماتم کدہ بن گیا۔ بغیر کسی تحریک کے مسلم علاقوں میں مکمل ہڑتال ہو گئی۔ اور غم واندوہ کی گھٹا چھا گئی۔ ہر شخص نے خواہ وہ جمعیۃ علماء کا مخالف ہو یا موافق، حضرت مفتی اعظم کا غم منایا۔ اور اس کمی کو محسوس کیا جو حضرت مفتی اعظم کے رحلت فرمانے سے پیش آئے گی۔

اس دہلی نے حضرت خواجہ قطب الدینؒ، حضرت محبوب الٰہیؒ، حضرت خواجہ باقی باللہؒ، حضرت شیخ کلیم اللہؒ، حضرت شیخ عبدالحقؒ محدث دہلوی، حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ، حضرت شاہ عبدالقادرؒ جیسے آفتابِ طریقت اور ماہتابِ شریعت کے جنازے دیکھے ہوں گے، مگر یکم جنوری ۱۹۵۳ء کو مٹی ہوئی دلی، لٹی ہوئی دلی کی سوگوار سڑکوں پر جس شاہانہ عظمت و شان سے مفتی اعظم ہند کا مثالی جنازہ دیکھا اس کی نظیر تاریخ میں ناپید ہے۔

دہلی شاہوں کی نگری ہے۔ اس نے سینکڑوں بادشاہوں کے جلوس دیکھے ہوں گے مگر جو ماتمی شان، علمی عظمت حضرت مفتی صاحب کے جنازہ کی تھی وہ شاید ہی کسی خوش نصیب کے حصہ میں آئی ہو۔

حضرت مفتی اعظمؒ شاہجہاں پور کے باشندے تھے، لیکن پچاس سال سے دہلی میں مقیم ہو کر دہلوی بن گئے تھے۔ وہ دہلی کی سماجی زندگی میں ایک خاص مقام کے مالک تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے بانیوں میں تھے اور پکے قوم پرور تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن مرحوم کے شاگرد اور صحیح معنوں میں جانشین تھے۔ فقہ اسلامی پر اتنا ہی عبور تھا جتنا حضرت امام اعظمؒ کو ہوگا۔ حدیث کے اتنے ہی ماہر تھے جتنے اب سے ہزار سال پہلے عالم ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دیانت علمی میں ضرب المثل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب صدر جمعیۃ علماء ہند کی حیثیت سے مصر کی مؤتمر اسلامی میں شریک ہونے کے لیے مصر تشریف لے گئے تو شیخ ازہر اور مفتی مصر حضرت علامہ مصطفیٰ المراغی خود ملاقات کے لیے ان کی قیام گاہ پر آئے۔ اور ایک ہزار روپے ماہوار پر جامعہ ازہر میں پوسٹ کی پیش کش کی۔ (یہ بات ثبوت طلب ہے) کیونکہ حضرت مفتی اعظم کی علمی شہرت ان سے پہلے مصر پہنچ چکی تھی لیکن حضرت نے اس پیشکش کو بصد شکریہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور مدرسہ امینیہ کے ۶۰ روپے ماہوار کو ایک ہزار روپے پر ترجیح دی اور پوری زندگی اس قلیل تنخواہ میں اس شان سے گذار دی کہ کبھی جمعیۃ کا پانی بھی نہیں پیا۔ جمعیۃ کے دفتر کا کھانا نہ کھایا۔ اگر کھانے کا وقت ہو گیا تو اپنی جیب سے روپیہ نکال کر بازار سے کھانا منگوا کر اپنے ساتھ ایک دو کو کھلا دیا، مگر آپ کے عہدہ صدارت کے بعد جمعیۃ کے مہمان خانہ کی وسعت کا کچھ ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ ایرا غیرا نتھو خیرا مال مفت دلِ بے رحم پر ہاتھ دیتا ہے۔

ان کے ہاں کبھی بازاری آدمی لفنگے جمع نہیں ہوئے۔ پارٹی بازی سے سخت نفرت تھی۔ ان کے ہاں آنے والوں کے تین درجے تھے۔ ایک تو وہ جن کو دروازے کے کواڑ بھیڑ کر کے چلتا کر دیا، دوسرے جن کو ڈیوڑھی میں بچھے ہوئے بنچ پر بٹھا کر بات چیت کی، تیسرے وہ لوگ تھے جن کو اپنے ساتھ اوپر لے جا کر دل جمعی سے بات کرتے تھے۔ میرا شمار ان لوگوں میں تھا جن کو وہ اپنے بالا خانہ پر لے جا کر بات چیت کیا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی چائے بھی پلایا کرتے تھے۔ (میں چائے نہیں پیتا مگر حضرت کی چائے سے کبھی انکار ہی نہیں کیا)

ایک روز مجھے میرے آفس سے بلایا گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ مولوی احمد سعید، مسٹر بلال اسمد زبیری ایڈیٹر انصاری اور مسٹر جعفری ایڈیٹر ملت بھی موجود ہیں۔

اس زمانہ میں ایک روزانہ اخبار میں حضرت کے خلاف مضامین شائع ہو رہے تھے جس میں مدرسہ امینیہ کے حسابات کو مشتبہ بتایا جارہا تھا۔ حضرت نے حسابات کے رجسٹر سامنے رکھے۔ اور خواہش کی کہ حساب سمجھ لو۔ کیونکہ اس سے مدرسہ کی شہرت کو اور میری دیانت کو نقصان پہنچتا ہے۔ میں نے کہا۔

"حضرت! حسابات تو وہ دیکھے، جس کو شبہ ہو، کیا آپ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم میں سے کسی کو آپ کی دیانت پر شبہ ہے۔"

نیچی نظر کر کے مسکرائے اور فرمایا۔ "تو پھر جو صاحب مخالفانہ مضامین لکھ رہے ہیں ان کو لا کر دکھا دیجئے۔"

میں نے عرض کیا۔ "میری رائے اگر آپ قبول فرمالیں تو یہ قصہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ میں ایڈیٹر صاحب سے گفتگو کرلوں گا۔ ان میں یہ ہمت نہیں کہ وہ میرے کہنے کو ٹالیں۔ آپ بالکل مطمئن رہئے۔ ہم میں سے کسی کو اس پر لکھنے کی ضرورت ہی نہ ہو گی۔ میں صفائی سے کہہ دوں گا کہ یا تو لکھنا بند کرو، ورنہ مجھ سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ان میں یہ دَم نہیں ہے کہ وہ مجھ سے لڑ سکیں۔"

سب نے میری تجویز کو پسند کیا۔ میں نے گھر پر آتے ہی ایڈیٹر صاحب کو بلایا۔ اور ان سے کہا۔ "عزیزم! حضرت مفتی صاحب کے خلاف لکھنا بند کر دو، ورنہ کل سے میں جواب دینا شروع کروں گا۔ اگر حضرت کی دیانت پر کچھ بھی شبہ ہے تو میرے ساتھ چلو، حساب دیکھ لو، یہ ہرگز گوارا نہیں کیا جائے گا کہ حضرت مفتی صاحب اور مدرسہ کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا کیا جائے۔"

ایڈیٹر صاحب بھوچکا رہ گئے اور انھوں نے ایک لمبی تقریر معذرت کی کر ڈالی۔ اور حقیقت حال بیان کر کے لکھے ہوئے مضمون کو روک دینے کا وعدہ کیا۔

میں دوسرے روز حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا۔ "میرا گمان ٹھیک نکلا، ان کو ورغلایا گیا تھا۔ آپ کے مدرسہ کے ایک مدرّس کی جانب سے۔ مگر جو مضامین چھپ گئے، ان پر ان کو ندامت ہے۔ آئندہ ایک لفظ نہیں چھپے گا۔ بالکل مطمئن رہئے۔"

حضرت مفتی صاحب نے فرمایا۔ "کہیں دھوکہ نہ ہو۔"

میں نے عرض کیا۔ "وہ میری دوستی اور دشمنی دونوں سے واقف ہیں۔ ان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ میری دشمنی مول لیں۔"

اس کے بعد میں رخصت ہوا۔ میرے لیے یہ معمولی بات تھی۔ میں اس کو بھول گیا، مگر حضرت مفتی اعظمؒ اس کو نہ بھولے۔

نہایت صفائی پسند تھے۔ بہت صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ ہر بات میں سلیقہ تھا۔ سادہ غذا استعمال کرتے تھے۔ اور ان تمام برائیوں سے علیحدہ تھے جو چودھویں صدی کے ملاؤں کی خصوصیات ہیں۔ اپنی علمی شان کے منافی کوئی حرکت نہ کرتے تھے۔

ان کے صحیح قدر شناس حضرت مسیح الملک حکیم اجمل خاںؒ اور حضرت ڈاکٹر انصاریؒ تھے۔ وہی ان کو خلافت کی تحریک میں سیاست میں لائے۔ اصابت رائے پر اتنا اعتماد تھا کہ جو رائے قائم کرلی، اس سے دنیا کی کوئی طاقت ان کو ہلا نہیں سکتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد علیؒ سے رائے کا اختلاف ہوا۔ پوری دیانت داری اور جرأت سے آپ نے مولانا محمد علیؒ کی بے پناہ خطابت اور لاانتہا اثر و رسوخ کا مقابلہ کیا۔ دنیا کی کوئی طاقت اور کسی کا خوف ان کو بچا نہیں سکتا تھا۔ وہ ڈبل روٹی نہ تھے، آہنی عزم اور استقامت کے مالک تھے۔ پوری زندگی کسی کے روپے، علم اور اثر سے مرعوب نہ ہوئے۔

دو مرتبہ کانگریس کی تحریک میں قید ہوئے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات سے بے حد متاثر تھے۔ مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کا ایسا صدمہ تھا کہ منہ کو چپ لگ گئی تھی۔ لیکن دماغ سو فیصد درست کام کرتا رہا۔

امرت بازار پتریکا کے جلسہ کی صدارت کے لیے مولوی حفظ الرحمٰن اور مولوی احمد سعید ان کو اپنی دوکان چمکانے کے لیے لائے تو انھوں نے صفائی سے کہا۔

"میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہی خطبہ صدارت میں کہوں گا۔ چاہے وہ تمھاری مصلحتوں کے موافق ہو یا مخالف۔"

دہلی والوں نے عرصہ سے مفتی صاحب کو نہ سنا تھا۔ فسادات کے زمانہ میں بھی وہ خاموش رہے مگر اس مرتبہ بکثرت جمع ہوئے لیکن حضرت مفتی صاحب سے بہت التجا کی گئی کہ "آپ خدا کے لیے خاموش رہیں ورنہ دیوبند کو نقصان پہنچ جائے گا۔"

ان کو دیوبند کا مفاد بہت عزیز تھا۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں ان کو ایک بڑے سرکاری منصب پر بلایا گیا مگر آپ نے انکار کر دیا۔

بہر حال ایک عظیم المرتبت شخصیت جس کا کوئی بیک گراؤنڈ نہ تھا، ایک بہت بلند مرتبہ علمی آدمی، اس نے اپنی زندگی خود بنائی۔ اور اپنے لیے اعلیٰ علمی طبقوں میں جگہ پیدا کی۔ اور اس کی حفاظت بھی کی اور انتہائی عسرت کی حالت میں زندگی گذار دی۔ اور دنیا سے سرخ رو اپنے ربّ کے پاس پہنچ گئے۔ اور افسوس ہے کہ اپنی خصوصیات اپنے ساتھ لے گئے۔ کوئی ان کا جانشین نہیں۔

۱۲ بجے جنازہ گھر سے چلا۔ ایک بجے پریڈ گراؤنڈ میں پہنچا۔ دو بجے ایک لاکھ مسلمانوں نے نماز جنازہ ادا کی۔ اور میت درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے بلند دروازہ کے پاس دفن کی گئی۔ مرحوم نے، اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے، اپنی یادگار دو بیٹیاں، دو بیٹے چھوڑے۔

میں مرحوم کے بڑے صاحبزادے مولوی حفیظ الرحمٰن اور چھوٹے صاحبزادے خلیل الرحمٰن اور محترمہ بیگم صاحبہ سے اور مرحوم کی بچیوں سے صمیم قلب کے ساتھ تعزیت کرتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ حق جل مجدہ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ◻◻

قطعۂ تاریخ
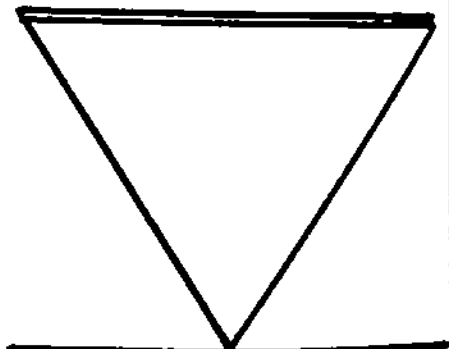
از جناب مولوی عبدالقیوم ارشق شیرکوٹی

آج سدھارے خلد بریں کو
موت سے کس کی آہ ہوا ہے
فتویٰ لینے کس سے جائیں
کس کے مرنے سے برپا ہے
ہجری عیسوی دو تاریخیں
سال غم ہے قول سے نکلا
۱۳۷۶

مرشد برحق مفتیٔ اعظم
نظم عالم درہم برہم
مسئلے کس سے پوچھیں گے ہم
مشرق سے مغرب تک ماتم
ارشق نے لکھی ہیں پیہم
موت العالم موت العالم
۱۳۷۶ھ

۱۳۷۲ھ

بھر کر آہ کہا ہاتف نے
ارم میں ہیں مفتیٔ اعظم
۱۹۵۳ھ

میرے محسن

جناب مولانا قاضی سجّاد حسین صاحب
صدر مدرّس مدرسہ عالیہ فتح پوری، دہلی

آہ! دریغا حاجی رشید احمد — واحسرتا حضرت العلامہ مفتی کفایت اللہ۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

۳ر دسمبر ۵۲ء کی صبح کو مدرسہ عالیہ پہنچا۔ درس شروع ہو رہا تھا کہ ایک صاحب نے فرمایا "رات پاکستان ریڈیو پر حاجی رشید احمد صاحب کی وفات کی خبر سنی ہے۔"

ان جملوں کے ساتھ ایک بجلی سی کوندی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، میں نے کہا کون وہی ہمارے حاجی رشید احمد؟ جواب ملا ہاں وہی بندوق والے ہمارے مدرسہ کے سابق مہتمم جو ۴۷ء میں ہندوستان چھوڑ کر مشرقی بنگال چلے گئے تھے۔

پھر بھی دل اس خبر کی تصدیق پر آمادہ نہ ہوا۔ مزید تصدیق کے لیے مختلف ذرائع اختیار کیے آخر شام تک حادثہ جانکاہ کا ثبوت مل ہی گیا۔ سب ہی اخبار کے کالموں میں اپنے جیسے ہزاروں کو شریک غم کرنے کے لیے خبر شائع کرادی۔

کیم جنوری ۵۳ء کو خلاف معمول ۴ بجے شب کو اُٹھا۔ زنان خانے کی ڈیوڑھی پر گیا تو دیکھا اخبار والا، اخبار ڈال گیا ہے اسے اٹھا کر پہلے ہی صفحہ پر نظر ڈالی تھی کہ نگاہیں اس خبر پر جم گئیں "آہ! مفتی اعظم علامہ محمد کفایت اللہ کا دس بج کر بیس منٹ پر شب کو انتقال ہو گیا۔" چشم پُر نم ہوئی قلب و دماغ پر جان کنی کی سی کیفیت محسوس ہوئی اور زبان پر بے ساختہ یہ شعر جاری ہو گیا۔

وما کان قیس هلکه هلك واحد
ولکنه بنیان قوم تهدما

ایک وقت وہ تھا کہ میں دار العلوم دیوبند سے فارغ ہو کر ۴۹ھ میں مدرسہ عالیہ فتح پوری میں مقرر ہوا۔ یہی دونوں بزرگ مدرسہ عالیہ کے مہتمم تھے اور میں انھیں دونوں محسنوں کی مربیانہ شفقتوں سے لحہ بہ لحہ بہرہ اندوز تھا۔ آج وہ وقت ہے کہ بیک وقت دونوں محسنوں کو ہمیشہ کے لیے گم کر بیٹھا ہوں مدرسہ عالیہ میں اپنی ۱۸ سالہ زندگی میں ان دونوں بزرگوں سے میرا چولی دامن کا ساتھ رہا۔ اور بہت قریب سے ان گراں قدر شخصیتوں کے مطالعہ کا موقعہ ملا۔

حاجی صاحب مرحوم کی شخصیت پر غور کرتا ہوں بے ساختہ زبان پر آتا ہے۔

در کف جامِ شریعت در کف سندانِ عشق

دنیاوی معاملات میں انتہائی انہماک اور کامیابی کے ساتھ بدرجہ اتم دینداری حاجی صاحب کی وہ خصوصیت تھی جس میں کوئی دوسرا شریک نظر نہ آتا تھا۔ دہلی کی شاید ہی کوئی چھوٹی بڑی انجمن ہو جس کے حاجی صاحب رکن رکین نہ ہوں۔ دہلی کے باہر بھی وہ کونسا قابل ذکر ادارہ ہے جس میں حاجی صاحب کی سیاست کار فرمانہ تھی؟ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور جیسی مرکزی درسگاہ کے اگر وہ سرپرست اور روح رواں تھے تو دار العلوم دیوبند اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جیسے اداروں میں بھی ان کی سیاست کو ایک نمایاں مقام حاصل تھا۔ دہلی میونسپلٹی جو کسی چھوٹے صوبہ کی لیجسلیٹو اسمبلی سے کسی طرح کم نہیں، حاجی صاحب مرحوم کی سیاست کا خاص گہوارہ رہی ہے۔ یہ ان کی خداداد قابلیت تھی کہ چند ہی سال کام کرنے کے بعد کمیٹی کے کہنہ سال و کہنہ مشق ممبروں کو پیچھے چھوڑ کر وائس پریسیڈنٹی کی کرسی پر فائز ہو گئے۔ اور اس حسن و خوبی سے پورے ادارے کے انتظام کو

سنبھالا کہ آج تک اس کے در و دیوار پر حاجی صاحب کی یاد تازہ ہے۔

ملکی سیاست میں حاجی صاحب کا رجحان ہمیشہ برٹش سیاست کی طرف رہا اسی بنیاد پر وہ ہمیشہ مسلم لیگ کے دلدادہ تھے اور اس میں ایسے سرگرم عمل رہے کہ مسلم لیگ کے بنیادی ستون سمجھے جاتے تھے برٹش دور میں حکام اور حکومت سے وابستگی بھی حاجی صاحب نے اس طور پر کی کہ ہند کے حکام رس طبقہ کے لیے باعث رشک بنے رہے۔ چند ہی روز کی کاوش میں خان صاحب کے، او۔بی کے خطاب تک پہنچ گئے۔ حکومت کی نگہ انتخاب ان کے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں لندن جانے کا سبب تھی۔

ان تمام دینوی جھمیلوں کے ساتھ ان کا عبادت میں شغف دین دار طبقہ کے لیے باعث رشک تھا۔ تمام مصروفیتوں کے باوجود ممکن نہ تھا کہ نماز باجماعت قضا ہو سکے یا معمولات واوراد میں کوئی فرق آسکے ایک طرف پورے دین دار تھے تو دوسری طرف بفضل خدا مکمل خدا اکمل زاہد شب زندہ دار!

موت کی کیفیت جو ان کے صاحبزادے انیس احمد صاحب کے خط سے معلوم ہوئی یقیناً ہر مسلمان کے لیے باعث رشک ہے۔ چند ماہ کی علالت کے بعد ۲ر دسمبر ۵۲ء کو شب کے چار بجے حسب معمولی بیدار ہوئے۔ تیمم کرا کے تہجد کی نماز کے لیے نیت بند ھوائی اور اسی حالت میں روح جسد عنصری کو چھوڑ کر مرکز اصلی کی طرف پرواز کر گئی۔ ۴۷ء میں حاجی صاحب کو دہلی چھوڑنی پڑی اور انھوں نے مشرقی پاکستان کو اپنا مستقر بنایا لیکن اس مکانی تغیر و تبدل سے ان کی شخصیت اور مصروفیت میں فرق نہ آیا۔ وہی مجسٹریٹ اور انجمنوں کی ممبری وہی دینداری اور مدارس عربیہ کے کاموں میں انہاک غرضیکہ اس برصغیر ہندوستان و پاکستان میں دین و دنیا کی سرخروئی کے ساتھ اپنی عمر کے ۷۵ سال پورے کر کے ابدی میٹھی نیند سو گئے۔

حاجی صاحب اور مفتی صاحب کا تعلق بھی پرانی وضع داریوں کا ایک خاص نمونہ تھا۔ دونوں بزرگوں کے سیاسی خیالات میں انتہائی اختلاف۔ پھر بھی شاید ہی کوئی دن جاتا ہو، فتح پوری مسجد کی منتظمہ کمیٹی دونوں بزرگوں کا مستحکم سنگم تھی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد جہاں مسلمانوں کی عظمت و شوکت دفن ہوئی تھی مسلمانوں کی مساجد و اوقاف بھی اغیار کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکے تھے فتح پوری مسجد اور اس کے اوقاف بھی ضبطی میں آئے تھے اور نیلام ہو کر دہلی کے مشہور رئیس چھنامل کی ملکیت قرار پاگئے تھے۔ کچھ عرصے بعد جب ذرا حالات بدلے تو مسلمانوں کی درخواست پر چھنامل سے واگذار کرا کر مسلمانوں کے حکام رس طبقہ میں سے ایک کمیٹی کے سپرد کر دیے گئے۔

زمانہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے احوال بھی بدلے اور تحریک خلافت کا دور شروع ہوا تو عام پبلک کے اصرار پر مفتی صاحب مرحوم مسجد فتح پوری کی منتظمہ کمیٹی میں شریک کر لیے گئے۔

کمیٹی میں مفتی صاحب کی شرکت سے مسجد کے انتظام میں بہتری کی طرف نمایاں تبدیلیاں عمل میں آئیں اور یہ دور گونا گوں ترقیوں کا حامل بنا مسجد سے ملحقہ دو کانوں کی تعمیر جیون بخش ہال فتح پوری مسلم ہائی اسکول کی عمارت اسی دور کے شاندار کارنامے ہیں —!

مدرسہ عالیہ فتح پوری مفتی صاحب کے اہتمام سے قبل ایک معمولی حیثیت کا مدرسہ تھا۔ اس کے ماہانہ مصارف ۵۰۰ سو سے متجاوز نہ تھے لیکن مفتی صاحب کے زریں دور میں مدرسہ اپنے عروج پر پہنچا تو تقریباً دو ہزار روپے ماہانہ کے مصارف جاری ہوئے۔ درس نظامی کی جماعتوں کے ساتھ ساتھ پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل کی کلاسیں بھی جاری ہوئیں تعلیمی معیار اس قدر بلند ہوا کہ مولوی فاضل امتحان کا اسکالر شپ اور تمغہ چند سال کے لیے تو بالکل فتح پوری ادارہ کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا تھا۔ ہر سال ادارہ سے کوئی امیدوار تمام یونیورسٹیوں میں فرسٹ پوزیشن حاصل کر کے اسکالر شپ اور تمغے کا مستحق بن جاتا ہے مفتی صاحب کی نظر انتخاب نے درس نظامی کے لیے بہترین قسم کے اساتذہ کو جمع کر دیا تھا درجہ حفظ قرات میں بھی طلباء کا ہجوم رہنے لگا تھا۔

مدرسہ عالیہ کے سالانہ جلسہ کے موقع پر فتح پوری مسجد میں دہلی شہر کا ایک نمائندہ اجتماع ہوا کرتا تھا جس میں عام مسلمانوں کے

علاوہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی کافی تعداد میں شریک ہوتا تھا۔ اس موقع پر مدارس عربیہ کی ضرورت و افادیت علم دین کی اہمیت اور مختلف مذہبی مسائل پر مفتی صاحب مرحوم ایسی فاضلانہ تقریریں فرمادیا کرتے تھے کہ سال بھر کے لیے غذاء روح کا سامان مہیا ہو جاتا تھا۔ ان کی تقریروں میں عقل کا امتزاج جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے خاص کشش رکھتا تھا۔

۳۲ء میں جب مفتی صاحب مرحوم اسیر فرنگ ہو کر ملتان سینٹرل جیل میں نظر بند ہوئے تو اس وقت بھی غائبانہ طور پر مدرسہ عالیہ کی سرپرستی فرماتے رہے اور مراسلت کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت مرحوم کے گرامی ناموں کا یہ مجموعہ میرے پاس محفوظ ہے۔ خوشنویسی اور خوش خطی کا ایک شاہکار ہونے کے علاوہ بہت سی عبرتوں اور موعظتوں کا بھی حامل ہے۔

میں نے کسی عریضہ میں درس قرآن کے ختم کی ایک تقریب اور اس میں شرینی تقسیم کیے جانے کا تذکرہ کردیا تھا۔ گرامی نامہ میں اس پر جو تبصرہ فرمایا وہ اصحابِ نظر کی موعظت کے لیے درج کرتا ہوں۔ تحریر فرمایا:

"درس قرآن مجید کے ختم کی کیفیت معلوم ہوئی۔ مسلمانوں کی غلط روی کے مظاہروں کا قصہ بہت طویل ہے اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت کرے۔ بھلا اس وقت جبکہ ملت و وطن کو اشد ضرورتوں کے لیے روپیہ درکار ہے۔ محض شیرینی اور طشتریوں میں ڈھائی سو روپیہ خرچ کر کے خدا کی رضامندی حاصل کی جاسکتی ہے۔

ایں خیال است و محال است و جنوں

ہزارہا بہترین فرزندان وطن جیلوں میں پڑے سڑ رہے ہیں ان کے اہل و عیال فاقے کر رہے ہیں۔ انھیں کوئی نہیں پوچھتا۔ اصحاب اموال خدا کے امین ہے۔ دولت خدا کی امانت ہے۔ غیر مصرف میں خرچ کرنا خیانت ہے جس کا مواخذہ قیامت کے دن ربّ العزت کے دربار میں ہوگا۔"

یہ چند مختصر جملے ہیں جو حضرت مرحوم کے حقیقت نگاہ قلم سے ضمنی طور پر صفحہ قرطاس پر آئے۔ اگر انھی پر غور کیا جائے تو حقیقتاً وہ زرّین اصول ہیں جو قوموں اور اشخاص کے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ خطوط کا یہ مجموعہ تو ایک ایسا نایاب ذخیرہ ہے جس کے جواہر پارے انشاء اللہ مستقل فرصت میں ہدیہ ناظرین کیے جائیں گے۔ عرض کرنا تو یہ تھا کہ یہ دو ڈھائی سالہ زمانہ قید مدرسہ عالیہ فتح پوری اور اس کے متعلقین کے لیے ایک ابتلاء کا زمانہ تھا۔ منتظمہ کمیٹی مسجد فتح پوری میں وہ شخصیتیں بھی کار فرما تھیں جو مدرسہ کے اس عروج کو پیار کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں اور گل چیں کے لیے موقع تھا کہ اس باغ کے نگہبان کی عدم موجودگی میں برہم زن چمن بنے۔ وقت آتا ہے اور چلا جاتا ہے واقعات تفصیل طلب ہیں بس اس وقت اسی قدر گذارش کی جاسکتی ہے کہ اس عرصہ میں کچھ رخنہ اندازیاں ہوئیں۔ مفتی صاحب نے واپس تشریف لاکر اپنی انتہائی قابلیت اور خداداد ذہانت کے ذریعہ نہایت سہولت سے ان کی اصلاح فرمادی اور مخالف طاقتیں مفتی صاحب مرحوم کی ادنیٰ توجہ سے پاش پاش ہو کر رہ گئیں۔

علوم و فنون کی مہارت کے علاوہ حضرت مرحوم میں ایک فطری ذکاوت اور ذہانت ایسی تھی جسے حقیقتاً "فراست المومن" ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس کا ظہور مدرسہ عالیہ کے انتظام میں اکثر ہوتا رہتا تھا۔

اب سے تقریباً ۱۸ برس پہلے کا واقعہ ہے ایک ادھیڑ عمر غیر مسلم مسجد میں آیا اور مسلمان ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ امام صاحب فتح پوری نے حسب معمول اسلام کی تلقین کردی اسی زمانہ میں میں اور بعض اساتذہ مدرسہ عالیہ کے دار الطلبہ ہی میں مقیم تھے اور ہم نے اپنے مطبخ کا الگ انتظام کر رکھا تھا جس میں ایک سادہ لوح نیک دل باورچی کام کرتا تھا۔ یہ نو مسلم رفتہ رفتہ ہم تک پہنچ گیا اور ہم نے ازراہ تالیف قلب اُسے اپنے پاس ٹھہرالیا۔ کپڑے بنائے کچھ مالی مدد کی ساتھ کھانا کھلانا شروع کردیا اور اس کو مدرسہ کی ابتدائی تعلیم میں شریک کردیا۔ کچھ عرصہ بعد ہم نے مفتی صاحب مرحوم سے اس نو مسلم کا سارا حال بیان کیا۔ تحسین و آفریں کی امید پر اب تک اپنی تمام ہمدردیاں بیان کیں اور درخواست حسب عادت مستفسرانہ انداز میں ہم سے معلومات حاصل کرتے رہے اور آخر میں اپنے ایک

خاص انداز میں فرمانے لگے کہ سب سے پہلے تو آپ صاحبان جواب دیں کہ آپ نے بورڈنگ میں اپنے ساتھ کس کی اجازت سے ٹھہرایا ہے؟ گویا مفتی صاحب نے ہماری بے قاعدگی پر گرفت کی۔ اس لیے کہ بورڈنگ میں مہمان کو ٹھہرانے کے ہم مجاز نہ تھے۔

مفتی صاحب کی گرفت اور جواب ہمارے لیے بالکل خلاف توقع تھا۔ ہم تو یہ امید لے کر گئے تھے کہ مفتی صاحب کی مجلس سے اپنے لیے آفرین و تحسین اور نومسلم کے لیے وظیفہ کی منظوری لے کر لوٹیں گے۔ مفتی صاحب کا یہ طرز عمل بہت تلخ اور ناگوار گذرا۔ اور غالباً دلی جذبات ہمارے چہروں پر نمودار ہوگئے۔ تب مفتی صاحب نے بگڑ کر ایک خاص مشفقانہ انداز میں فرمایا۔ بھائی جان اگر اس شخص نے کوئی خطرناک اقدام کردیا تو ذمہ داری کس پر عائد ہوگی۔ بس اس گفتگو پر مجلس برخاست ہوگئی اور ہم دل میں کڑھتے ہوئے واپس آئے۔

کچھ مدت کے بعد نومسلم کا بار ہم پر گراں گذرنے لگا۔ پھر مفتی صاحب کے خیالات اس بارے میں ہمیں معلوم ہی ہوچکے تھے۔ لہٰذا ہم نے نومسلم کو جدا کردینا چاہا۔ اس دوران میں نومسلم ہمارے باورچی سے انتہائی خلاملا پیدا کرچکا تھا۔ جب ہم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش تو ہمیں اپنے اس دیانتدار باورچی سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔

یہ دونوں ہم سے رخصت ہوکر ریاست پٹیالہ میں جا مقیم ہوئے۔ کچھ عرصہ تک تو باورچی کی خیریت معلوم ہوتی رہی لیکن اچانک یہ خبر سننے میں آئی کہ باورچی قید خانے میں ہے اور نومسلم پھانسی پاچکا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ پٹیالہ پہنچ کر نومسلم نے اپنے آپ کو ڈاکٹر مشہور کیا اور پریکٹس شروع کردی۔ ایک دن کوئی نوعمر بچی زیور پہنے دوا لینے آئی تو زیور کے لالچ میں نومسلم نے اس معصوم کو قتل کرڈالا اور اپنی دوکان ہی میں لاش دفن کردی۔ پولیس نے کیس پکڑلیا اور تحقیق شروع کی تو معلوم ہوا کہ وہ عادی مجرم تھا بالآخر وہ تو اپنے کیفر کردار کو پہنچا اور پھانسی چڑھ گیا اور ہمارے باورچی صاحب بھی اس سے تعلق کی بنا پر جیل پہنچ گئے۔ جب ہمیں یہ سارا واقعہ معلوم ہوا تو مفتی صاحب مرحوم کی خداداد فراست کا قائل ہونا پڑا اور دل میں سوچا۔

"رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"

اس قسم کے بیسیوں واقعات جن میں بالآخر مفتی صاحب کی فقید المثال ذہانت اور ذکاوت کا قائل ہونا پڑا اور بارہا قلب نے فیصلہ کیا ہے کہ مفتی صاحب جیسی مجموعہ علم و فضل قابل قدر ہستیاں شاذ و نادر ہی اس عالم امکان میں ظاہر ہوتی ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اپنے بزرگوں کے اصرار پر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر اپنے جستہ جستہ خیالات فی الحال پیش کررہا ہوں۔ اگر سعادت مقدر ہے اور وقت نے فرصت لینے دی تو انشاء اللہ آئندہ مفتی صاحب کی خصوصیات پر کوئی مستقل چیز پیش کروں گا۔ اللّٰھم ارحمھما رحمۃ واسعۃ کاملۃ وتغمدھما بغفرانک یا ارحم الراحمین۔

قطعہ تاریخ

ذاکر ٹونکی

مفتیٔ اعظم کی رحلت کی خبر
دل پہ گہرا نقشِ حسرت ہوگئی
کیوں نہ اُس ہستی پہ سو دل سے نثار
جس کی جاں تک صرفِ ملت ہوگئی
اب کہاں ہر درد کا وہ چارہ گر
بے سہارے آدمیت ہوگئی
سیکڑوں اوصاف کی حامل وہ ذات
آہ! ہم سے آج رُخصت ہوگئی
مغفرت کی ہر زباں پر ہے دُعا
جز و کل مقبول خدمت ہوگئی
آؤ ذاکر یاد تازہ یوں کریں
مفتی الاعلاء کی رحلت ہوگئی

۲ ۷ ۳، ۱ ء

"اگر لارڈ ریڈنگ اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کو جلادیں، حدیث شریف کو مٹادیں اور کتب فقہ کو برباد کردیں۔ تو اسلام پر اپنی جان قربان کرنے والا سب سے پہلا شخص میں ہوں گا۔"

(مقدمہ کراچی میں۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کے بیان کا آخری جملہ)

حضرت مفتی صاحب رح اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب رح

جناب مولانا سیّد محمد ازہر شاہ صاحب قیصر مدیر "دارالعلوم دیوبند"

دل کو روؤں کہ یا جگر کو میر
میری دونوں سے آشنائی ہے

آج سے بائیس تیئیس سال پہلے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے واقفیت اس ماحول میں ہوئی جو مدرسہ امینیہ دہلی میں حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ صاحب کشمیری کے نفوس قدسیہ سے قائم تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اپنے وقت کے ان دو بے مثال عالموں میں گہرے، مخلصانہ اور بے تکلفانہ تعلقات قائم تھے جو اس وقت کی سردی اور گرمی کے باوجود ایک رفتار پر قائم رہے۔ ہر دو بزرگوں کے ان تعلقات کی بنیاد یہ تھی کہ دونوں سیّدنا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور ازہر ہند دارالعلوم کے فاضل تھے۔ دونوں مذہبی اور سیاسی عقائد میں فکر و مذاق کی یکسانیت رکھتے تھے۔ دونوں جمعیۃ علماء کے صفِ اوّل کے رہنما تھے۔ دونوں مذہبی اور سیاسی عقائد میں فکر و مذاق کی یکسانیت رکھتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی علمی اور عملی صلاحیتوں اور کمالات کے مرتبہ شناس تھے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری نے اگر "عالم الدین والدنیا" کہہ کر مفتی صاحب کو خراجِ تحسین ادا کیا اور مختلف مواقع پر ان کے متعلق مدح و تعریف کے وہ کلمات کہے جو اپنے معاصرین میں سے کسی شخص کے متعلق ان کی زبان پر نہیں آئے تو حضرت مفتی صاحب نے بھی حضرت شاہ صاحب کی رفاقت و دوستی کا حق ادا کیا۔ ہمیشہ ان کے احترام میں اپنی آنکھیں بچھائیں۔ ہمیشہ ذاتی معاملات میں انھیں خیر خواہانہ مشوروں سے مستفید فرمایا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی وفات (جون ۱۹۳۳ء) پر حضرت مفتی صاحب مرحوم نے سہ روزہ "الجمعیۃ" میں خود اپنے قلم سے تعزیتی اداریہ سپرد قلم فرمایا تھا اور اس حادثہ عظیم پر اپنے دلی تاثرات کا اظہار کچھ ایسے وزنی اور وقیع الفاظ میں فرمایا تھا کہ آج تک میں اپنے قلب و دماغ میں ان کا اثر محسوس کرتا ہوں۔

آج سے پچاس سال پہلے (دارالعلوم دیوبند کے انعامی جلسہ منعقدہ ۱۳۲۸ھ) سے پہلے کی بات ہے کہ دارالعلوم سے چند نو عمر فاضل نکلے۔ مولوی امین الدین صاحب، مولانا محمد انور شاہ صاحب، مولوی محمد قاسم صاحب دیوبندی اور مولانا حافظ محمد ضیاء الحق صاحب۔ ابتداءً ان حضرات نے مختلف مقامات پر کام کیا۔ پھر اس ارادہ سے دہلی میں جمع ہوگئے کہ یہاں ایک مدرسہ قائم کریں گے اور فکر و نظر کی آزادی کے ساتھ دینی اور علمی خدمت انجام دیں گے۔ سنہری مسجد دہلی میں "مدرسہ امینیہ" کے نام سے انھوں نے چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا۔ مولوی امین الدین صاحب اس مدرسہ کے مہتمم قرار پائے۔ مولوی محمد قاسم صاحب اور مولوی ضیاء الحق صاحب مدرس اور مولانا محمد انور شاہ صاحب صدر مدرس، دہلی میں اس وقت فتح پوری مسجد کا مدرسہ بھی قائم تھا۔ امینیہ کے قیام کے بعد فتح پوری مسجد کے مدرسہ میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم، مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندی مرحوم اور مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مدرس بن کر آگئے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا عبدالسمیع صاحب رحلت فرما چکے تھے۔ اس قافلہ کے صرف ایک مسافر مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی دیوبند میں موجود ہیں۔ انھوں نے ہی حضرت مفتی صاحب کے انتقال کے بعد ہمیں سنایا کہ سنہری مسجد میں مفتی صاحب کس طرح درس دیتے تھے؟ مولوی امین الدین صاحب مدرسہ کا اہتمام و انتظام کس طرح کرتے تھے اور بے مائگی اور بے سرو سامانی کے باوجود یہ حضرات کس طرح اپنے مقصد پر اکٹھے رہے، انھوں نے کتنی تکلیفیں جھیلیں مگر نہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور نہ اپنے مدرسہ کو خالص دینی مسلک اور سادہ و صاف زندگی کی راہ سے ہٹایا۔ امینیہ کے قیام کے کچھ عرصہ بعد حضرت

مولانا امین الدین مرحوم نے حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب کو بھی اپنی پاس بلالیا تھا۔ امینیہ کے پاس اس وقت نہ کوئی عمارت تھی اور نہ چندہ، دفتر تھا اور نہ کتب خانہ، مطبخ تھا اور نہ دارالاقامہ۔ مگر یہ چند نوخیز علماء جنھیں مستقبل میں رازی و غزالی اور ابن دقیق العید، ابن حجر و ابن ہمام کی حیثیت اختیار کرنی تھی، روکھی سوکھی روٹیوں پر سنہری مسجد میں جمع رہے۔ دس اور پندرہ روپے ماہوار سے زائد کسی مدرس کی تنخواہ نہیں تھی اور یہ معمولی سی تنخواہ بھی قلت آمدنی کے باعث کئی ماہ تک نہیں ملتی تھی۔ آج کے دور میں جب امیرانہ شان و شوکت اور بنگلہ، موٹر، فرنیچر، ریڈیو اور ٹیلی فون کے ساتھ چند تقریریں کرنے اور چند بیانات شائع کرنے کو بہت بڑا ایثار اور بہت بڑی قومی اور ملکی خدمت کہا جاتا ہے۔ چالیس پچاس سال پہلے کے اس تصور کو کون سمجھ سکتا ہے کہ چند نوجوان، جن کی جبینوں میں مستقبل کی عظمت و کامیابی اور عظیم الشان شخصیت کا نور جھلک رہا تھا، روٹیوں سے محتاج، لباس سے محروم اور ضروریات زندگی کی فراہمی سے مجبور مطلق بے مائیگی اور تہی دستی کے ساتھ سنہری مسجد میں جمع تھے اور دینی علوم کی خدمت کے لیے اپنے دن رات ایک کر رہے تھے۔

مظفر نگر میں حکیم فتح محمد خاں صاحب، حضرت شاہ صاحب کی اس زندگی کے ایک شاگرد اب تک موجود ہیں۔ علاج کے سلسلہ میں کئی دفعہ حکیم صاحب کے پاس جانے کا اتفاق ہوا اور اس دور کے کچھ حالات ان سے بھی سنے۔ حکیم صاحب کی یہ بات بھی مجھے نہیں بھولتی کہ "اس وقت ادب عربی اور فنون میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم کی قابلیت مسلم تھی اور دہلی میں انہی کا ڈنکا بجتا تھا۔ میں شرح چغمینی پڑھنے کے ارادہ سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا مگر انھوں نے پیرانہ سالی کی وجہ سے اس محنت سے معذوری ظاہر کی۔ حکیم صاحب کہتے تھے کہ پھر میں سنہری مسجد میں شاہ صاحب کے پاس گیا اور یہ کتاب انھیں سے پڑھی۔"

حضرت شاہ صاحب چند سال امینیہ میں رہے۔ پھر اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد اور مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی تجویز پر دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے مگر مفتی صاحب سے آخر دم تک بہترین تعلقات قائم رہے، حضرت شاہ صاحبؒ اپنی وفات سے ۸ سال پہلے دارالعلوم سے جدا ہو کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے تھے۔ اس ہجرت میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مولانا شبیر احمد صاحب، مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حضرت شاہ صاحب کے ہم قدم تھے۔ ڈابھیل آتے جاتے ہوئے حضرت شاہ صاحب ایک دو روز امینیہ میں مفتی صاحب کے پاس ضرور قیام فرماتے تھے۔ یہ بات آج سے بیس بائیس سال پہلے کی ہے مگر تصور کی نگاہ اس منظر کو اب بھی دیکھ رہی ہے کہ صبح ۱۰ بجے حضرت شاہ صاحب کشمیری دروازہ میں امینیہ کی عمارت کے سامنے تانگہ سے اُترے اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ مدرسہ کے مہمان خانہ میں چلے گئے۔ حضرت شاہ صاحب کے ساتھ آٹھ دس سال کی عمر کا ایک بچہ بھی تھا۔ مدرسہ کی بالائی منزل پر اپنے ایک کمرہ میں کتابوں اور کاغذوں کے ڈھیر میں عینک لگائے ایک صاحب کو بیٹھے دیکھا، قریب پہنچا تو یاد آیا کہ ابھی ایک دو سال پہلے انجمن خدام الدین لاہور کے جلسہ میں ان صاحب نے تقریر بھی کی تھی۔ ان صاحب سے کسی نے کہا کہ حضرت شاہ صاحب تشریف لائے ہیں۔ بڑے شوق و محبت کے ساتھ یہ صاحب اُٹھے اور مہمان خانہ میں آکر شاہ صاحب سے برادرانہ بے تکلفی مگر کمال متانت و سنجیدگی کے ساتھ ملے۔ دوپہر کا کھانا مفتی صاحب کے لیے گھر سے آتا تھا مگر شاہ صاحب کی مہمانداری امینیہ میں ہوتی تھی اور مہمان خانہ ہی میں کوئی صاحب کھانا تیار کرتے اور دونوں دوست جمع ہو کر کھانا کھاتے۔ شاہ صاحب کو اپنے ذاتی معاملات میں مفتی صاحب کی رائے پر اعتماد کامل تھا۔ اپنے گھر کی ضروری باتیں بھی مفتی صاحب سے فرماتے اور ان سے مشورہ لیتے۔ کسی موقع پر شاہ صاحب کی اہل خانہ نے اپنی بچیوں کے لیے کچھ زیور اور کپڑے مہیا کرنے کی فرمائش کی۔ اچھی طرح یاد ہے کہ دہلی پہنچ کر حضرت شاہ صاحب نے مفتی صاحب سے اس کا ذکر فرمایا اور ان کا دانشمندانہ مشورہ حاصل کیا۔ دیوبند میں حضرت مفتی صاحب ایک دفعہ حضرت شاہ صاحب کے گھر پر تشریف فرما تھے۔

مکان سے متصل شاہ صاحب کی ایک افتادہ زمین تھی وہاں لے جاکر مفتی صاحب سے پوچھا کہ حضرت یہاں ایک چھوٹا سا مکان مہمانوں کے لیے بنانے کا ارادہ ہے۔ مفتی صاحب نے انکار فرمایا اور شاہ صاحب نے پھر کبھی اس کا ارادہ نہیں کیا۔ ان واقعات سے دونوں کے باہمی تعلقات کی پختگی کا اندازہ کیجیے۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ حضرت شاہ صاحب آخر زندگی میں بعض انتظامی مسائل میں اختلاف کی وجہ سے دار العلوم سے الگ ہو کر ڈابھیل تشریف لے گئے تھے، جن مسائل میں انھیں ذمہ داران دار العلوم سے اختلاف تھا، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ دار العلوم کی مجلس شوریٰ میں کارگزار ارکان جمع کیے جائیں۔ حضرت شاہ صاحب نے حضرت مفتی صاحب، حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی مدظلہٗ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو ممبری میں لینے کا واضح الفاظ میں مطالبہ فرمایا تھا۔ حضرت مفتی صاحب اپنے اعتدال فکر، سنجیدگی و متانت، حق گوئی اور مختلف الخیال افراد کو باہم جمع کر لینے کی صلاحیت میں مشہور ہیں۔ ان کی ان صفات کا بڑا اچھا مظاہرہ دار العلوم دیوبند کے اس زمانہ اختلاف میں ہوا جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ ایک طرف حضرت مولانا حافظ احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سے بھی ان کے تعلقات تھے اور دوسری طرف حضرت شاہ صاحب اور ان کی جماعت کے بھی وہ معتمد تھے، اختلافات کے اس زمانہ میں کئی بار دیوبند تشریف لائے۔ معاملات کو سلجھانے کی کوشش کی اور کئی دفعہ بڑے ہولناک فتنوں کو اپنے تدبر و تفکر سے پیچھے ہٹادیا۔ مگر معاملات میں جانبداری کی بو کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ خالص تعمیری نقطۂ نظر سے دار العلوم کے مفاد کی حفاظت فرمائی۔ شخصیات سے کبھی اپنا دامن آلودہ نہیں ہونے دیا۔ اور پھر دو مخالف طاقتوں سے اس طرح نباہ کی کہ حق گوئی کے باوجود دونوں کی نگاہ میں معزز و مکرم رہے۔ دنیاوی معاملات کا تجربہ رکھنے والے حضرات سمجھ سکتے ہیں کہ دو فریقوں کے درمیان حق گوئی کے ساتھ اپنی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے کو محفوظ رکھنا اور پھر دونوں کی نگاہ میں مقبول رہنا کتنا مشکل کام ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ یہ ملتان کی اسارت کے وقت کا واقعہ ہے یا گجرات کا۔ بہر حال حضرت مفتی صاحب جیل گئے۔ تحریک کشمیر کے سلسلے میں کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی امداد کے لیے رنگون سے آئی ہوئی ایک امدادی رقم ان کے پاس تھی جو کئی ہزار پر مشتمل تھی۔ جیل جانے سے پہلے حضرت مفتی صاحب نے اپنے صاحبزادہ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف کو تاکید فرمائی کہ یہ رقم حضرت شاہ صاحب کے پاس منتقل کر دی جائے۔ وہ اس کے مصرف میں اسے خرچ کریں گے۔ اور واصف صاحب نے حکومت کی قید و بند سے بچ بچاکر آہستہ آہستہ یہ رقم حضرت شاہ صاحب کو بھیج دی۔

یہ واقعہ بہت پرانا ہے۔ مگر بعض واقعات حافظہ میں اپنا اتنا گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں کہ ماہ و سال کی گردشیں ان کی ترو تازگی کو فنا نہیں کر سکتیں۔

دیوبند میں ملتان سے کھلا ہوا حضرت مفتی صاحب کا ایک کارڈ آیا کہ میں کل شام جیل سے رہا کر دیا گیا ہوں۔ آج دہلی روانہ ہو رہا ہوں۔ پرسوں صبح دہلی پہنچوں گا۔ یہ دو سطریں حضرت شاہ صاحب کے لیے ایک پیغام مسرت ثابت ہوئیں۔ وسیع علمی مشاغل اور بے حد سنجیدگی و وقار کے باوجود مسکراہٹ ان کے چہرہ پر کھیل گئی۔ فرط مسرت سے غنچۂ نورس کی طرح کھل کھل گئے۔ تیسرے دن دہلی تشریف لے گئے اور امینیہ کے دروازہ پر علم و فضل کے یہ دو سرمایہ دار پر تپاک طریقہ پر ایک دوسرے سے ملے۔

حضرت مفتی صاحب نے عمر بھر کے ان تعلقات کی پاسداری اس حد تک فرمائی کہ ۴۷ء سے پہلے حضرت شاہ صاحب کا چھوٹا بچہ "انظر" جب دہلی گیا تو اس کے ماہانہ اخراجات کا انتظام مفتی صاحب نے فرمایا۔ ماہ بماہ اسے اپنے پاس بلاکر خرچ کے لیے ضروری رقم دیتے رہے اور قدم قدم پر اس کی اصلاح و تربیت کا خیال رکھا۔ پھر جب کبھی انظر نے انھیں دہلی خط لکھا تو واپسی ڈاک سے جواب عنایت فرمایا۔ اس کی، اس کی والدہ، اور بہن بھائیوں کی خیریت اور حالات دریافت فرماتے رہے۔

دنیا کی بے ثباتی اور فنا پذیری، موت کی گرم بازاری اور

دردناک سانحات کی کثرت نے ولولۂ حیات کو سرد کر دیا ہے۔ کہنا چاہیے کہ دل بالکل مر گیا ہے۔ طبیعت بجھ گئی ہے۔ اب نہ جینے کی آرزو ہے اور نہ اسبابِ زندگی کا شوق، جن بزرگوں کے زیرِ سایہ زندگی کی آنکھ کھولی اور جوانی کا قدم اُٹھایا تھا، جن کے دامنِ علم و فضل پر ہمارے بچپن نے شوخیوں کی اجازت پائی تھی اور جن کے تفریحی کلمات حوصلہ افزا اور محبت آمیز لفظوں سے ہم بے شعوروں، نا سمجھوں اور نامرادوں نے کام کرنے کے ولولے حاصل کیے تھے۔ آج ان میں سے کتنے نکہت گل کی طرح فضا چمن میں بکھر کر رہ گئے ہیں۔ کتنے شہاب ثاقب کی طرح آسمان سے نیچے گر کر ٹوٹ گئے ہیں۔ کتنے شمع سحر بن کر بجھ گئے ہیں۔ کتنے آفتاب سر کوہ کی طرح ڈوب گئے ہیں۔ اپنا سب کچھ لٹ جانے کے بعد بھی اگر انسان اپنے دل کو زخمی اور مجروح نہ پائے تو اور کیا ہو؟ سچ کہا ہے حفیظ جالندھری نے کہ:

احباب ہی نہیں ہیں تو کیا زندگی حفیظؔ
دنیا چلی گئی مری دنیا لیے ہوئے

آج دل غمزدہ اپنے بزرگوں کے مزارات پر ہجر و فراق کے آنسو بہا رہا ہے۔ نگاہیں ایثار و تقویٰ کے ان بلند مناروں کو ڈھونڈتی ہیں جن کی بدولت اس آتش زار حیات میں سایہ تھا، چھاؤں تھی، خنکی تھی اور راحت تھی۔ اِدھر حضرت مولانا انور شاہ کا علم و فضل یاد آتا ہے اُدھر مولانا شبیر احمد عثمانی کی رعد آسا آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مفتی صاحب اب تک ہمارے درمیان ہی میں موجود ہیں۔ دارالعلوم کے جلسۂ شوریٰ میں اب پھر کسی قریبی تاریخ میں وہ مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کے ساتھ ان کی کار میں تشریف لائیں گے۔ ہائے موت کے سخت گیر ہاتھ نے ہم سے بہت بڑی دولت چھین لی۔ ایک ایسا شخص ہم سے جدا ہو گیا جس نے معمولی سی چٹائی پر بیٹھ کر دین و شریعت کے مسائل سلجھائے۔ حکمت و سیاست کی گرہیں کھول دیں۔ معاملات کی پیچیدگیوں کو سلجھا دیا، جو خاموش رہ کر صرف اپنے شخصی اثر اور ذاتی وجاہت سے مسائل کو ان کی اصل ضرورت کے معیار پر حل کر لیتا تھا۔ حق تعالیٰ ان سے راضی ہو کہ انھوں نے اللہ کے دین کے لیے بڑی محنت اور پرایوں سے نہیں اپنوں سے بھی دُکھ اُٹھائے۔

قطعات تاریخ وفات

از حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند

مفتیٔ اعظم فقیہِ بے نظیر — آج رخصت دارِ فانی سے ہوئے
موت کس کی، مفتیٔ اعظم کی موت — ہے قیامت ساری دنیا کے لیے
آج صدرِ منصبِ افتا کہاں — فقہ و علم و فضل و تقویٰ چل بسے
انورؔ و شبیرؔ و منصورؔ وعبید — پاس شیخ الہندؒ کے پہلے گئے
خلد میں تھے منتظران کے یہ سب — اس لیے وہ بھی روانہ ہوگئے

ان کا یہ سالِ وصال آزاد ہے
وہ بھی اپنے شیخ سے آکر ملے

۲ ۷ ۳ ۱ ھ

جامع اوصاف بزرگ

مولانا ضیاء الحق صاحب دہلوی مدرس مدرسہ امینیہ دہلی

میں یوں تو ۱۹۳۸ء میں کالج چھوڑنے کے بعد ہی حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے سایۂ عاطفت میں آگیا تھا، مگر زیادہ قریب سے دیکھنے اور ساتھ رہنے کا موقع ۱۹۴۴ء میں نصیب ہوا۔ جبکہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر حضرتؒ سے فتویٰ نویسی کا کام سیکھنا شروع کیا۔ میں تقریباً نو سال حضرت کی خدمت میں رہا۔ میں نے ان نو سالوں میں کیا کچھ دیکھا اسے تو احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا، کیونکہ زندگی کا وہ کونسا گوشہ تھا جو حضرت نے چھان نہ ڈالا ہو اور ترقی کا وہ کونسا زینہ تھا جو آپ نے چڑھ نہ لیا ہو۔ میں نے تو حضرت کو ایک ایسا خزانہ پایا کہ جس میں سے ہر ضرورت مند اپنی ضرورت کی چیز بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ پا سکتا تھا۔

آج دنیا آپ کو ایک مفتی، فقیہ اور بہترین مدبر کی حیثیت سے جانتی ہے۔ یہ تو ہے ہی کہ آپ اُلجھے ہوئے مسائل کی گتھیاں اس طرح سلجھا دیا کرتے تھے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ قدرت نے آپ کو وہ علمی کمال دیا تھا اور وہ ذہانت و فطانت عطا فرمائی کہ بہت کم لوگوں کو ودیعت کی گئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے عالم آپ کے سامنے سرنگوں بیٹھے رہتے تھے۔

ہند اور پاکستان کیا بر اعظم ایشیا کے مسلمان اگر بھروسہ کرتے تھے تو حضرتؒ کے قلم پر اور بے چون وچرا اگر مانتے تھے تو حضرتؒ کا فتویٰ اور کیونہ ہو آپ کے قلم نے کسی مصلحت کو پیش نظر رکھ کر یا کسی ماحول سے متاثر ہو کر کبھی لغزش نہ کھائی۔ اور آپ کا دل و دماغ کبھی کسی کی حیثیت یا رائے سے مرعوب نہ ہوا۔ بات کی تہہ تک پہنچنے کا آپ میں خاص ملکہ تھا۔ اس لیے مستفتی اُلٹی سیدھی باتیں بتاتے ہوئے بہت گھبراتے تھے۔ دل کا چور آپ فوراً پکڑ لیتے تھے جو جواب ایک مرتبہ لکھ دیتے تھے اس میں مستفتی کے کہنے سننے سے کبھی ایک لفظ کی بھی تبدیلی نہ کرتے تھے۔ اکثر حضرات کو دیکھا ہے کہ فتویٰ کا جواب وعظ کے طرز میں دیا کرتے ہیں۔ میں خود بھی اس مرض میں مبتلا تھا۔ حضرتؒ کو اس بات سے بڑی کوفت ہوتی تھی، فرمایا کرتے تھے کہ فتویٰ فتوے کی جگہ اور وعظ وعظ کی جگہ مناسب ہے۔ ایک بڑی بات یہ تھی کہ اجتہادی قوت اور ملکہ ہونے کے باوجود آپ پکے مقلد اور حنفی المسلک عالم تھے۔ اس مسلک سے ایک اِنچ ہٹنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ باریک بینی اس درجہ کی تھی کہ حدیث اور فقہ کی چھوٹی چھوٹی عبارتوں میں سے بیسیوں معانی و مطالب و مسائل نکال کر رکھ دیتے تھے۔ علماء حیران رہ جاتے تھے۔ مجھے ایک سال تک متواتر حضرت کے درس بخاری و ترمذی میں بیٹھنے کا شرف نصیب ہوا۔ آپ کی تقریر نہایت مختصر اور جامع ہوتی تھی۔ آپ سے دورۂ حدیث پڑھنے سرحد و پنجاب کے طالب علم زیادہ آتے تھے۔ ویسے جاوا، سماترا، بدخشاں اور حجاز کے طالب علم بھی شریک درس رہتے تھے۔ طالب علموں کے بے جا سوال اور ان کی دور از کار بات پر آپ اکثر "دلدر" کہا کرتے تھے۔ گاہ بگاہ طالب علموں سے مذاق کر لیتے تھے، مگر مذاق نہایت پاکیزہ اور لطیف ہوتا تھا۔ کیا حدیث، کیا فقہ، کیا ادب، کیا منطق و فلسفہ ہر فن میں آپ تیرے ہوئے تھے۔ بڑی تنخواہوں پر آپ کو مختلف درسگاہوں نے لینے کی کوشش کی، مگر آپ نے اس تھوڑی سی تنخواہ پر جو مدرسہ امینیہ سے ملتی تھی قناعت کی اور ہمیشہ یہی کہہ کر ٹال دیا کہ محض روپے کی خاطر میں امینیہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔

آپ کے توکل کا یہ عالم تھا کہ آپ سے لوگ کہا کرتے تھے کہ مدرسہ کے لیے آپ کوئی اپیل شائع کر دیجیے تو آپ فرما دیتے تھے کہ بھئی خدا کا کام ہے وہ خود جب تک چلانا چاہے گا چلائے گا اور واقعہ یہ

ہے کہ حضرتؒ کی اپیل کے بغیر لوگ افریقہ، امریکہ اور ہندوستان کے دُور دراز گوشوں سے رقمیں بھیجا کرتے تھے۔ دیانت اور امانت کا یہ حال تھا کہ مدرسہ کا ایک ایک پیسہ نہایت احتیاط سے خرچ کرتے تھے۔ کبھی کسی کو انگلی رکھنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آج تک کسی نے حساب فہمی کا مطالبہ نہیں کیا۔

خودداری کی یہ کیفیت تھی کہ کبھی کسی کا احسان اپنے اوپر نہ رکھتے تھے۔ خیر یہ سب باتیں تو تھیں ہی، ان کے علاوہ بہت سے اور کمالات آپ میں ایسے تھے کہ جو آپ سے قریب رہنے والوں ہی کو معلوم ہیں۔ دوسرے لوگ انھیں سن کر ششدر رہ جاتے۔

دنیاوی کاموں میں آپ کو بڑا تجربہ تھا۔ کھانا آپ بہترین پکالیا کرتے تھے۔ کپڑا نہایت عمدہ کاٹ اور سی لیا کرتے تھے۔ اپنے کپڑے تو اکثر خود ہی سیتے تھے۔ گھر کی صفائی کرنے اور برتن تک مانجھ لینے میں آپ عار محسوس نہ کرتے تھے۔ بازار سے دو پیسے کا سودا بھی خود ہی خرید لاتے تھے۔ آپ کو کوئی اجنبی تنکوں کی ٹوپی اوڑھے، کھڑاویں پہنے سادہ لباس میں پھرتے دیکھ کر کبھی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ دنیا کی اتنی مقبول اور برگزیدہ ہستی ہے۔ اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرنے کے عادی تھے اس لیے کسی کا کیا ہوا کام مشکل سے پسند آتا تھا۔

آپ معمولات کے بہت پابند تھے۔ وقت پر کھانا وقت پر حوائج ضروریہ سے فارغ ہونا، وقت پر لیٹ جانا، وقت پر بیدار ہونا، یہاں تک کہ وقت پر پان کھانا اور پانی پینا آپ کا معمول تھا۔ اسی لیے ضعیفی میں بھی آپ کی صحت بہت اچھی تھی۔

یکم اکتوبر ۱۹۵۲ء مطابق ۹؍ محرم ۱۳۷۲ء کو طبیعت گرنی شروع ہوئی۔ مرض نے طول پکڑا۔ ڈاکٹروں اور طبیبوں نے پوری توجہ اور پوری عقیدت مندی کے ساتھ علاج کیا۔ مگر جو مقدر تھا پیش آیا اور تین ماہ کی سخت علالت کے بعد ۳۱؍ دسمبر ۱۹۵۲ء مطابق ۱۳؍ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ کو یہ علم وعمل کا چراغ گل ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔□□

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

حضرت العلامہ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کے بعد میں کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے کہ ہم یتیم ہوگئے ہوں۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم ہندوستان کے ایک مایہ ناز فرزند اور جدوجہد آزادی کے ایک بے باک سپہ سالار تھے جن سے ہم محروم ہوگئے۔ وہ عصر حاضر کے بے مثال مفکر و مدبر تھے جنھیں ہم اب کبھی نہ پاسکیں گے۔ وہ اپنے وقت کے ابو حنیفہ تھے جن سے اب ہم کوئی استفادہ نہ کرسکیں گے۔ یقیناً پوری ملت اسلامیہ یتیم ہوگئی۔ شاید ایک عرصہ تک یہ خلا پورا نہ ہوسکے گا۔

اللہ والوں کا قاعدہ ہوتا ہے کہ اپنی آخر عمر میں ان کا رُخ دار الآخرت کی طرف ہو جاتا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا رُخ بھی اسی طرف ہوگیا تھا اور انھیں احساس ہو چلا تھا کہ اب وہ جہانِ فانی سے دار البقاء کی طرف جانے والے ہیں۔ شروع ستمبر میں جب مفتی صاحب بیمار ہوئے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میری آواز سن کر آپ اوپر سے نیچے تشریف لے آئے اور نیچے آکر برآمدے میں چٹائی پر لیٹ گئے۔ اس وقت آپ کو ۱۰۲ بخار تھا اور اُبکائی کی تکلیف ہو رہی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ نیچے کیوں تشریف لے آئے میں اوپر آجاتا۔ اور آپ چارپائی پر لیٹئے زمین پر کیوں لیٹ رہے ہیں۔ فرمانے لگے۔ "اسّی سال کا ہوگیا ہوں پچاس برس دہلی میں گذار دیئے۔" میں نے اس جملہ سے سمجھ لیا کہ اب رُخ آخرت کی طرف ہوگیا ہے۔

اس کے کچھ دن بعد مرحوم سے مجھے دوسری بار ملاقات کا اعزاز حاصل ہوا اور اس بار میں نے ان کے چہرہ پر ایک خاص قسم کی بشاشت دیکھی۔ کمزوری اور نقاہت کے باوجود ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم نے مدرسہ امینیہ دہلی میں بیٹھ کر ہزارہا انسانوں کو قرآن و حدیث اور فقہ کا درس دیا اور آپ کے شاگرد تمام عالم اسلام میں پھیل گئے۔ ان کے شاگرد بڑے بڑے نامور عالم ہیں۔ دار العلوم دیوبند میں شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب آپ کے قابل فخر شاگردوں میں ہیں۔

آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ کے شاگرد خاص تھے۔ تمام زندگی تقویٰ اور دیانتداری سے بسر کی۔ غیبت، خیانت اور انتقام کا کبھی تصور بھی آپ کے دل میں نہ آیا تھا۔ وہ اپنے مخالفوں کے ساتھ بھی نیکی کرنے کے عادی تھے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے علماء مثلاً حضرت مولانا انور شاہ محدث کشمیری، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا سجاد بہاری ان کے علم اور تقوے کا اعتراف کرتے تھے۔

میں ان خوش قسمتوں میں سے ہوں جنھیں حضرت مفتی صاحب مرحوم کا قرب حاصل تھا۔ تحریک عدم تعاون کے زمانہ میں ۱۹۱۹ء ہی سے میں ان کے قریب ہوگیا تھا اور جب ۱۹۲۶ء میں حضرت مفتی صاحبؒ کے ہمراہ سفر حج کا موقع ملا اور اس کے بعد ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں ان کے ساتھ گجرات اور ملتان کی جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا تو انھیں سمجھنے کا بہت اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ مفتی صاحب نہ کسی سے خدمت لیتے ہیں اور نہ کسی کو ڈانٹتے ہیں لیکن میں ان خوش نصیبوں میں سے ہوں جس کو مفتی صاحب ڈانٹ بھی لیتے تھے

اور خدمت بھی لیتے تھے اور میں اس میں ایک خاص طرح کی لذت محسوس کرتا تھا۔ وہ دراصل مجھے اپنے بیٹے کی طرح جانتے تھے۔

جیل میں میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم کس قدر بلند کردار کے مالک ہیں۔ ہم لوگوں کو وہاں اخلاقی قیدی بطور خدمت گار کے ملے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے پھٹے ہوئے کپڑے بیٹھ کر سیا کرتے تھے اور اس کے علاوہ بھی ان کے دوسرے کام کر دیا کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ جواب دیا کہ "ان سے کام لینا ظلم ہے۔ وہ میرا جو کام کرتے ہیں اس کا معاوضہ ادا کرتا ہوں حکومت کو ان سے کام لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

گجرات جیل سے مفتی صاحب راقم الحروف سے کچھ قبل رہا ہو گئے تھے۔ انھوں نے جتنے خطوط لکھے ان میں اخلاقی قیدیوں کو سلام لکھتے تھے۔

۲۶ء کے دوران حج میں جب حضرت مفتی صاحب جمعیۃ علماء کا ایک وفد لے کر مؤتمر اسلامی میں شرکت کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے جو اس موقع پر سلطان ابن سعود نے طلب کی تھی۔ میں نے حضرت مفتی صاحب کی جو کیفیت دیکھی اس کا اثر تمام عمر میرے دل پر رہے گا۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان اونٹوں کا سفر تھا۔ جب سب ساتھی تھک کر سو جاتے تو حضرت مفتی صاحبؒ کے لیے کھانا تیار کرایا کرتے تھے۔ خرچ میں اگر گڑبڑ ہوتی تو اپنے پاس سے ادا کر دیتے اور جمعیۃ کے فنڈ پر بار نہ ڈالتے تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مختلف الخیال لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے میں کمال رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک بڑا فراخ دل پایا تھا۔ جس کے ان کے مخالفین بھی معترف تھے۔ جس مؤتمر اسلامی کا اوپر ذکر آیا اس میں علی برادران بھی علامہ سیّد سلیمان ندوی مرحوم کے ہمراہ تشریف لے گئے تھے۔ جمعیۃ علماء کے وفد سے ان حضرات کا اختلاف تھا لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ علی برادران اپنی قراردادوں کی ترتیب و تدوین میں بھی جن سے حضرت مفتی صاحب کو اختلاف ہوتا تھا۔ مشورہ کرتے تھے۔

یہی وہ خوبیاں تھیں جن کی بنا پر تمام طبقوں میں حضرت مفتی صاحب کا بہت بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ حکیم اجمل خاں صاحب حضرت مفتی صاحبؒ کی بے حد تعظیم کرتے تھے۔ خود مفتی صاحبؒ کے مکان پر تشریف لے جاتے اور کبھی اس بات کا موقع نہ دیتے کہ وہ خود حکیم صاحب کے مکان پر آنے کی تکلیف کریں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ دہلی میں ہوتے ہوئے حکیم اجمل خاں صاحب حضرت مفتی صاحب سے عربی میں خط و کتابت کرتے تھے، کاش یہ عربی خط و کتابت کہیں سے دستیاب ہو سکتی اور ہم دو عظیم ہستیوں کے خیالات سے آگاہ ہو سکتے۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ آپ پہلے ایک معاملہ کی پوری طرح چھان بین کر لیتے تھے اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچتے تھے۔

۱۹۲۹ء کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا احمد سعید صاحب جو اس وقت جمعیۃ علماء کے ناظم عمومی تھے ایک سلسلہ میں لاہور جانے والے تھے۔ شاردا بل کی بحث چل رہی تھی کہ مولانا محمد علی مرحوم نے جامع مسجد میں ایک پرزور تقریر کی اور جمعیۃ علماء اور مجلس تحفظ ناموس شریعت پر سخت نکتہ چینی کی اور اس وقت ہونے والی ایک ہڑتال کی مخالفت کی۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحب کی روانگی ملتوی ہو گئی اور حضرت مفتی صاحب مرحوم نے اس التواء کی وجوہ سے خادم کو مطلع کیا اور ساتھ میں تاکید کر دی کہ اس تفصیل کی اطلاع میں مولانا ظفر علی خاں، غلام رسول مہر اور مولانا سالک کو جو اس وقت جمعیۃ علماء کے ہمنوا تھے ان کو خبر نہ کروں تاکہ اختلافات زیادہ نہ بڑھیں۔ دراصل حضرت مفتی صاحب پہلے مولانا محمد علی کے خیالات پرکھنا چاہتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ بعض سطحی اختلافات اتنی شدت اختیار نہ کر جائیں کہ اصل مقصد کو نقصان پہنچے۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم کی اصل خوبی بے نفسی اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے سب سے

زیادہ کام کیااور اس وقت کیا جب لوگ اس طرف آتے ہوئے گھبراتے تھے۔ گاندھی ارون پیکٹ کے وقت تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے تھے لیکن مجھے نہیں چھوڑا گیا تھا۔ میری قید میں صرف دو ماہ باقی رہ گئے تھے حضرت مفتی صاحب مرحوم نے مجھے لکھا کہ آپ کے لیے وائسرائے سے کیا کہا جائے دو ماہ باقی رہ گئے ہیں اور آپ کے لیے اتنا عرصہ گذارنا مشکل نہیں ہے۔ چنانچہ جب میں جیل کاٹ کر باہر آیا تو بہت خوش ہوئے۔

حضرت مفتی صاحب کے بہت سے کام زندگی میں باقی رہ گئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت زیادہ نمایاں نہ ہونا چاہتے تھے۔

اس کے علاوہ بہت سے واقعات ہیں جن سے ان کی بے لوث زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک مجموعہ کمالات تھے اور مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ انھیں قلمبند کر سکوں۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان سے وابستگی رکھنے والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

ایک تاریخی اور ادبی نکتہ

(از جناب مولانا حفیظ الرحمان صاحب واصفؔ)

آخری مغل بادشاہ سراج الدین ظفرؔ کی تاریخ وفات

بجھا ہے چراغِ دہلی

۱۲۷۹ھ

کہی گئی تھی

حکیم اجمل خاں مرحوم کی تاریخ وفات کسی نے کہی تھی:

دلّی کا چراغِ گل ہوا ہے

۱۳۴۶ھ

حضرت مفتی اعظم کی تاریخ وفات مولوی مقبول الرحمٰن خیالؔ سیوہاروی نے نکالی:

ہو گیا گل آہ دہلی کا چراغ

۱۳۷۲ھ

یہی مادۂ تاریخ لوحِ مزار پر لکھوایا جارہا ہے۔

آپ کی سادگی اور فتوے

از: جمیل الدین صاحب دہلوی

میرے قلم میں اتنی طاقت کہاں کہ آپ کی کسی خصوصیت کے متعلق تحریر کرسکوں لیکن جس سادگی، خلوص اور ہمدردی کا نظارہ آنکھوں نے دیکھا ہے طبیعت مجبور کررہی ہے کہ جس ٹوٹے پھوٹے انداز میں ممکن ہو اس کو پیش کردوں۔

آپ نے جو علمی، ادبی، اخلاقی، سیاسی، اور مذہبی خدمات انجام دی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ لیکن آپ کی خدمات کا بڑا حصہ مذہب سے وابستہ رہا ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں جو نصب العین مقرر کیا تھا وہ صرف مذہبی تھا۔ اسی وجہ سے آپ کو مذہب سے ایک خاص قسم کی وابستگی اور دلچسپی تھی۔ مذہبی حکم کے مطابق آپ نے انسانیت کو بھی سینہ سے لگایا اور ہر ایک کے ساتھ نہایت ہی خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں آپ کا کوئی نام لیوا نہ ہو۔ آپ کی ”تعلیم الاسلام“ اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ آپ نے مذہبی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے پیش نظر ہی اسے تحریر کیا ہے۔ اس کتاب کے چاروں حصوں کے مطالعہ کے بعد ایک مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ میں الحمد للہ پکا مسلمان ہو گیا ہوں اور اس پر وہ جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ مجھے جب کبھی کسی مسئلے کے متعلق اُلجھن پیدا ہوئی ہے تو اسی کتاب نے راہ دکھائی ہے۔

مفتی صاحب نے مذہبی معلومات کے ساتھ ساتھ مذہب کے بتائے ہوئے اصولوں پر خود سختی سے عمل کیا ہے۔ دنیا کی نعمتوں کو آپ نے مذہب کی خاطر ٹھکرادیا اور ان سے کوسوں دور ہوگئے۔ طرز زندگی میں بھی آپ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ بلکہ آپ نے ان کے ہر طریقے کو اختیار کرکے دلی محبت کا ثبوت دیا۔ جو لوگ مفتی صاحب سے اچھی طرح واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ مفتی صاحب کے ہاں کتنی سادگی پائی جاتی تھی۔ آپ کی زندگی کا کوئی پہلو بھی ایسا نہ تھا جس میں سادگی نہ ہو۔ اسی وجہ سے جب میں نے مفتی صاحب سے پہلی ملاقات کی تو میں اتنی بزرگ ہستی کو پہچان بھی نہ سکا۔ آج سے تقریباً سات سال پہلے جبکہ ہندوستان کا بچہ بچہ آزادی کے لیے چلا رہا تھا، مسلم لیگ کی تحریک خوب زور شور سے چل رہی تھی اور غیر لیگی علماء کو سربازار گالیاں دی جارہی تھیں۔ آپ کا احترام اس وقت بھی دلوں میں تھا اور ہمت نہیں ہوتی تھی کہ آپ کی شان میں گستاخی کی جائے۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک امنگ پیدا ہوئی کہ مفتی صاحب سے ملاقات کی جائے۔ اس وقت نہ تو آپ کے مکان کا علم تھا اور نہ ہی یہ معلوم تھا کہ آپ کا مرتبہ کتنا بلند ہے۔ ہاں صرف اتنا جانتا تھا کہ آپ ”تعلیم الاسلام“ کے مصنف ہیں۔ آخر دو سال کے بعد وہ وقت آیا جبکہ میری یہ آرزو پوری ہوئی۔ میں ۱۹۴۸ء میں ایک کام کی غرض سے آپ سے ملنے گیا اور آپ کو مکان پر آواز دی۔ اس وقت میرے دل میں اس قسم کے خیالات پیدا ہو رہے تھے کہ نہ معلوم آپ کیسے ہوں گے؟ آپ کے ہاں کی محفل کیسی ہوگی؟ آپ کا رعب و دبدبہ کتنا ہوگا؟ لیکن اس وقت میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جبکہ آپ باہر تشریف لائے۔ آپ کا لباس نہایت ہی معمولی سفید رنگ کا تھا۔ سر پر ٹوپی اور پاؤں میں غالباً کھڑاویں تھیں۔ اس حلیے میں آپ کو دیکھ کر میں بیوقوف یہ سمجھا کہ آپ مفتی صاحب کے ملازم ہیں۔ ان سے میں نے کہا کہ ”کیا مفتی صاحب اندر تشریف فرما ہیں۔“ آپ نے فرمایا ”فرمائیے کیا کام ہے۔“ تب میں سمجھا کہ آپ ہی مفتی صاحب ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اتنی بڑی شخصیت کا آدمی جس کی شہرت کے ڈنکے دنیا میں بج رہے ہوں اور جس کا نام دنیا عزت

سے لیتی ہو اتنی سادگی سے زندگی بسر کر سکتا ہے؟ جبکہ انسان ذرا سی قابلیت ولیاقت کی وجہ سے ہی مغرور ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو نہ جانے کتنا بلند سمجھتا ہے اور نہایت ہی رعب و دبدبہ کے ساتھ زندگی گذارتا ہے۔ اس واقعہ نے میرے دل پر کافی اثر کیا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر واقعی کوئی بزرگی کے لائق اور عزت کے قابل شخص ہے تو وہ آپ ہی ہیں اور آپ "مفتی" بالکل حق بجانب ہیں۔

جب بھی آپ سے کسی امر کے متعلق کوئی فتویٰ منگایا ہے تو آپ نے فتویٰ ارسال کرنے میں ذرا بھی تاخیر سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اسے ہمیشہ اپنا فرض سمجھتے ہوئے سر انجام دیتے رہے ہیں۔ آپ کے فتوے میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ فتویٰ نہایت ہی مختصر مگر ٹھوس سلیس زبان میں صادر کیا کرتے تھے جس کا اندازہ آپ مندرجہ ذیل فتووں سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔

(۱)

بلیک مارکیٹ کے متعلق شرع کیا کہتی ہے۔ یعنی بلیک کرنی جائز ہے یا ناجائز؟ اور یہ کسی حالت میں بھی جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً آج کل آٹے و کپڑے پر راشن ہے تو اس کی بلیک کرنی جائز ہے یا نہیں مفصل تحریر فرمائیں۔

الجواب: بلیک مارکیٹ کرنا ناجائز ہے کیونکہ اس میں مخلوق کے ساتھ ناانصافی اور بے رحمی ہے اور جھوٹ بولنا بھی پڑنے کا قوی امکان ہے۔

(۲)

بہت سے لوگ مہینوں کے خاص دنوں میں اللہ کے واسطے دینا زیادہ افضل سمجھتے ہیں۔ مثلاً ماہِ شعبان کی چودہ تاریخ کو، ماہ محرم کی دس تاریخ کو، بارہ وفات کے مہینے میں بارہ تاریخ کو۔ تو کیا واقعی ان خاص دنوں میں دینا زیادہ ثواب ہے؟ یا ان مہینوں میں سے چاہے جس دن دیا جائے اور اکثر لوگ جمعرات کے دن خیرات دیتے ہیں تو اس دن خیرات دینا بہ نسبت اور دنوں کے کیا زیادہ ثواب ہے؟

الجواب: خیرات کرنے کے لیے کوئی دن مخصوص نہیں، نہ جمعرات کی کوئی تخصیص ہے جب چاہے خیرات کر سکتا ہے۔ رمضان میں خیرات کرنے کی فضیلت ہے۔

(۳)

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے کے متعلق کہ فوٹو کھینچنا اور کھنچوانا شرعی نقطۂ نظر سے کیوں حرام ہے؟ جبکہ زید کہتا ہے کہ متحرک کو ہم ساکن کر دیتے ہیں۔ یعنی شیشے میں دیکھنے سے جو ہماری صورت نظر آتی ہے اسے ہم مستقل کر دیتے ہیں تو وہ فوٹو کہلاتا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں حرام ہے؟ اور اس سے ایک یادگار بھی قائم رہتی ہے۔

الجواب: تصویر بنانا اور اس کو استعمال کرنا شریعت مقدسہ نے ناجائز قرار دیا۔ فوٹو لینا بھی تصویر بنانے کا ایک طریقہ ہے۔ پس وہ ناجائز ہے جبکہ اس سے جاندار کی تصویر بنائی جائے۔ ہاں مکانات اور غیر ذی روح مناظر کا فوٹو لینا جائز ہے جیسے کہ ان کی ہاتھ سے تصویریں بنانی جائز ہیں۔

شریعت مقدسہ نے جانداروں کی تصویریں بنانا اور فوٹو لینا ایک مصلحت سے حرام فرمایا ہے کہ غیر اللہ کی تعظیم اور توقیر کا شائبہ بھی مسلمانوں میں نہ رہے۔

ان اوصاف کو دیکھتے ہوئے اگر ہم مفتی صاحب کو اپنے زمانہ کا ولی کہیں تو مبالغہ آمیز بات نہ ہوگی بلکہ بالکل درست ہوگی۔ مگر حیف آج آپ اس دنیا میں پہنچ چکے ہیں جہاں سب کو جانا ہے۔ آپ کے کوچ کر جانے سے جو نقصانِ عظیم دنیا کے مسلمانوں کو ہوا ہے اس کی تلافی شاید ہی ہو سکے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت مفتی اعظمؒ - کچھ یادیں کچھ باتیں

از: مولانا حفیظ الرحمٰن واصف

غالباً ۱۹۵۴ء میں راقم الحروف نے کراچی کا سفر کیا۔ جیکب لائن میں قیام کیا۔ قریب ہی سید محمد ارتضا صاحب عرف ملا واحدی دہلوی کا مکان بھی ہے۔ ایک روز وہاں جارہا تھا کہ راستے میں مولوی عبدالحق سواتی مل گئے۔ مولوی عبدالحق سواتی فاضل امینیہ حضرت مفتی اعظم کے تلامذہ میں سے ہیں اور جہانگیر پارک کی مسجد کے خطیب ہیں۔ وعظ بھی کہتے ہیں۔ میں ان کو بھی اپنے ساتھ ملا واحدی کے ہاں لے گیا۔ وہاں بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر واحدی صاحب نے حضرت مفتی صاحب کا تذکرہ شروع کیا۔ دوران گفتگو میں مولوی عبدالحق نے کہا کہ ایک روز حضرت دارالحدیث میں مسند پر تشریف رکھتے تھے حدیث کا درس ہورہا تھا کہ ایک طالب علم نور محمد کو آواز دی وہ جب قریب آیا تو فرمایا جاؤ اس عبدالحق کی پگڑی۔ اور گل محمد کی شلوار نمائش میں رکھ آؤ۔ (اتفاق سے اُس روز میرا عمامہ اور گل محمد کی شلوار بے انتہا میلی تھی)

مولوی عبدالحق نے ایک اور واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ میں نے خواب میں دیکھا کہ دارالحدث میں صبح کے وقت ہم لوگ (یعنی درس حدیث کی جماعت) اپنے معمول کے مطابق آکر بیٹھ گئے ہیں۔ اور انتظار کررہے ہیں کہ حضرت تشریف لائیں تو سبق شروع ہو۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لارہے ہیں جو بالکل حضرت مفتی اعظم کے مشابہ ہیں اور حضرت ہی کی طرح ان کی بھی ڈاڑھی سفید ہے۔ دارالحدیث میں تشریف لاکر فرمایا کہ کیا تم لوگ پسند کروگے کہ آج حدیث کا سبق میں تم کو پڑھاؤں۔ میں نے پوچھا کہ حضرت آپ کون ہیں اپنا تعارف فرمایئے۔ فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں میرا نام محمد ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سب طلبہ نے عرض کیا کہ حضرت اس سے بڑھ کر ہماری خوش نصیبی کیا ہوگی کہ آپ حدیث پڑھائیں آپ ہی کی تو حدیث ہے۔ غرض کہ حضور علیہ السلام نے مسلم کی ایک حدیث پڑھائی اور تقریر فرمائی۔ مولوی عبدالحق نے کہا کہ آپ کی وہ پوری تقریر مجھے آج تک یاد ہے۔ اس کے بعد آنکھ کھل گئی اور صبح کو میں حسب معمول مدرسے پہنچا اور دارالحدیث میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جاکر بیٹھ گیا۔ اتنے میں حضرت مفتی اعظم تشریف لائے۔ اپنی مسند پر بیٹھ کر کتاب کھولی اور سبق شروع کرانے کا ارادہ فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا کہو۔ میں نے رات کو جو خواب دیکھا تھا وہ سنایا۔ خواب سنتے ہی حضرت مسند پر کھڑے ہوگئے اور فرمایا عبدالحق قبلہ رخ کھڑے ہوکر خدا کو گواہ کرکے کہو کہ واقعی تم نے اسی طرح خواب میں دیکھا ہے۔ میں حکم بجالایا۔ آپ مسند پر سے ہٹ کر سامنے بیٹھ گئے اور فرمایا عبدالحق تمھارا خواب سچا ہے۔ وہ حضور پُر نور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو اس دارالحدیث میں جلوہ افروز ہوئے تھے۔ مگر عبدالحق تم اپنے ایمان کی خبر لو۔ تمھارا ایمان کمزور ہے۔ تم نے حضور کی ڈاڑھی سفید دیکھی ہے حالانکہ آپ کی ڈاڑھی سیاہ تھی۔

مولوی عبدالحق نے یہ واقعہ ملا واحدی کی موجودگی میں سنایا اور کہا کہ پھر حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ تقریباً چالیس روز تک مسند پر نہیں بیٹھے بلکہ مسند کے سامنے طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر درس دیتے رہے۔

ایک دفعہ اخبار سہ روزہ الجمعیۃ میں ایک تصویر والا اشتہار چھپ گیا۔ آپ نے فوراً ایڈیٹر صاحب کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

مولانا ابوالمعارف محمد عرفان صاحب مدیر الجمعیۃ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

اخبار الجمعیۃ میں دو اشتہاروں میں تصویریں چھپی ہیں۔ تصویر

بناناچھاپناجائز نہیں۔ بالخصوص جمعیۃ کا اخبار ایسی چیزوں سے ملوث نہ ہوناچاہیے۔ محمد کفایت اللہ غفر لہٗ

حضرت صدر محترم کا مراسلہ جو اوپر درج کیا گیا ہے بالکل بجا ہے۔ اور مجھے سخت افسوس ہے کہ الجمعیۃ میں تصویریں چھپ گئیں۔ مگر اس میں میری کوئی کوتاہی نہیں ہے۔ میں سفر حجاز سے واپس ہو کر کچھ ایسی پریشانی اور علالت میں رہا کہ اخبار کا کام نہ دیکھ سکا۔ اور محرر نے یہ اشتہار لے لیے اور وہ درج اخبار ہو گئے۔ بہر حال یہ افسوسناک غلطی ہوئی۔ اور ہمیں اس پر افسوس و ندامت ہے۔ آئندہ انشاءاللہ ایسا نہ ہوگا۔

ابوالمعارف محمد عرفان مدیر الجمعیۃ
(سہ روزہ الجمعیۃ مورخہ ۲۶ راگست ۱۹۲۵ء)

حضرت مفتی صاحب کی منکسر المزاجی کی ایک مثال یہ ہے کہ جب مورخہ ۵ راپریل ۲۲ء کو مولانا عبدالحکیم صاحب صدیقی ناظم جمعیۃ علمائے ہند کا وارنٹ گرفتاری جاری ہوا اور وہ جیل گئے تو حضرت مفتی اعظم صدر جمعیۃ علمائے ہند اور چار پانچ حضرات ان کو جیل تک پہنچانے کے لیے گئے۔ اور مولانا کو خدا کی حفاظت میں چھوڑ آئے۔
(ہفتہ وار مسلم دہلی مورخہ ۸ راپریل ۱۹۲۲ء)

حضرت مفتی صاحب کے ایک شاگرد مولوی سید محمد فاروق (ناظم "بچوں کا گھر") کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک استفتاء صوبہ سرحد سے آیا۔ سوال یہ تھا کہ ایک شخص نے اپنے خسر کو جو مشہور عالم دین تھے زدوکوب کیا اور سخت توہین کی۔ اس پر جواب لکھا ہوا تھا اور بہت سے علماء کے تصدیقی سرٹیفکیٹ تھے۔ تمام جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ عالم دین کی توہین دین کی توہین ہے اور اس کا مرتکب کافر ہے۔ لہٰذا وہ شخص کافر ہو گیا۔ مولوی محمد فاروق کہتے ہیں کہ میں نے بھی ان تمام جوابات کی تصدیق کی اور حضرت کے سامنے پیش کیا۔ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ یہ تمام جواب غلط ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مارنے والا کافر نہیں ہوا کیونکہ اس نے عالم کی توہین نہیں کی بلکہ اُس شخص کی توہین کی ہے جو کسی خانگی اور نجی جھگڑے میں اس کا مخالف تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اتفاقاً وہ عالم دین بھی تھا۔ لہٰذا اس مارنے والے پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔

ایک مرتبہ ایک استفتاء آیا۔ سوال یہ تھا کہ ایک مسجد تعمیر کی جارہی تھی۔ ایک شخص کا مکان اس کے متصل تھا۔ وہ اس کی توسیع میں حائل ہوتا تھا۔ مالک مکان سے کہا گیا کہ اپنے مکان میں سے تھوڑا سا حصہ مسجد کو دے دے۔ اس نے مسجد کی شان میں نامناسب الفاظ کہے۔ آیا وہ شخص کافر ہوا یا نہیں؟ مولوی محمد فاروق صاحب نے اس کا جواب لکھا کہ چونکہ مسجد شعائر اللہ میں سے ہے اور شعائر اللہ کی توہین کفر ہے لہٰذا وہ شخص کافر ہو گیا۔ جواب دیکھ کر حضرت نے فرمایا کہ ابھی سے تم نے کافر سازی شروع کر دی۔ مفتی بن جاؤ گے تو کیا کرو گے؟ کیا تم نے وہ حدیث نہیں پڑھی کہ جس شخص میں ننانوے باتیں کفر کی ہوں اور ایک بات ایسی ہو جس سے اس کے اندر ایمان ثابت کیا جا سکتا ہو تو اس کو کافر نہ کہو۔ مولوی صاحب نے دریافت کیا کہ اس سوال میں تو مسجد کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ پھر کفر کیوں نہیں ثابت ہوگا۔ فرمایا کہ پہلے اس بات کو ثابت کرو کہ وہ مسجد حقیقت میں مسجد ہی ہے۔ فرض کرو کہ وہ مسجد زمین منصوبہ پر بنائی گئی ہو اور اُس شخص کو یہ بات معلوم ہو گئی ہو اس لیے اس نے نامناسب یا توہین آمیز الفاظ کہے ہوں اس لیے اتنی جلدی ایک مسلمان کے کفر کا حکم نہیں دینا چاہیے۔

حکیم محمد بشیر مرحوم دہلی کے ایک مشہور طبیب اور خوشنویس تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک مقدمہ کے سلسلے میں عدالت میں پیش کرنے کے لیے ایک استفتاء مرتب کیا گیا اور اس پر ہندوستان کے مشاہیر علماء سے جواب منگائے گئے۔ آخر میں وہ تمام جوابات اور تصدیقی دستخط وغیرہ لے کر میں سنہری مسجد میں حاضر ہوا (اس زمانے میں مدرسہ امینیہ سنہری مسجد میں تھا) اور وہ استفتاء حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا کہ تمام جوابات غلط ہیں۔ عرض کیا کہ آپ جواب تحریر فرما دیجیے۔ فرمایا کہ علیحدہ سادے

کاغذ پر سوال کو نقل کر دو۔ میں نے کاغذ لے کر سوال نقل کر دیا۔ آپ نے قلم برداشتہ دو سطروں میں ایسا جامع و مانع جواب لکھا کہ وکلا اور جج اس کی عبارت کی خوبی و بلندی کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

ایک مرتبہ راقم الحروف (واصف) ریل کے سفر میں حضرت والد ماجد کے ہمرکاب تھا۔ جس ڈبے میں ہم دونوں تھے اسی میں دہلی کے سوداگروں میں سے دو معزز دولت مند حضرات بھی ہم سفر تھے اور ان کے قریب دو تین بھاری بھر کم قادیانی مولوی بھی بیٹھے تھے اور مرزا غلام احمد کی صداقت اور نبوت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ان میں سے ایک بڑا مولوی بڑے زور شور سے بول رہا تھا۔ بڑا لسان اور طرار معلوم ہوتا تھا۔ حضرت والد ماجد کچھ فاصلے پر تھے اور ان لوگوں کی گفتگو سن رہے تھے۔ قادیانیوں کے مخاطب کبھی کبھی جواب دیتے تھے مگر پھر لاجواب ہو جاتے تھے۔ آخر حضرت نے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کی گفتگو میں دخل انداز ہونا نہیں چاہتا تھا مگر یہاں معاملہ دین کا ہے اس لیے خاموش نہیں رہ سکتا۔

میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے جو ابھی یہ فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور مرزا صاحب کی نبوت سے ختم نبوت میں کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ مرزا صاحب کی نبوت حضور کی ہی نبوت کا ایک جزو اور ضمیمہ ہے تو یہ تو فرمایئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا نبی بعدی میں تو کسی خاص قسم کی نبوت کی تخصیص نہیں ہے مطلق نبوت کی نفی ہے۔ ضمنی غیر ضمنی اور ظلی بروزی کی تخصیص کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ لائے نفی جنس نے نبوت کے تمام اقسام واصناف کی نفی کر دی ہے۔ پھر بیچ میں نبوت ضمنی کیسی؟

قادیانی مولوی نے جواب دیا کہ جس طرح سچا خواب نبوت کا چالیسواں حصہ ہوتا ہے اسی طرح ضمنی نبوت بھی ہوتی ہے۔ اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا دائرہ عمل قیامت تک ہے اور آپ خاتم الانبیاء ہیں اس لیے آپ کے ہی دین کی تجدید کے لیے نبی آسکتا ہے اور اس سے آپ کے ختم نبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

حضرت مفتی اعظم نے فرمایا۔ نبوت کا چالیسواں حصہ اگر کسی کو عطا فرمایا جائے تو وہ شخص نبی نہیں بن جائے گا انسان کی ایک انگلی کو انسان کا لقب نہیں دیا جاسکتا۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو آپ کے دعوے کے مطابق قیامت تک کے لیے نبی ہیں۔ پھر حضور کا یہ فرمانا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا؟ بولیے جواب دیجیے!

حضرت نے کئی مرتبہ فرمایا۔ بولیے جواب دیجیے۔ مگر اُدھر ایسا سناٹا چھا گیا کہ صدائے برنخاست قادیانی اک دم مبہوت ہو گئے بالکل جواب نہ دے سکے۔

پھر فرمایا کہ آپ لوگوں کا یہ کہنا کہ حضور قیامت تک کے لیے نبی ہیں خود اس امر کا اقرار ہے کہ حضور کی بعثت کے بعد نبوت کا عہدہ کبھی کسی کو عطا نہیں کیا جائے گا۔ دوران نبوت میں کسی اور نبی کی بعثت کے کیا معنی؟ اور اس کی ضرورت کیوں؟ بولیے جواب دیجیے! مگر صدائے برنخاست۔

قادیانیوں پر اوس پڑ گئی اور شکست خوردگی کی وجہ سے چہرے زرد اور ہونٹ خشک ہو گئے اور بالکل ساکت وصامت ہو گئے تو حضرت والد ماجد نے تقریباً ایک گھنٹے تک قادیانیت کے رد میں مسلسل تقریر کی۔

اس کے بعد دلی کے ہم سفر حضرات نے دریافت کیا کہ حضرت آپ اپنا تعارف تو فرمایئے۔ فرمایا کہ مجھے کفایت اللہ کہتے ہیں۔ مدرسہ امینیہ کا مدرس ہوں۔

اُس وقت کا منظر بڑا عجیب تھا۔ ڈبے کے تمام ہم سفر مسلمانوں نے بھی یہ تمام گفتگو سنی تھی بہت شکریہ ادا کیا اور ان دولت مند حضرات نے کہا کہ حضرت ہم تو مذبذب ہو گئے تھے۔ آپ نے بروقت ہماری دستگیری کی۔ اور اپنی اس کوتاہی پر بڑے نادم ہوئے کہ دلی میں رہتے ہوئے ہم شرف ملاقات سے محروم ہیں۔

اُدھر قادیانی مولویوں کا یہ حال تھا کہ آپس میں اِدھر اُدھر کی

باتیں کرنا بھی بھول گئے تھے۔ اُس وقت غالباً راقم الحروف کی عمر تیرہ چودہ برس کی تھی۔ (اور اب غفلت و معصیت کی اٹھاون منزلیں طے ہو چکی ہیں) افسوس کہ والد ماجد کی بحث اور محققانہ تقریر نہ تو میں سمجھ سکتا تھا نہ یاد رہ سکتی تھی۔ اتنا خوب یاد ہے کہ بحث تو کچھ زیادہ ہوئی ہی نہیں دو چار جملوں میں ہی قادیانی مولویوں کا کام تمام ہو گیا۔ البتہ بعد میں تقریر خاصی طویل اور مفصل تھی۔ واقعہ کا ایک خاکہ ذہن میں محفوظ تھا جو اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں تحریر کر دیا ہے۔

غرض نقشے ست کز ما یا د ماند
کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحبدلے روزے برحمت
کند در کار درویشاں دُعائے

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العٰلمین

حفیظ الرحمان واصف
صفر المظفر ۱۳۸۶ھ

قطعۂ سوانح حیات و تاریخ وفات
حضرت مفتی اعظم قدس سرہٗ

از مولانا قاری ثروت حسین صاحب ناظم مکتبۂ اسلامیہ و مدرسہ فیض عام سیوہارہ

بود دہلی مسکنش شاہِ جہاں پورزاد بوم
دفن نزدِ قطب عالم قطب ذیں قطب العلوم

فیضیاب از بحرِ شیخ الہند محمود الحسنؒ
مفتیٔ اعظمؒ بہر فن بود ماہر بالعموم

مہرِ رخشانِ علومش از امینیہ بتافت
طالبان را شمع فضلش بود باعث للہجوم

پیکرِ ایثارِ حق پروانۂ شمع ہدیٰ
لم یخف فی الله حینا جور سلطانِ ظلوم

بود او وقت ظہور اخترِ کمال و نیک زیست
رحلتش واضح شود از خاتم فقہ علوم

قطعہ

از مفتی سید مہدی حسن

میں نے پوچھا مفتی اعظم کہاں
بولا رضواں ہیں وہ جنت میں مقیم

مجھ سے ہاتف نے کہا سالِ وفات
لکھ دے، اب ہیں ساکن باغِ نعیم

۱۳۷۲ھ

روزنامہ "الجمعیۃ" کے

مفتی اعظم نمبر

کی اشاعت نو پر

جمعیۃ علماء ہند اور ادارہ ہفت روزہ الجمعیۃ کو

مبارکباد

منجانب

سلطان ٹینرز اینڈ ماڈل ایکزم

جاج مئو، کانپور، انڈیا

JAJMAU, KANPUR, INDIA

فون: 450644, 450694، فیکس: 451579, 4501700

حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی محمد کفایت اللہ قدس اللہ سرہٗ کا شعری ذوق

ترتیب: محمد سالم جامعی

حضرت مفتی صاحب عربی، فارسی اور اردو زبان میں اچھا خاصا شعری مذاق رکھتے تھے۔ جب جیل میں گرفتاری کے دوران ہفتہ وار مشاعرے ہوا کرتے تھے تو ان میں خود تو شریک نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی عالمانہ وقار کی وجہ سے خود پڑھ کر سناتے تھے تاہم ان مشاعروں کے لیے آپ کچھ اشعار ضرور لکھ لیتے تھے۔ جنھیں مولانا احمد سعید پڑھ کر سناتے تھے۔ جب مشاعرہ کا دور چلتا تو حضرت مفتی صاحب اکثر غزلوں کی اصلاح کیا کرتے تھے۔ یہ ایک رواج سا بن گیا تھا کہ جب کوئی شخص جیل سے رہا ہوتا تو اس کے لیے قصیدہ لکھا جاتا اور حضرت مفتی صاحب کی اصلاح کے بعد اس کو پڑھ کر سنایا جاتا۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین لاہور لکھتے ہیں کہ:

"نیو سینٹرل جیل ملتان میں تقریباً ہفتہ میں ایک دن مجلس مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ اس مشاعرہ میں ہندو و مسلمان سب شریک ہوتے تھے، حسن اتفاق کہ اکثر شاعر مسلمان ہوتے تھے، ہندوؤں میں سے بہت سے قیدی اس مشاعرے میں حصہ لیا کرتے تھے۔ اس مشاعرہ میں حضرت مفتی صاحب کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ اشعار تو حضرت مفتی صاحبؒ کے ہوتے تھے۔ البتہ مجلس مشاعرہ میں آپ تشریف نہیں لاتے تھے۔ آپ کی طرف سے مخدوم العلماء حضرت مولانا احمد سعید صاحب سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند وہ اشعار مجلس مشاعرہ میں پڑھ کر حاضرین کو محظوظ فرمایا کرتے تھے۔

اردو میں بھی کبھی اشعار موزوں فرماتے جیسا کہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی ملتان جیل سے رہائی کے وقت اردو کا قصیدہ لکھ کر انھیں ایک جلسہ میں سنوا دیا جو جیل میں ہی منعقد ہوا تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ممدوح کے نام کا نہایت موزوں سجع بھی حضرت مفتی صاحب نے خود ہی موزوں فرمایا تھا جو یہ ہے:

خدمت خلق بود　　خلق حبیب الرحمٰن

جس سے آپ کی ادبیت اور طبیعت کی موزونیت واضح ہوتی ہے۔

مارچ ۱۹۳۳ء میں ملتان جیل سے مولانا احمد سعید، حضرت مفتی اعظم سے پہلے رہا ہوئے تو حضرت نے ان کی جدائی پر اپنے دلی جذبات کا یوں اظہار فرمایا:

چل دیا وہ حالِ دل سے بے خبر
جان و دل کا ہے سفر جس کا سفر

جس سے وابستہ تھیں میری راحتیں
جانتا تھا میں جسے قلب و جگر

کنج تنہائی کا میرے تھا رفیق
مونس جان تھا سفر ہو یا حضر

مولوی احمد سعید خوش تھا
واعظ آتش بیاں جادو اثر

شیر دل کان مروّت سیر چشم
پیکر صدق و وفا والا گہر

ناظم جمعیۃ اعلام ہند
تجربہ کار و امین و باخبر

چھوڑ کر زندان میں مجھ کو چل دیا
پھیر لی اُنس و محبت کی نظر

تیری فرقت کا تصور الغیاث
الحذر تیری جدائی الحذر

تیرے دَم سے قید خانہ باغ تھا
اور ترے اخلاق تھے اس کے ثمر

چونکہ راضی القضا تھا اس لیے
قید کا مطلق نہ تھا تجھ پر اثر

تھی بدولت تیرے بزم عیش گرم
جیل میں دن رات اور شام و سحر
ملک تیری دوستوں پر وقف تھی
جان بھی دیتا کوئی لیتا اگر
رعب و ہیبت سے تری اے مردِ حق
فوجِ باطل ہو گئی زیر و زبر
یہ حقیقت ہے کہ کرتی ہے تری
خوش بیانی دل میں پتھر کے اثر
بے شبہ ہے تیری تقریر بلیغ
دل نشینی میں کنقشِ فی الحجر
باغ جمعیۃ مساعی سے تری
سبز و شاداب و شگفتہ پرثمر
تیرا دل ہے مال و زر سے بے نیاز
فضل حق پر رہتی ہے ہر دم نظر
حق ترا حامی ہو اور طالع سعید
اور قدم چومے ترے فتح و ظفر
ہو تری اولاد تیری جانشیں
مثل تیرے بلکہ فائق ہوں پسر
کارناموں کو ترے زندہ رکھیں
اور ہر ایک ان میں ہو سرِّ پدر
اور ہو دارین کی آفات سے
فضل مولیٰ واسطے تیرے سپر
مورد الطاف باری تو رہے
عمر بھر ہر سال ہر شام و سحر
پھولتے پھلتے رہیں تیرے فیوض
صیت ہو تیرا محیط بحر و بر
لطف سے تیرے ہے امید قبول
پیشکش ہے گرچہ میری مختصر
محمد کفایت اللہ عفاعنہ مولاہ، اسیر سیاسی اے کلاس، نیو سینٹرل جیل

ملتان، بارک نمبر ۱۱، کمرہ نمبر ۴، مورخہ ۱۱/مارچ ۱۹۳۳ء مطابق ۱۴/ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ

حضرت شیخ الہندؒ کی ہندوستان آمد پر بھی آپ نے ایک خیر مقدمی نظم کہی تھی جو حسب ذیل ہے:

قدوۂ اہل یقین و زبدۂ اربابِ دین
پیشوائے سالکین و مقتدائے عارفین
محرم اسرار وحدت ہادیٔ مسترشدین
قافلہ سالار عرفاں رہبر راہ یقین
جاں نثارانِ جمال لم یزل کے رہنما
رازدارانِ لقا کے صدر مجلس بالیقین
حافظ و شیخ الحدیث و رحلۂ و حجت امام
وقت کے ابن مبارک ثانی ابن معین
مایہ صد ناز اہل ہند فخر مومناں
فخر جانبازاں ملت فخر ضل صادقین
چرخ حقانیت و اخلاص کے مہر منیر
افتخار ملک و ملت حامی دین مبین
اہل ایماں کے لیے کافی ہے ان کا اتباع
ان کی الفت مخلصوں کے واسطے حصن حصین
آپ کا چہرہ ہے یا آئینہ حقانیت
قلب ہے حضرت کا یا اللہ کا عرش بریں
قلب مومن میں سماتا ہے خدائے ذوالجلال
ان مخلصوں کے دل میں عرش پاک رب العالمین
دورِ حاضر میں صداقت استقامت کی مثال
ان سے بہتر تم کو مل سکتی نہیں ہرگز کہیں
خوف غیر اللہ کا دل میں گذر ہو کیا مجال
پاک ظاہر، پاک باطن، پاک دن اور پاک دین
وعدہ ہائے وصل محبوب ازل پیش نظر
جس کے ہو جائیں وہ باطل سے ڈرے ممکن نہیں

ضیغم حقانیت شیر وفا مردِ خدا
نام ہی سے جس کے بھاگے فوج شیطانِ لعین
استقامت وہ دکھائی جس سے ششدر رہ گئے
دشمناں بدگہر اور حاسدانِ کاشحسین
جبر و استبداد کی تھیں جتنی چیرہ دستیاں
نقش سطحِ آب سے زیادہ نہ قائم رہ سکیں
چیرہ دستی جبر و استبداد کی ہے بادمشت
سرفروشانِ رضا پر اس کا کچھ قابو نہیں
مہر و استبداد کی اس تلملاتی دھوپ میں
سایۂ طوبیٰ تھا بے شک ان کا ظلِ آستین
آپ کی ہی مخلصانہ کوششوں سے آج ہیں
جبر و استبداد قعر رنج و غم میں تہہ نشیں
خوف حاکم، خوف عزت، خوف فخر و خوف جان
کردیا سب کو فدائے خوف رب العالمین
حب جان و حب جاہ و حب اہل و حب مال
سب کی سب ہی حب مولیٰ پر سے قرباں ہوگئیں
نقش تقویٰ، نقش حقانیت و نقش عمل
نقش اخلاص و وفا سب اس کے ہیں نقش نگیں
فیض علمی سے تمہارے ہی بنا تھا دیوبند
رشک گلزار جناں وغیرت خلد بریں
چہچہاتے رہتے تھے ہر وقت مرغانِ چمن
رات دن بیدار تھی نرگس کی چشم خواب گیں
مامن حق سے چلے جب صلح کل ہوکر اسیر
کیوں نہ لرزے آسمان اور کیوں نہ تھرائے زمین
جو خدا کے گھر میں اس کے دوست کو کر کے اسیر
دشمنانِ حق کو دیدے کون ہے اے مومنین
مالٹا میں علم و عرفان کا سمندر تھا اسیر
کیا جزیرے میں سمندر تم نے دیکھا ہے کہیں

نسبت خاصانِ حق کا اثر ہے دوستو!
مالٹا جو ایک مکاں تھا ہوگیا دل میں مکین
گلشن ایمان کے خوش رنگ اور ممتاز پھول
جس کی فرقت سے تھے سارے اہل ہند اندوہگیں
مخلصوا بشریٰ لکم مردانِ حق کا قافلہ
ہیبتِ حق جس کی آوازِ جرس کے ہے قرین
آرہا ہے سوئے ہندوستان نرالی شان سے
نورِ حق چہروں سے روشن دل میں ایمان و یقیں
جس نے سوتوں کو کیا بیدار گہری نیند سے
مالٹا سے آرہا ہے پھر وہی شیر عریں
قم باذن الہ کہہ کر خلق کو زندہ کیا
پھونک دی مردہ تنوں میں روح ایماں بالیقین

حافظ احمد بدات راندیری کے انتقال پر آپ نے فارسی میں حسب ذیل تاریخ وفات لکھی:

۱۔ حافظ احمد بداتِ متقی	آنکہ در دنیا برائے ورع زاد
۲۔ عمر خود در راہ مولیٰ صرف کرد	عیش دنیا بہر دیں برباد داد
۳۔ داعی حق را بدل لبیک گفت	واصلِ حق گشت و فائز بالمراد
بہر تا ریخش چو کردم اعتنا	گفت ہاتف در دلم مغفور باد
	۳ ۳ ۳ ۱ ھ

آپ کے استاذ و مربی حضرت شیخ الہندؒ جب مالٹا میں قید کردیئے گئے تو اس وقت آپ نے عربی میں ایک قصیدۂ فراقیہ تحریر فرمایا تھا جو حسب ذیل ہے:

الایا مالٹا، طوبیٰ و بشریٰ
لولی بلکِ من محا آثار کفرِ
ولم تك قبله الا خراباً
خمولاً غیر معروفٍ بخیرِ
فلمّا حلّها عادت ریاضاً
منضرةً من التقویٰ و ذکرِ

مكلّةً بازهار المزايا
وازهارُ المزايا خيرُ زهرِ
الا يا مالثا! كونی سلاماً
علی محمودِنا الراضی بقدرِ
امامُ الخلق قدوَتهم جميعاً
له كرمٌ الی الا فاقِ يسری
جنيد العصر سرّی الزمانِ
غيوثُ فيوضهِ تهمی و تجری
فريدٌ فی خلائقهِ العِذاب
وحيدٌ فی التقی من غير فخر
اشدُّ الناس امثلهم بلاءً
فياشمسَ الهدیٰ يا طود حبهٖ
ذكرنا يوسف الصديق لمّا
أُسرِت بغير استحقاقِ اسرِ
لحر البين فی صَدر الكئيب
تفيضُ دُموعه حمراً كجمرِ
سينزلك العزيز محلّ عزّ
ويَنصرك النصير اعزّ نصرِ
سيكفيك الا له فانت مرءٌ
كفاك الله قدماً كلّ شرِ

ترجمه از واصف

(۱) سن اے مالٹا! مبارک ہو تجھے یہ مژدہ کہ تیرے اندر کفر کا مٹانے والا ایک مرد مجاہد مقیم ہوا ہے (۲) اور اس سے پہلے تیری حیثیت ہی کیا تھی۔ تو ایک گمنام ویرانہ تھا کہ تیرا ذکر خیر دنیا میں کہیں بھی نہ تھا (۳) جب مالٹا میں اُس مقدس ہستی نے ورود فرمایا تو وہ تقویٰ اور ذکر اللہ کا ایک ایسا سرسبز باغ بن گیا (۴) جس میں فضائل و معالی کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور حقیقی بہار تو فضائل و معالی کی ہی بہار ہے (۵) ہاں اے مالٹا! سلامتی ہو جا! ہمارے محمود پر جو راضی برضائے الٰہی (ہو کر تیرے اندر جلوہ افروز ہوا) ہے (۶) جو عصرِ حاضر میں پوری قوم کا امام اور پیشوا ہے اور اس کی عظمت کا آوازہ تمام عالم میں پہنچا ہوا ہے (۷) وہ زمانے کا جنیدؒ اور وقت کا سری سقطیؒ ہے، اس کے فیوض کی بارشیں برستی اور سیل رواں بنتی ہیں (۸) اپنے شیریں خصائل میں یگانہ اور تقویٰ میں یکتائے زمانہ اور منکسر المزاج ہے (۹) جو انسان برگزیدہ اور عالی مرتبہ ہوتا ہے اس پر آزمائشیں بھی سب سے زیادہ سخت آتی ہیں، تو اے آفتابِ ہدایت اور اے کوہِ تحمل (۱۰) جب تجھ کو بغیر اثباتِ جرم کے قید کر دیا گیا تو ہمیں حضرت یوسف علیہ السلام یاد آ گئے (۱۱) آہ! ایک مضطرب کے سینے میں غم و فراق کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس کی وجہ سے اس کے سرخ آنسو انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے نکل رہے ہیں۔ (۱۲) عنقریب آپ کو خدائے عزیز مقام عزت پر فائز فرمائے گا۔ اور بڑی زبردست مدد فرمائے گا (۱۳) اور عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کی مکمل حمایت و نصرت فرمائے گا کیونکہ آپ ہی وہ مرد مجاہد ہیں جسے خدا نے ہمیشہ ہر قسم کے شر سے بچایا ہے۔

ان کے علاوہ آپ کا مدرسہ امینیہ سے متعلق ایک طویل قصیدہ بھی ہے جس میں حضرت مفتی صاحبؒ نے مدرسہ امینیہ کے احوال کو تفصیل سے ذکر کیا ہے، جسے آپ نے روض الریاضین کے نام سے اپنی زندگی ہی میں طبع کرا دیا تھا۔ یہ مکمل قصیدہ حسب ذیل ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ آپ کو عربی نظم و نثر پر کس قدر قدرت حاصل تھی۔ اس کا ترجمہ خود حضرتؒ نے ہی فرمایا تھا جو ساتھ ساتھ موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے استاد، عربی حضرت شیخ الہندؒ کی تعریف میں ایک طویل عربی قصیدہ تحریر فرمایا تھا جس میں حضرت شیخ الہندؒ کی تعریف و توصیف کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کا بھی بہت خوبصورت انداز میں تذکرہ فرمایا ہے۔ یہ قصیدہ بھی ہمرشتہ شریک ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرفت الله ربي من بعيد
اپنے پروردگار کو میں نے دور سے پہچانا
فكم بين الإله والعبيد
کیونکہ خالق اور بندوں کے درمیان بہت فاصلہ ہے

عرفت الله ربي من قريب
اپنے پروردگار کو میں نے نزدیک سے پہچانا
أشد القرب من حبل الوريد
اور وہ نزدیکی میری شہرگ کی نزدیکی سے بھی زیادہ ہے

قريب رحمة منا وعلما
وہ بلحاظ علم و رحمت ہم سے قریب ہے
بعيد في اكتناه عن بعيد
اور ادراک ذات میں بے انتہا دور ہے

تعالى عن سمات النقص طرا
تمام صفات رذیلہ ناقصہ سے منزہ ہے
تقدس في الصفات عن النديد
صفات کمالیہ میں کوئی اس کا شریک نہیں

فليس كمثله شيء وليست
کوئی چیز اس کے مانند اور مشابہ نہیں
مشاركة الأسامي في العديد
اور محض نام کی شرکت کسی شمار میں نہیں ہے

تنزه عن مشابهة وجنس
وہ ہر قسم کی مشابہت اور مجانست سے بری ہے
فسبحان المقدس والمجيد
پس ہم اس پاک اور بزرگ کی پاکی بیان کرتے ہیں

أنار صدورنا علما وحكما
ہمارے سینوں کو علم و حکمت سے روشن کردیا
وآتانا كتابا من حميد
اور خدائے حمید کی جانب سے ایک کتاب ہم کو دی

كتاب جاء بالحق المبين
وہ کتاب جو کھلے ہوئے حق کو اپنے ساتھ لائی
أقام الدين رغما للعنيد
اور دین کو منکرین کی مرضی کے خلاف قائم کردیا

كتاب رحمة للمؤمنين
وہ کتاب مومنین کے لئے رحمت ہے
وبرهان ونور للسعيد
اور نیک بختوں کے لئے برہان اور نور ہے

كتاب فيه إرشاد الطريق
اس کتاب میں طریق حق کی ہدایت ہے
شفاء من سقام للعميد
اور مریضان قلب کی بیماریوں کے لئے شفا ہے

كتاب فيه بشرى بالنعيم
اس کتاب میں فرمانبرداروں کیلئے نعمتوں کی بشارت
كتاب فيه صاعقة الوعيد
اور منکرین کے لئے وعید کی بجلی ہے

فجاء به رسول الله حقا
اس کتاب کو بیشک خدا کے رسول لائے
وعلمناه بالوجه السديد
اور بہت اچھی طرح ہم کو اس کی تعلیم دی

أظل على رؤس الخلق فضلا
ہر محض تفضل سے بخششوں کا دراز سایہ
بظل من عطاياه مديد
مخلوق کے سروں پر پھیلا رکھا ہے

مليك قادر حي قديم
وہ ایسا بادشاہ سب پر قادر زندہ اور قدیم ہے
عليم بالمغيب وبالشهيد
تمام چھپی اور کھلی ہوئی باتوں کو جانتا ہے

تبارك من حكيم ذي اختراع
بہت برکت والا حکیم بغیر نمونہ پیدا کرنے والا
ومبدع ذلك النسق النضيد
اور اس عمدہ اور درست ترتیب پر عالم کا موجد

برى خلقا وآتاهم هداهم
مخلوق کو پیدا کیا اور ہدایت کے اسباب مہیا کردیئے
وعقلا للفرار عن الحيود
اور بھاگنے کی جگہوں سے بھاگنے کیلئے عقل عنایت کی

وأنزل رسله تترى إليهم
اور پے درپے اپنے رسول ان کی طرف لگاتار بھیجے
لتمييز الشقي عن السعيد
تاکہ نیک اور بد میں امتیاز ہوجائے

ومن بين النبيين اصطفى من
اور پیغمبروں میں اس رسول کو برگزیدہ کیا
حوى كنز العلوم من الحميد
جس نے علوم (لدنیہ) کے خزانے خدائے حمید سے حاصل کئے

أرشدنا إلى دار السلام
جس نے دار السلام (جنت) کی طرف ہماری رہنمائی کی
وأوعدنا من البطش الشديد
اور خدا کی سخت گرفت سے ہم کو ڈرایا

وأوصلنا إلى شرف العلوم
اور علوم کے کنگروں پر ہم کو پہنچا دیا
ونجانا من الجهل المبيد
اور جہالت ہلاکت سے ہم کو نجات دی

ووعظنا وذكرنا برفق
اور ہم کو نرمی اور احسان کے ساتھ
وإحسان وتأليف الكبيد
نصیحت فرمائی اور غمزدوں کی تالیف کی

وفسر مجمل القرآن يسرا
قرآن کی مجمل آیتوں کی بغرض آسانی
بفصل خطابه الحق المفيد
اپنے فائدہ بخش صاف کلام سے تفسیر فرمائی

وقال خذوا كتاب الله عني
اور فرمایا کہ کتاب اللہ مجھ سے سیکھو
بإتقان وإحكام مزيد
اور مضبوطی اور پختگی سے اسے یاد رکھو

يبلغ شاهد من غاب عني
اور موجودین پیچھے آنے والوں کو پہونچائیں
ويلقيه القريب على البعيد
اور نزدیک والے دور والوں کو سکھائیں

فرب مبلغ أوعى فقيه
کیونکہ بسا اوقات وہ شخص جسکو سکھایا جائے
يرى ما لا يرى عين الشهيد
سکھانے والے سے زیادہ سمجھدار اور باریک بیں ہوتا ہے

فذا التبليغ أوصانا النبي
تو اس تبلیغ کی نبی علیہ السلام نے
به حتما بإيصاء أكيد
ہم کو نہایت تاکید اور اہتمام سے وصیت فرمائی

فثم ذيلهم علماء شرع
پس علمائے شریعت نے تعمیل ارشاد مبارک
لإبلاغ وإرشاد الشريد
گم شدہ کی رہنمائی اور تعلیم کے لئے مستعد ہوگئے

أشاعوا العلم قرنا بعد قرن
اور انہوں نے قرنا بعد قرن علم دین کی اشاعت کی
وشادوا الدين كالقصر المشيد
اور دین کو ایک مضبوط محل کی مانند مستحکم کردیا

جزاهم ربهم عنا وعنهم — وأولاهم بجنات الخلود

خدا تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کا ہماری جانب سے — بھی بدلہ اور ہمیشگی کے باغوں میں انکو جگہ دے

فأشرق نوره شرق الغزالة — ونور ما على وجه الصعيد

پس آفتاب کی طرح علم کا نور چمک اٹھا — اور روئے زمین کو اپنی چمک سے روشن کر دیا

أزاح من القلوب صدا جهل — ونورها بتوحيد الوحيد

دلوں پر سے زنگ جہالت صاف کر دیا — اور انکو خدائے یکتا کی توحید سے منور کر دیا

فكان العلم مرفوع البناء — مصونا عن يد الجهل المبيد

اسی طرح ایک مدت تک علم دین عالی شان رہا — اور جہالت مہلک کے ظالم ہاتھ سے بچا رہا

إلى أن طال أيدي الدهر جورا — عليه فصار كالشيء الفقيد

آخر کار زمانے نے دست ظلم دراز کیا — اور علم اسکے سبب کسی بھولی چیز بن گیا

خبت نيرانه بعد اضطرام — وأمسى نازلا بعد الصعود

اس کے شعلے جو بلند تھے بجھ گئے — اور بلندی سے پستی کی جانب مائل ہو گیا

وصار البدر يدنو عن أفول — وظل الموج يدنو عن جمود

اس کا بدر کامل قریب تھا کہ غروب ہو جائے — اور اسکی موجیں قریب تھیں کہ جم جائیں

فألهم ربنا العلماء تأسيس دور العلم في شأن جديد

پس خدا تعالیٰ نے علماء کو الہام فرمایا — کہ نئی شان سے علم کی عمارت کی بنیاد رکھیں

فأسس قاسم النانوتوي — أساسا شامخا عالي العمود

تو مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے — ایک عالیشان رفیع القدر مدرسہ کی بنیاد ڈالی

أعاد بهاء وجه العلم درسا — وتعليما لقوم مستفيد

جس نے درس و تعلیم کے ذریعے سے علم کا چہرہ — پھر منور اور تر و تازہ کر دیا

رفيقي مؤنسي حبي أنيسي — نصيحي مشفقي خلي ودودي

وہ میرے رفیق مونس اور دوست انیس ہیں — میرے خیر خواہ شفیق اور مخلص مہربان ہیں

أقام ببلدة الدهلي ونادى — أهاليها إلى أمر رشيد

دہلی میں انھوں نے اقامت کی — اور اہل دہلی کو ایک عمدہ چیز کی جانب بلایا

دعاهم بعد أن كانوا حيارى — بجهل هائمين في بيد

جب کہ دہلی والے جہالت کے میدان میں — حیران و سرگرداں تھے انکو ہدایت کی طرف پکارا

فحضهم على نشر العلوم — وأسس مدرس العلم المفيد

اور اشاعت علوم دینیہ کی انہیں رغبت دلائی — اور فائدہ بخش علم کی ایک درسگاہ قائم کی

لإحياء الرسوم رسوم دين — وترويج العلوم على الصعيد

جس سے غرض محض آثار دین کو زندہ کرنا — اور علوم دینیہ کو زمین پر پھیلانا تھا

بإخلاص من القلب السليم — وتوفيق من الرب المجيد

سچے ارادے اور خالص نیت سے — اور خدائے بزرگ و برتر کی توفیق سے

وذا في مسجد عال مطلى — رفيع السمك مرفوع الوصيد

یہ کہاں؟ عالی شان سنہری مسجد میں — جس کی چھت اونچی دہلیز بلند ہے

وسماه بمدرسة أمينية تلقبه باسم فريد

اور مدرسہ کا نام مدرسہ امینیہ رکھا — تاکہ یہ مدرسہ ایک خاص نام کے ساتھ ممتاز رہے

فلبى دعوة المولى الأمين — محبو الدين أرباب الجدود

پس مولوی امین الدین کی دعوت کی اجابت کی — دین کے دوست رکھنے والے دولتمند رئیسوں نے

خصوصا سابق الخيرات السخي — مفيض الجود مغتنم الوجود

بالخصوص بھلائیوں میں آگے رہنے والے حاجی محمد اسحاق نے — جو سخاوت پھیلانے والے مغتنم الوجود ہیں

ملاذ أرامل مأوى اليتامى — حليف محاسن غيظ الحسود

مساکین کے پشت پناہ یتیموں کے جائے پناہ — خوبیوں کے مجمع حاسدوں کے لیے باعث غیظ

وكل مجامل جعد كريم — مفيض جلائل الخير العتيد

اسی طرح ہر نیکوکار سخی شریف — جمع کیے ہوئے مال میں سے بڑی بڑی سخاوت کرنے والے

وثاب إليه فوج بعد فوج — من الطلباء في نظم نضيد

اور طالب علموں کی فوجوں کی فوجیں — ان کے پاس ایک انتظام کے ساتھ اکٹھی ہو گئیں

فداراهم وآساهم طرايا — لفضل القادر الحي المعيد

انھوں نے طلبہ کی غمخواری کی اور اچھی طرح پیش آئے — خدائے حی و معید کے فضل کی خواہش میں

وقال لأوثرن وفود خير — بما عندي طريفي أو تليدي

کہا کہ میں ان طالبان خیر کو اختیار کروں گا — اپنے نئے اور پرانے مال کے خرچ کرنے میں

ولما جاءه الأجل المسمى — مضى فرحا إلى المولى الحميد

اور جب کہ آپ کی اجل مقدر کا وقت آ گیا — تو خوش خوش اپنے مولیٰ کے دربار میں چلے گئے

وأوصى أهله أن لا توانوا — بتوزيع العلوم على الجديد

اور اپنے لوگوں کو وصیت فرما گئے کہ زمین پر — علوم دین کی اشاعت میں سستی نہ کرنا

فثم تابعوه الذيل جهدا — وشاد وصاياه منهم رشيد

پس آپ کے تابعین کوشش کے لیے مستعد ہو گئے — بجا لایا آپ کی وصیت کا ان کے گروہ میں تھا

فشادوا ما بناه وشيدوه — بإحكام كقصر من حديد

پس جس بنا کو آپ بنا گئے تھے اسے بلند — اور لوہے کے محل کے مانند مضبوط اور استوار کر دیا

ومنهم صاحب الفضل العظيم — ابن الذي ذو الرأي السديد

ان تابعین میں سے صاحب فضل عظیم — اور درست رائے والے مولوی امین الدین ہی ہیں

فانعمهم علی قدر المزایا ۔۔۔ بانعام الکثیر او الزهید
پس انکو انکی فضیلتوں کے موافق ۔۔۔ تھوڑا یا بہت بقدر استحقاق انعام دیا

واداهم والبسهم برودا ۔۔۔ واشبعهم بکاسات الثرید
ان کو کھانا دیا اور لباس پہنایا ۔۔۔ اور گوشت روٹی کے پیالوں سے انہیں سیر کیا

وعلمهم بتعلیم انیق ۔۔۔ وهذبهم بتهذیب سدید
اور نہایت عمدہ طریقے سے انہیں تعلیم دی ۔۔۔ اور اچھی طرح انکے اخلاق کی تہذیب کی

ففازوا بالهدی بعد الضلال ۔۔۔ وبعد الجدب بالعیش الرغید
پس وہ گمراہی کے بعد ہدایت پر کامیاب ہوئے ۔۔۔ اور قحط زدگی کے بعد خوشی کی زندگی پائی

وصار اکلهم مثل النجوم ۔۔۔ وشجعان المعارک کالاسود
اور سب ستاروں کے مانند ہوگئے ۔۔۔ اور شیروں کی طرح میدان جنگ کے بہادر بن گئے

نجوم هدایة للطالبین ۔۔۔ اسود وغی لشیطان مرید
طالبوں کیلئے ہدایت رہنمائی کے ستارے ۔۔۔ شیطان سرکش کے لیئے لڑائی کے شیر

ولا کنجوم سقف مستدیر ۔۔۔ ولا کاسود غابات الجدید
آسمان کے ستاروں کی طرح نہیں ۔۔۔ اور جنگل کے شیروں کے مانند نہیں

فللاولی افول بعد شرق ۔۔۔ وفی الاخری افتراس للجلود
کیونکہ آسمان کے ستارے تو نکلکر غروب ہوجاتے ہیں ۔۔۔ اور جنگل کے شیر لوگوں کے بدن اور چمڑے پھاڑتے ہیں

وشرق علومهم شرق تدام ۔۔۔ وهم قطاع جهل لا قدید
اور انکی علمی روشنی ہمیشہ باقی رہنے والی ہے ۔۔۔ اور یہ جہالت کے ٹکڑے کرتے ہیں نہ چمڑوں کے

اساتذهم بدور بل شموس ۔۔۔ کماة الحق اقیال الجنود
ان کے استاد بدر کامل بلکہ مہر منیر ہیں ۔۔۔ حق کے بہادر۔ جماعتوں کے سردار ہیں

ضیاء الحق ضوء العالمین ۔۔۔ ومحی اللیل فی نور السجود
ضیاء الحق علم والوں کی روشنی ہیں ۔۔۔ تمام رات سجدوں کی روشنی میں جاگنے والے

وقاسمهم نبیه المعی ۔۔۔ وهازم جیش مبتدع طرید
اور ان میں محمد قاسم باخبر ذکی الحسب ہیں ۔۔۔ اہل بدعت کے لشکروں کو شکست دینے والے

والطاف له انظار لطف ۔۔۔ الی صغر الید المضنی الکمید
محمد الطاف حسین۔ انکی مہربانی کی نگاہیں ۔۔۔ فقیروں شکستہ حالوں تنگدستوں کی جانب رہتی ہیں

تری عبد الغفور لخوف رب ۔۔۔ غضیض الطرف ذا مشی وئید
تم عبد الغفور کو دیکھوگے کہ خدا کے خوف سے ۔۔۔ ان کی نگاہیں پست اور چال دھیمی رہتی ہے

ومفتیهم نبیل رحمة الله ۔۔۔ علیهم رحمة المولی المجید
ان میں مفتی رحمت اللہ ایک بزرگ [illegible] ہیں ۔۔۔ ان سب پر خدائے بزرگ کی رحمت ہو

فکلهم لهم اقدام صدق ۔۔۔ وکلهم لحلال العقید
یہ سارے صاحب آثار حسنہ ہیں ۔۔۔ اور سب کے سب مشکل گرہوں کے کھولنے والے ہیں

ونختم ذا الکلام بذکر حبر ۔۔۔ فقید المثل علام فرید
اب ہم ایک بڑے عالم کے ذکر پر یہ کلام ختم کرتے ہیں ۔۔۔ وہ بے نظیر علامہ یکتائے زمانہ ہیں

خریت العلم مقتنص الفنون ۔۔۔ له کل المزایا کالمصید
علم کو ڈھونڈ نکالنے والے فنون کو شکار کرنیوالے ۔۔۔ تمام فضیلتیں انکے فتراک کا شکار ہیں

نبیه فائق الاقران یدعی ۔۔۔ بانور شاه موموق الحسود
بزرگ مرتبہ ہمسروں پر فائق جن کو ۔۔۔ انور شاہ کہکر پکارا جاتا ہے حاسدوں کے محبوب

فهذا الحبر غارس ذا النخیل ۔۔۔ واول موقظ القوم الرقود
کیونکہ یہ علامہ اس درخت کے لگانیوالے ہیں ۔۔۔ اور سوتی قوم کو اول اول جگانے والے

وما انا مثلهم فی الفضل لکن ۔۔۔ رجائی ان یخطونی بجود
اور میں فضیلت میں ان سب کی طرح نہیں ہوں ۔۔۔ پر امید ہے کہ یہ سب مہربانی سے مجھ کو [illegible]

وان اعطی نصیبا وافرا من ۔۔۔ شراب الفضل من حب القعید
اور امید ہے کہ مجھے ہمنشین کی محبت سے ۔۔۔ شراب فضل میں سے کافی حصہ نصیب ہوجائے

فهذا الجمع جمع لا یخیب ۔۔۔ جلیسهم من الخیر المدید
کیونکہ یہ وہ جماعت ہے جن کا ہمنشیں ۔۔۔ ان کی متعدی بھلائی سے محروم نہیں رہتا

شرحت الحال شرحا مستبینا ۔۔۔ بنظم تزدری نظم العقود
حالات مدرسہ میں نے واضح طور پر بیان کر دیئے ۔۔۔ ایسی نظم میں جو موتیوں کے ہاروں کو حقیر کردے

ولا بالطوع بل للامتثال ۔۔۔ لامر المحسن المولی الودود
یہ نظم اپنی خوشی سے نہیں بلکہ بہ تعمیل ارشاد ۔۔۔ اپنے دوست محسن مہربان کے لکھی ہے

ولیس الشعر من دابی وشغلی ۔۔۔ وما انا للقوافی بالعهید
شعر گوئی میرا طریقہ اور شغل نہیں کر ۔۔۔ اور نہ میں قصائد کا ہم زبان ہوں

فلولا الله انزل فی الکتاب ۔۔۔ الم تر انهم کذبت قصیدی
اگر خدائے تعالیٰ قرآن مجید میں ۔۔۔ الم تر انہم نازل نہ فرماتا تو میرے قصیدے بھی جھوٹ ہوتے

وحسبی قول مولانا الهمام ۔۔۔ محمد بن ادریس العمید
اب تو مجھے مولانا امام ہمام ۔۔۔ محمد بن ادریس شافعی کا قول کافی ہے

فلولا الشعر بالعلماء یزری ۔۔۔ لکنت الیوم اشعر من لبید
پس اگر شعر گوئی علماء کیلئے منقصت نہ ہوتی ۔۔۔ تو میں آج لبید سے زیادہ شاعر ہوتا

اله العالم ارزقنی صلاحا ۔۔۔ وحفظا من مخاییل البیود
اے الٰہ العالمین مجھے صلاح و تقویٰ سے روزی کر ۔۔۔ اور حفظ اسے ہلاکت سے محفوظ رکھ

شجر ظليل في السماء فروعه
ممدوح سایہ دار درخت ہے جس کی شاخیں آسمان تک گئی ہیں
للمستظل بظله حظان
اس کے سایہ میں رہنے والے کے لئے دو حصے نفع ہیں

حظ الثمار ثمار علم تقتنى
ایک حصہ یہ کہ علم و معرفت کے پھل چنے
حظ التقاة وخشية الرحمن
دوسرا حصہ یہ کہ تقوے اور خشیہ حاصل ہو

قمر جلا ظلم الفسوق بأسرها
ممدوح ایک چاند ہے جس نے نافرمانی کی ظلمتیں دور کر دیں
وغزاله كشفت دجى الكفران
اور آفتاب ہے جس نے کفر کی اندھیریوں کو مٹا دیا

شمس تجلى نور توحيد الإله
وہ ایسا آفتاب ہے جس کی دعوت سے ہر جگہ
بدعوة منها بكل مكان
خدا تعالیٰ کی توحید کا نور چمک اٹھا ہے

نور العلوم ونور خشية التقى
علوم یقینیہ کا نور اور اسکے خوف و خشیہ کا نور
من ربه فهما له نوران
یہ دونوں نور اسکے لئے دو روشنیاں ہیں

ضوء العبادة للإله وضوء وجه
خدا تعالیٰ کی عبادات کی چمک اور اسکے منہ چہرے
زاهر فهما له ضوءان
کی رونق یہ دونوں اسکی دو چمکیں ہیں

سيماه من أثر السجود لربه
اسکے منہ پر علامت موجود ہے جیسے خدائے برتر کے لئے
في وجهه ذي النور واللمعان
سجدہ کے نشان۔ جو اسکے منور اور چمکدار چہرے پر ہیں

كل الأمور تطيعه في عزمه
تمام امور اسکے ارادے کے تابع ہیں
ومضائه قدما بطوع عنان
اپنی خوشی سے ہمیشہ اسکے ارادے کے ساتھ چلتے ہیں

حبر نبيل فائق الأقران نجل
ممدوح بڑا عالم بزرگ۔ ہمعصروں سے بڑھ چڑھ کر
السادة الأمجاد والأعيان
بزرگوں۔ سرداروں۔ شریفوں کی اولاد میں ہے

أسمح به من باذل أسر القلوب
کیا ہی جوادہے سخی جس نے دلوں کو
بجوده والفضل والفيضان
اپنے فضل و کرم و فیض سے قید کرلیا ہے

أكرم به أرحم به أحلم به
کیا ہی کریم کیا ہی رحیم کیا ہی بردبار ہے
أعلم به بالفقه والقرآن
کیا ہی جاننے والا ہے فقہ اور قرآن مقدس کا

أجود به أحسن به أسمح به
کیا ہی سخی کیسا محسن کیسا جواد ہے
أعهد به بالمال للجيران
ہمسایوں کی اپنے مال سے کیسا غمگساری کرنے والا

كهف البرية غوثهم وملاذهم
خلق خدا کا جائے پناہ۔ فریادرس لوگوں کی پناہ
من مفزعات طوارق الحدثان
گردش زمانہ کی خوفناک مصائب آفات سے

لم يعر من أعطاه ثوبا من ثياب
نہیں ننگا رہا وہ شخص جسے ممدوح نے ایک کپڑا دیا
علوم دين المصطفى ذي الشان
پیغمبر ذی شان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دینی علوم کے کپڑوں میں سے

ولنعم ثوبا إن قدرتم قدره
وہ کپڑا بہت ہی اچھا کپڑا ہے اگر تم اسکی قدر کرو
والله لا يبلى بطول زمان
خدا کی قسم عرصہ دراز زمانہ سے پرانا نہیں ہوتا

لم يصد من أسقاه من جرياله
کبھی پیاسا نہ ہوا وہ شخص جسکو ممدوح نے اپنی شراب پلادی
المغلى بماء الجود والإحسان
وہ شراب جس میں جود و احسان کے پانی کی ملونی ہو

لم يفت يخشى الله في أحواله
ہمیشہ اپنے تمام احوال میں خدا سے ڈرتا ہے
فهو الفقيه العالم الرباني
پس وہ فقیہ عالم ربانی ہے

نفسي الفداء لصارم عريان
میری جان اس شمشیر برہنہ پر قربان ہو
من باترات الله ذي السلطان
جو خدائے غالب کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے

طبعت براهين الهدى سيفا فيا
براہین ہدایت کی [illegible] تلوار ڈھالی گئی ہیں پس
عجبا لعضب ألطف القضبان
تمام تلواروں سے لطیف تر تلوار [illegible]

فذبابه موت الملاحدة اللئام
کیونکہ اسکی دھار لا مذہب لئام کی موت ہے
عداة دين الحق والإيمان
جو دین حق اور ایمان کے [illegible]

مستمسك بعرى الهداية والرشاد
ممدوح ہدایت و رشد کے عروۂ وثقیٰ کو پکڑے ہوئے ہے
من كتاب واضح التبيان
جو کھلی ہوئی واضح کتاب سے [illegible]

فيه البشارة للذين يلونه
وہ کتاب جس میں مطیعین کے لئے بشارت ہے
بالفوز بالحسنى وبالرضوان
کہ وہ جنت اور خدا کی رضامندی پر کامیاب ہونگے

فيه الوعيد لمن تعدى حده
اور جس میں حد سے بڑھنے والوں کے لئے وعید ہے
بخبيثة الأشجار والنيران
بدترین درخت (زقوم) اور آگ کی

صدر الكرام كرام مدرسة العلوم
ممدوح بڑے بزرگ مدرسین میں صدر مدرس ہیں
الفائزين برحمة الرحمن
اور وہ طلب خدا کی رحمت کے ساتھ کامیاب ہیں

لا زال مدرسة رمت بنصالها
یہ مدرسہ ہمیشہ رہے جس نے اپنے بھالوں سے
قوما بقوى فتنة الشيطان
شیطانی فتنوں کے تقویت دینے والے گروہ کو زخمی کردیا

لا زال مدرسة صحت فيها سكارى
یہ مدرسہ ہمیشہ قائم رہے جس میں جاکر جہالت اور سرکشی
الجهل والعدوان والطغيان
اور تعدی حدود کے سرمست ہوش میں آجاتے ہیں

لا زال مدرسة جرت منها عيون
یہ مدرسہ ہمیشہ رہے جس سے علم و توحید
العلم والتوحيد والعرفان
و معرفت کے چشمے جاری ہوگئے ہیں

مفتی کفایت اللہؒ اپنے عصری تناظر میں

سعید سہروردی

حضرت علامہ مفتی کفایت اللہؒ جیسی شخصیت پر ایسے شخص کا قلم اٹھانا جسے ان کو نزدیک سے دیکھنے کی سعادت نصیب نہ ہوئی ہو، پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔ بہر حال نام کی سعادت یعنی برائے نام سعادت کے سہارے ان کی شخصیت سے اکتساب فیض کی یہ کوشش ان کے دور کے واقعات پر ان کی شخصیت کی بارش انوار سے ممکن ہوئی ہے۔

حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ کا دور حیات (۱۸۷۵ء-۱۹۵۲ء) تقریباً ۷۷ برسوں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ تین چوتھائی صدی سے کچھ زیادہ عرصہ ملک کی تاریخ میں برطانوی سامراج کے عروج کے ساتھ ساتھ اس کے موافق اور مخالف دونوں اثرات میں شدت اور انحطاط کے مرحلوں سے گزرتا ہے۔

ان کا علمی اور ذہنی سفر روایتی انداز میں گھر سے شروع ہوا۔ مدرسہ شاہی مراد آباد میں دو سال تحصیل علم کے بعد تین برس دارالعلوم دیوبند میں حصول علم میں مصروف رہے۔ دوران تعلیم مولانا حسین احمد مدنیؒ مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا امین الدین صاحب بانی مدرسہ امینیہ کی رفاقت نصیب ہوئی۔ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں کس طرح کے اثرات شامل تھے۔

تحصیل علم کے بعد تدریس سے وابستہ ہو جانے کے بعد حضرت مفتی کفایت اللہ اپنی آخری سانس تک کبھی اپنے دور کے دینی اور علمی سرچشموں سے دور نہیں رہے۔ ان کی شخصیت کے ارتقا کا دور ملک میں سیاسی بیداری اور سامراجی جبر و استبداد کے خلاف جد و جہد کی تنظیم و تشکیل کا دور ہے۔

یہ جد و جہد دارالعلوم، دیوبند کے قیام کے ساتھ ہی ایک واضح شکل اختیار کر چکی تھی، لیکن اس کو وسعت اور گہرائی بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں نصیب ہوئی۔ اسی دور میں حضرت مفتی کفایت اللہؒ کی عملی صلاحیت اور ان کی موثر قیادت کا مظاہرہ ہوا۔

واقعاتی حد بندی کے لیے ہم ان کی قیادت کے دور کو ان کی جمعیۃ علماء ہند کی صدارت سے وابستہ کر سکتے ہیں۔ یہ دور ۲۳/ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں منعقدہ خلافت کانفرنس سے شروع ہوتا ہے اور ۱۰/ جون ۱۹۴۰ء کو ختم ہوا جب شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جمعیۃ علماء ہند کے مستقل صدر ہوئے۔

اس مصنوعی حد بندی کے ساتھ ایک وضاحت ضروری ہے۔ یہ ان کی قیادت کا دور ہے۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد کے دور کو ان کی مشاورت کا دور کہا جاسکتا ہے۔ اس طرح ان کی فکری قیادت اور عملی جد و جہد میں وقفہ نام کی کوئی چیز نہیں۔

اس مقام پر یہ باور کرانا بھی ضروری ہے کہ قیادت اور مشاورت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کامیاب قیادت کا تصور صحیح مشاورت کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ صحیح مشاورت کے عناصر ہیں، علم کی وسعت، تجربہ کی گہرائی اور خلوص نیت۔ جب مشاورت میں یہ ساری خوبیاں یکجا ہوں تو وہ قیادت کے لیے منارہ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس طرح حضرت مفتی کفایت اللہؒ قائد کی حیثیت سے عظیم تھے اور مشیر کی حیثیت سے انتہائی معتبر، دونوں مقام ان کے علم و فضل کے مرہون منت ہیں۔

ان کے دور صدارت میں ملک میں ترک موالات کی دو عظیم تحریکوں نے برطانوی سامراج کی بنیاد ہلادی۔ سامراجی جبر و استبداد میں شدت کے ساتھ مزاحمت میں بھی شدت پیدا ہوئی۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ سے دوسری جنگ عظیم کے آغاز تک

کا وقت ان کے دور صدارت میں شامل ہے۔ یہ عرصہ ملکی اور عالمی سیاست میں زبردست نشیب و فراز کا زمانہ رہا ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی کی شکست کے بعد خلافت عثمانیہ کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد عالم اسلام کو دو طرفہ چیلنج کا سامنا تھا۔ ایک طرف انقلاب روس کے بعد سوویت یونین کی تشکیل ہوئی، جس نے الحاد کی تبلیغ اور اسلام دشمنی کا راستہ اختیار کیا۔ دوسری طرف مغربی طاقتوں نے مغربی ایشیا کی صف بندی اس طرح کی کہ مسلمان آئندہ عالمی سیاست میں کوئی موثر رول نہ ادا کر سکیں۔

ایسے حالات میں جمعیۃ علماء ہند کی تاسیس تحریک آزادی کا ایک انقلابی اور فیصلہ کن موڑ تھی۔ اس سے پہلے بیرونی مدد اور حمایت حاصل کر کے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد ناکام ہو چکی تھی۔ یہ شعور بیدار ہو چکا تھا کہ ملک کو سامراج کے جبر سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں ہم وطنوں کا تعاون اور ان کی شرکت ضروری ہے۔

ایک نئے موڑ پر نئی تنظیم کی تشکیل و استحکام کے لیے قیادت کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ان کی عظمت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ ان کے دور صدارت میں جمعیۃ علماء ہند ملک گیر تنظیم بن کر تحریک آزادی کا ہراول دستہ بن گئی۔

۲۳ر نومبر ۱۹۱۹ء سے ۲۸ر دسمبر ۱۹۱۹ء کے درمیان صرف چار ہفتوں کی قلیل مدت میں دو اہم جلسوں کا انعقاد حالات کی سنگینی اور نزاکت کا احساس دلاتا ہے۔ ۲۳ر نومبر ۱۹۱۹ء کو پہلے مشاورتی جلسے میں ملک کی آزادی کے مطالبہ کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی رہائی کا پرزور مطالبہ کیا گیا تھا۔

۲۸ر دسمبر ۱۹۱۹ء کا اجلاس امرت سر جمعیۃ علماء ہند کا پہلا باقاعدہ اجلاس تھا۔ اس کی پہلی نشست کی صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے کی۔ دوسری اور تیسری نشستوں کی صدارت حضرت مفتی کفایت اللہؒ نے فرمائی۔ اس اجلاس کے دوران جمعیۃ علماء ہند کے ابتدائی دستور کا مسودہ پیش کیا گیا۔ مجلس منتظمہ کی تشکیل ہوئی جو اب بھی جماعتی بندوبست میں سب سے زیادہ بااختیار اکائی ہے۔ اس طرح حضرت مفتی کفایت اللہؒ کو جمعیۃ علماء ہند کے اساسی معمار کی حیثیت حاصل ہے۔ جمعیۃ کے ارتقا کے مختلف مرحلوں پر اس میں مختلف نقوش اور رنگ شامل ہوئے ہیں، لیکن تنظیم کے کردار اور جماعتی فکر کی بنیاد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی واپسی سے قبل ہی ان کی تحریک کے لیے تنظیمی ڈھانچہ تیار ہو چکا تھا۔

جب ۲۲ر مئی ۱۹۲۰ء کو شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اپنے رفقاء کرام کے ساتھ مالٹا سے رہا ہو کر ممبئی کے ساحل پر پہنچے تو ان کا پرجوش استقبال ہوا۔ ان کی انقلابی جدوجہد کا وسیلہ وہ جماعت بن گئی، جس کے خدوخال حضرت مفتی کفایت اللہؒ کے دست مبارک سے مرتب ہوئے تھے۔

ہندوستان واپس آنے کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ صرف چھ مہینے آٹھ دن بقید حیات رہے۔ اس عرصہ میں علالت کی وجہ سے اپنے خطبات خود نہیں پڑھ سکے۔ بہر حال انھوں نے ملک اور جماعت کے لیے آئندہ راہ عمل طے کر دی۔

۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہندؒ نے علی گڑھ تشریف لے جا کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس موقع پر ترک موالات پر ان کا جامع خطبۂ صدارت مولانا شبیر احمد عثمانی نے لکھا اور پڑھ کر سنایا۔

اس کے بعد جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے اجلاس عام منعقدہ دہلی ۱۹ر۲۱ر نومبر ۱۹۲۰ء کے وقت اگرچہ شیخ الہندؒ دہلی میں موجود تھے لیکن شدید علالت کی وجہ سے اجلاس میں شرکت نہ کر سکے۔ ان کی طرف سے خطبہ صدارت حضرت مفتی کفایت اللہؒ نے پڑھ کر سنایا۔

جمعیۃ علماء ہند کی تاسیس کے ایک برس گیارہ دن اور اس کے دوسرے اجلاس عام کے اختتام کے صرف آٹھ دن بعد حضرت شیخ الہند کا وصال ہو گیا۔ مالٹا سے وطن واپس آنے کے بعد چھ مہینے کی مختصر مدت میں وہ اپنی تحریک کے خدوخال واضح کر چکے تھے۔ ان کے بعد جمعیۃ علماء ہند کی تنظیم و توسیع کے علاوہ ترک موالات کی قیادت کی ذمہ داری حضرت مفتی کفایت اللہؒ کے کندھوں پر آگئی۔

آزادی کی جدوجہد کے دوران علماء کرام کی نمائندہ تنظیم کی قیادت سیاسی ذمہ داریوں کی برآوری کے ساتھ دینی امور کے لیے

تبحر علمی کی متقاضی تھی۔ آزادی کی جدوجہد کے لیے سیاسی تدبّر کی ضرورت تھی اور دینی معاملات کے لیے قرآن، حدیث، فقہ وغیرہ پر عبور لازمی تھا۔ انھوں نے یہ فریضہ بحسن وخوبی تقریباً بیس برسوں تک انجام دیا۔

ان کی قیادت صرف تحریک ترک موالات کی تنظیم اور جمعیۃ علماء ہند کے استحکام تک محدود نہ تھی۔ انگریزوں نے وطن کے مختلف فرقوں کے درمیان نفاق کا جو بیج بو دیا تھا، اس کی وجہ سے مسلمانوں کے تشخص، ان کے عقائد اور دینی شعور پر مسلسل حملے ہوتے رہے اور حضرت مفتی کفایت اللہؒ کی قیادت میں ان کا ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کیا گیا۔

ان میں ۱۹۲۳ء میں "شدھی سنگٹھن" کے عنوان سے ارتداد کا فتنہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے انسداد کے لیے جمعیۃ علماء ہند میں ایک مستقل "شعبۂ تبلیغ و حفاظت اسلام" قائم ہوا جس کی منظم کوشش سے ہزاروں مرتد دوبارہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ جمعیۃ کی طرف سے نو مسلموں اور مسلمانوں کی تربیت کا باقاعدہ انتظام کیا گیا۔ یہ کام آج تک جمعیۃ علماء ہند کے دائرہ کار میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔

۶ر نومبر ۱۹۲۳ء کو جمعیۃ علماء ہند نے انسداد فتنہ قادیانی کمیٹی قائم کی اور یہ اعلان کیا کہ قادیانی جماعت اور لاہوری جماعت دونوں عقائد اسلام کے منافی ہیں۔ ان کے متعلق ایک واضح فتویٰ مرتب کر کے ملک میں تقسیم کیا جائے۔ اس طرح تحریک برائے تحفظ ختم نبوت کی بنیاد پڑی۔ یہ کام آج تک جاری ہے۔

حضرت مفتی کفایت اللہؒ کے دور صدارت میں رسوائے زمانہ کتاب "رنگیلا رسول" شائع ہوئی۔ اس کی ضبطی کی ملک گیر تحریک چلائی گئی اور مقدمہ کے جج کنور دلیپ سنگھ کے جانبدارانہ رویہ کے خلاف پر زور احتجاج درج کیا گیا۔

سیاسی سطح پر جمعیۃ علماء ہند نے کانگریس کے دوش بدوش سائمن کمیشن کے مکمل بائیکاٹ کی تحریک میں موثر حصہ لیا۔ نہرو رپورٹ مسترد کی گئی۔ "شاردا ایکٹ" کے خلاف تحریک چلائی گئی۔

جمعیۃ علماء ہند کی سول نافرمانی تحریک کے پہلے ڈکٹیٹر حضرت مفتی کفایت اللہؒ مقرر ہوئے۔ انھوں نے ایک لاکھ افراد کی قیادت کرتے ہوئے گرفتاری پیش کی اور اٹھارہ ماہ جیل میں رہے۔

جمعیۃ علماء ہند نے اوقاف کے تحفظ اور ان کی آمدنی کے جائز تصرّف پر زور دیا۔ جمعیۃ کی کوشش سے اسلامی اوقاف کے تحفظ کے بارے میں قانون یو۔پی اور بہار کی کونسلوں نے پاس کیا۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز کے وقت ان کی قیادت میں یہ اہم فیصلہ کیا گیا کہ برطانیہ کے ساتھ کسی طرح کا تعاون نہ کیا جائے۔ جبری بھرتی کی مخالفت کی گئی۔

مفتی صاحب کے بیس سالہ دور صدارت میں وہ رہنما خطوط مرتب ہوئے، جن پر آج تک جمعیۃ علماء ہند گامزن ہے۔ وہ مرد میدان تھے اور صاحب فکر بھی علمی اور عملی صلاحیتیں بہت کم شخصیتوں میں اس طرح یکجا ہوتی ہیں جس طرح حضرت مفتی کفایت اللہؒ کی شخصیت اور ان کی کارگاہ عمل میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ □□

قطعہ تاریخ وفات

ازمفتی مہدی حسن

حشر زادہ ہے وفاتِ مفتیؒ ہندوستاں
جس سے سینے چاک ہیں کیا ذکرِ دامانِ وجیوب

محفلیں دنیائے اسلام کی سب بے نور ہیں
ہیں اسیر غم شمال و مشرق و مغرب جنوب

ارتحالِ مفتیِ اعظم کا سالِ عیسوی
حرف منقوطی سے لکھ دو مہر رخشاں کا غروب

۱۹۵۲ء

۱۲۸
مفتیٔ اعظم نمبر
مفتیٔ اعظم نمبر کی تجدید اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہیں
مدنی ٹیکسٹائل
بیادگار شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نور الله مرقده
نگراں: سراج انصاری
کاشانۂ سراج
شرکاء: حاجی حامد جمال
حاجی زاہد جمال
معاون فرم
زاھد مدنی
مدنی اینڈ کو
مدنی مصباح
جمال سنس
مدن پورہ، بنارس فون: 321065, 393495, 324355
"مفتی اعظم نمبر" کی اشاعت نو پر
ہم جملہ اہل خاندان
اپنی نیک خواہشات اور دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں
حافظ عبد المجید و برادران

مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ کی

قرآن فہمی

از ——— مولانا اخلاق حسین قاسمی

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مولانا احمد سعید صاحبؒ دہلوی کے ترجمۂ قرآن میں حضرت مفتی اعظمؒ کی قرآن فہمی کا بڑا حصہ شامل ہے۔

مولانا احمد سعیدؒ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کبھی قرآن کریم کا کوئی اہم فقرہ آتا تو وہ راقم السطور کو مفتی صاحب کی خدمت میں بھیجتے یا مفتی صاحب خود کسی وقت تشریف لاتے تو مولانا مرحوم زیرِ غور آیات ان کے سامنے پیش کرتے، حضرت مفتی صاحب غور فرماتے اور اس کا مناسب ترجمہ املا کرا دیتے۔

راقم نے شروع شروع میں ان آیات پر نشان لگانے کا اہتمام کیا۔ جن آیات کا ترجمہ مفتی صاحب کا ارشاد فرمودہ تھا۔

اگر راقم کو مولانا مرحوم کے ساتھ آخر تک ترجمہ کے کام میں رفاقت کی سعادت حاصل رہتی تو آج مفتی صاحب کے تراجم کی مکمل فہرست ہمارے سامنے موجود ہوتی۔

راقم نے سورہ بقرہ اور آل عمران کی جن آیات پر نشان لگایا تھا، ضروری ہے کہ وہ آیات مع ترجمہ کے علماء کرام کی خدمت میں پیش کر دی جائیں اور تاریخ انھیں محفوظ کر لے۔

یہ ضرورت بندہ کو اس لیے پیش آئی کہ مولانا مرحوم نے اپنے ترجمہ میں حضرت مفتی صاحب کی اس گہری رہنمائی کا کہیں ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا، صرف ناشر کی طرف سے اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے یہ سطریں اس لیے بھی تحریر کی جا رہی ہیں کہ مولانا مرحوم کے ترجمہ کشف الرحمان کو عام مسلمانوں کے اندر پھیلانے کے لیے امت کے اصحاب خیر کھڑے ہوں۔ مولانا کا ترجمہ دو جلدوں میں شائع ہوا ہے کیونکہ مولانا کے حواشی بہت تفصیلی ہیں اور عوام کے لیے بہت مفید ہیں مگر عام مسلمانوں کے لیے دو جلدوں کا خریدنا آسان نہیں ہے۔ مرحوم مولانا محمد سعید صاحب نے اپنے والد مرحوم سے کہا تھا کہ آپ تفسیری حواشی الگ شائع کریں اور ترجمہ کو ایک جلد میں رہنے دیں۔ مولانا مرحوم نے فرمایا تھا پہلی بار تو اسی طرح شائع ہونے دو بعد میں دیکھا جائے گا۔ مولانا محمد سعید صاحب خدا کو پیارے ہو گئے۔ انھیں کتابوں کی اشاعت کا بڑا سلیقہ تھا، اب سنا ہے کہ مولانا مرحوم کے عزیزوں کے باہمی اختلاف کی وجہ سے ہندوستان کے اندر اس ترجمہ کا چھپنا مشکل ہو رہا ہے۔ پاکستان میں کچھ حضرات نے اسے چھاپا ہے لیکن ان کے سامنے بھی یہی سوال ہے کہ اس ترجمہ کو عام مسلمانوں کے اندر کیسے پہنچایا جائے۔

ناشرین نے مولانا تھانویؒ کے ترجمہ کو بیان القرآن کے خلاصہ کے ساتھ شائع کر کے اسے عوام میں پہنچانے کی بڑی مبارک کوشش کی ہے۔

اسی صورت میں اگر مولانا احمد سعید صاحبؒ کا ترجمہ تفسیری خلاصے کے ساتھ شائع ہو جائے تو یہ ترجمہ عوام میں بہت مقبول ہو۔

اب اسے کون کرے؟ بڑے سرمایہ کا کام ہے، خدا ہی اس کی کوئی صورت پیدا کرے گا۔ بہر حال مولانا احمد سعید صاحب کے ترجمہ میں حضرت مفتی صاحب کی قرآن فہمی کا جو حصہ شامل ہے راقم ان کا نمونہ پیش کرنا چاہتا ہے تاکہ حضرت مفتی صاحب کی فقہی اور حدیثی صلاحیت کے ساتھ امت کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ مرحوم کو خدا تعالیٰ نے قرآن فہمی کی بھی اعلیٰ قابلیت عطا فرمائی تھی۔

یہ بھی واضح رہے کہ کفایت المفتی جلد دوم میں تفسیر کے بعض اہم

سوالات پر حضرت مفتی صاحبؒ کی جو تحقیق نقل کی گئی ہے، اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب قبلہ قرآن فہمی کی اعلیٰ صلاحیت کے مالک تھے، اگرچہ زندگی کا پورا حصہ حدیث و فقہ کی تعلیم میں گذرا۔

پہلی آیت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں حضرت مریم صدیقہ کے پاس ان کے خاص حجرہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے کھانے پینے کا خاص سامان آیا کرتا تھا۔ مفسرین نے لکھا ہے سردیوں کے موسم میں گرمیوں کے پھل اور گرمیوں میں سردیوں کا میوہ اور پھل فروٹ حضرت مریم کے پاس آتا تھا۔ حضرت مریم کے مربی اور نگراں حضرت زکریا پیغمبر جب اپنی بھانجی مریم کے پاس ان کی خاص عبادت گاہ میں آکر یہ پھل فروٹ دیکھتے تو انھیں تعجب ہوا۔

چنانچہ ایک روز وہ پوچھ بیٹھے:

قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰی لَكِ هٰذَا، قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ (آل عمران ۳۷)

(اے مریم! تمھارے پاس یہ کہاں سے آیا؟ بولیں، یہ خدا تعالیٰ کے پاس سے آیا ہے، بیشک خدا تعالیٰ رزق دیتا ہے جس کو چاہے بے قیاس)

مفتی صاحب مولانا احمد سعید صاحب کے دولت خانہ پر تشریف لائے اور مولانا مرحوم نے اس آیت کے آخری فقرہ کا ترجمہ پوچھا۔

مفتی صاحب نے دوسرے تراجم سنے اور پھر اس کا ترجمہ حسب ذیل ادا کرلیا

"یقیناً اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے سان و گمان رزق پہنچاتا ہے۔"

کشف الرحمٰن میں یہی ترجمہ کیا گیا ہے۔

مفتی صاحب نے حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے "بے قیاس" ترجمہ کو اردو محاورہ میں ڈھالا ہے اور خوب ڈھالا ہے۔ "بے سان و گمان" کا محاورہ اردو والے کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔

فارسی والوں نے بغیر حساب کا ترجمہ بے شمار کیا ہے۔ شاہ رفیع الدین صاحب، ڈپٹی نذیر احمد صاحب، مولانا آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ صاحب ان تمام اردو مترجمین نے "بے حساب" ترجمہ کیا ہے۔ ان حضرات کو شاہ رفیع الدین صاحب کا لفظ پسند آیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے خاص طور پر اس جگہ "بے قیاس" ترجمہ کیوں کیا ہے؟

شاہ صاحب کے سامنے مفسرین کی یہ تشریح ہے، صاحب جلالین نے اس آیت کی تفسیر میں "بلاتبعۃ" لکھا ہے یعنی نتیجہ عمل کے، اور حاشیہ پر صاوی کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بلا حق اور بلا محنت کے روزی دیتا ہے۔ (جلالین، ص ۵۰)

حضرت مریم کے قصہ میں یہی صورت حال پیش آئی، حضرت مریم گوشہ نشین تھیں، نہ محنت نہ مزدوری، عبادت خانہ میں بیٹھے بٹھائے خدا تعالیٰ اُنھیں روزی بھیج رہا تھا، یہ بے قیاس روزی تھی، بے حساب بمعنی بے شمار روزی نہیں تھی۔

مولانا تھانویؒ نے بھی اس لفظ کا ترجمہ سب سے الگ "بے استحقاق" کیا ہے اور تفسیر میں "بے مشقت" کا لفظ بھی بڑھا دیا ہے۔ مولانا تھانویؒ نے بھی موقع و محل کی رعایت رکھی ہے۔

مفتی صاحب مرحوم نے "بے سان و گمان" اردو کا عام محاورہ استعمال کر کے مراد قرآن کو بڑی اچھی طرح واضح فرمایا ہے۔

یہ فقرہ (البقرہ ۲۱۲، آل عمران ۲۷، اور النور ۳۷) میں بھی آیا ہے اور ان تینوں جگہ بغیر حساب سے رزق و روزی کی کثرت ہی مراد ہے۔

زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَ یَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ اللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔

(دنیا کی زندگی منکرین کی نگاہ میں محبوب و پسندیدہ بنادی گئی ہے اور وہ ایمان والوں کا مذاق اُڑاتے ہیں، حالانکہ پرہیزگار لوگ قیامت کے دن ان منکرین سے بلند مرتبہ ہوں گے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے شمار روزی عطا کرتا ہے۔

مطلب یہ کہ یہ منکرین سامان دنیا کی کثرت پر اتراتے ہیں حالانکہ یہ اترانے کی کوئی چیز نہیں۔

یہاں شاہ ولی اللہؒ نے "بے شمار" کے بعد "یعنی بسیار" کے لفظ سے تشریح بھی کر دی ہے۔

ڈپٹی صاحب اپنے "بے حساب" لفظ پر قائم ہیں، تینوں جگہ یہی لفظ لائے ہیں، مولانا تھانویؒ نے اس جگہ "بے اندازہ" لکھا ہے، یہ لفظ بھی بے شمار ہی کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

مولانا آزاد اور مودودی صاحب نے بھی ڈپٹی صاحب کے "بے حساب" کو پسند کیا ہے۔ البقرہ اور النور دونوں جگہ یہی لفظ لکھا ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ہاں البقرہ اور النور دونوں جگہ "بے شمار" کا لفظ ہے۔

النور کی آیت حسب ذیل ہے۔

لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ يَزِيْدَهُمْ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔

(ان ڈرانے والوں کو خدا تعالیٰ ان کے اعمال کا بہترین بدلہ عطا فرمائے گا اور اپنے فضل و کرم سے اور زیادہ دے گا اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔

اس آیت کا تعلق چونکہ آخرت کے فضل و کرم اور اجر و ثواب سے ہے اس لیے ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے یہ ترجمہ کیا ہے جو اوپر راقم نے تحریر کیا ہے "یرزق" کا ترجمہ روزی دیتا ہے "نہیں کیا حالانکہ اگلے بزرگ فارسی والے اور دونوں بھائی "رزق دیتا ہے" اور "روزی دیتا ہے" ترجمہ کر رہے ہیں۔

رزق و روزی کے الفاظ عام طور پر چونکہ دنیا کے کھانے پینے پر بولے جاتے ہیں، اس لیے ڈپٹی صاحب نے اور ان کی پیروی میں مولانا تھانویؒ اور مولانا مودودی دونوں نے ان الفاظ کو چھوڑ دیا ہے۔

شاہ صاحب نے اس پر نظر رکھی کہ قرآن نے دنیا کے کھانے پینے اور آخر کے اجر و ثواب دونوں پر رزق کا اطلاق کیا ہے، انفال آیت ۴ میں "لَهُمْ دَرَجَات عند ربهم و مغفرة و رزق كريم" کہا گیا ہے۔

تیسری آیت

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔

اس سے پہلے "قُلِ اللّٰهُمَّ مالك الملك توتي الملك من تشاء" فرمایا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں، اس طرح پکارو!

اے خدا! تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور زندہ کو مردہ سے، اور جس کو چاہے بے حساب روزی عطا فرماتا ہے۔

اس جگہ مولانا اصلاحی نے روزی کا ترجمہ سب سے الگ کیا ہے۔

"اور تو جس پر چاہتا ہے اپنا بے حساب فضل کرتا ہے۔"

"بغیر حساب" کا ایک ٹھیٹ ہندی ترجمہ بھی کیا گیا ہے "اور اللہ جسے چاہے بے گنتی دے۔"

یہ ترجمہ مولانا احمد رضا خاں صاحب مرحوم کا ہے جس میں انفرادیت موجود ہے۔

رزق روحانی

ابھی حال میں تدبر قرآن کے نام سے مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی ایک نہایت عمدہ اردو تفسیر شائع ہوئی ہے۔ اصلاحی صاحب نے جمہور علماء سے الگ "رزق" سے علم و فضل اور روحانی کمال مراد لیا ہے اور یہ ترجمہ فرمایا ہے:

"بے شک اللہ جس پر چاہے بے حساب فضل فرماتا ہے۔" (۲۸۰)

اصلاحی صاحب مشہور مفسر قرآن مولانا حمید الدین صاحب فراہی کے مایۂ ناز شاگرد ہیں۔

مولانا نے جمہور سے الگ یہ راہ حضرات تابعین کے کسی نادر قول کی بنا پر اختیار کی ہے یا موصوف کے استاد کا اجتہاد ہے؟ یہ بات تفسیر سے معلوم نہیں ہو سکی۔

عقلیت پسند مفسرین میں مولانا ابوالکلام آزاد کو بہت شہرت حاصل ہے، مگر مولانا نے بھی اس جگہ جمہور کی تاویل کو اختیار کیا اور مولانا ابوالاعلیٰ صاحب بھی جمہور کے ساتھ چلے ہیں، حالانکہ مودودی صاحب پر بھی علماء سلف کے خلاف چلنے کا بڑا بھاری الزام لگایا جاتا ہے۔□□

مُفتی اعظم اور ملّی اتحاد

تحریک خلافت کے موقع پر ۱۹۱۹ء میں حضرت شیخ الہند کے شاگردوں کی جماعت نے جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد رکھی جس کا اوّلین مقصد مختلف مکاتب فکر کے اہل علم و مشائخ کا مشترکہ امور میں اتحاد و عمل کے ساتھ جدوجہد کرنا تھا۔ چنانچہ علماء اسلام کی اس تنظیم میں مشائخ سجادگان، اہل حدیث، وہابی اور سنی ہر فکر و نظر کے حضرات شامل تھے۔

خلافت کے دور میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی تمام مسلمانوں کو ایک مذہبی قیادت پر متحد کرنے کی کوشش کر چکے تھے اور اس سلسلہ میں اپنے آپ کو بطور امیر شریعت بیعت شروع کردی تھی مگر جب مولانا کو معلوم ہوا کہ دیوبند اور لکھنؤ کے بعض اکابر علماء نے اس سے اتفاق نہیں کیا تو مولانا نے نہایت خاموشی کے ساتھ اس تحریک کو واپس لے لیا تھا۔

البتہ جمعیۃ علماء کی تنظیم کا تجربہ اتحاد امت کے سلسلہ میں بڑی حد تک کامیاب رہا، علماء کے لیے خداترسی ضروری قرار دی گئی ہے جس میں خوف خدا اور خشیت نہ ہو وہ علماء میں کیسے شامل ہو سکتا ہے؟

خدائے تعالیٰ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو علماء ہوتے ہیں، یعنی عالم وہی ہے جس کے دل میں خداترسی ہو۔ ایسے خداترس علماء جس گروہ میں ہوئے ہیں انھوں نے امت کے اندر بے مقصد تفریق پیدا کرنے سے اپنے آپ کو بچایا ہے۔ جمعیۃ علماء کے نظام پر دیوبندی علماء کا غلبہ رہا ہے۔ ایک مرتبہ کچھ بریلوی علماء نے مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی سے (جو دیوبندی مکتب فکر سے تعلق نہیں رکھتے تھے) شکایت کی جمعیۃ علماء پر دیوبندی چھائے چلے جارہے ہیں۔ مولانا نے انھیں جواب دیا۔

"جمعیۃ علماء کے مقاصد ایسے ہیں کہ جس میں ان دیوبندیوں کا زور ہونا ہمارے مقاصد کے خلاف نہیں ہے۔ ہماری اور ان کی کوئی دینی مغایرت نہیں ہے۔"

یہ خداترسی کی بات ہے کہ۔ مولانا نے کتنی اصولی بات فرمائی جب مقاصد سب کے ایک ہیں تو پھر کسی ایک مکتب فکر کے غالب ہونے اور دوسرے کے مغلوب ہونے کی بحث ہی فضول ہے۔ پھر یہ دیوبندی علماء بھی اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ معمولی مسائل میں ضد اور اصرار سے بچیں۔

مفتی کفایت اللہ صاحب اختلافی مسائل میں حضرت گنگوہی کا مشرب رکھتے تھے ان کی صدارت کے دور کا واقعہ ہے کہ ایک بستی میں تبلیغی جلسہ ہوا جس میں بریلوی اور دیوبندی علماء دونوں شریک ہوئے۔ بریلوی صاحبان نے شرارت کے طور پر شروع میں میلاد شریف پڑھ کر سلام اور قیام کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ دیوبندی اُٹھ کر چلے جائیں اور عوام میں ان کے بارے میں بدگمانی پھیل جائے گی۔ چنانچہ مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری اُٹھ کر چلے گئے۔ لیکن حضرت مفتی صاحب نے قیام کیا مولانا احمد سعید صاحب دہلوی نے بھی مفتی صاحب کو دیکھ کر مولانا احمد سعید صاحب دہلوی نے بھی مفتی صاحب کو دیکھ کر قیام کیا۔ جلسے کے بعد مولانا احمد سعید صاحب نے سوال کیا۔ فرمایا یہ اختلافی مسائل ہیں ان میں شدت اختیار کرنا مناسب نہیں اور علماء کا اختلاف دیکھ کر ان نو مسلموں میں علماء کی طرف سے نفرت بیٹھ جاتی ہے اور اسلام کی تبلیغ کو نقصان پہنچتا ہے۔

(مفتی اعظم کی یاد، ص ۲۰۰)

مفتی صاحب کی اصابت رائے کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ مدرسہ امینیہ میں یہ استفتاء آیا کہ ایک شخص نے خانۂ خدا کی توہین کی ہے۔ اس کے لیے کیا حکم۔ مدرسہ کے علماء نے جواب لکھا کہ وہ شخص کافر ہوگیا کیونکہ مسجد شعائر اللہ میں سے ہے اور سعائر اللہ کی توہین کفر ہے۔ مفتی صاحب نے جواب لکھا اور فرمایا تم لوگوں نے کفربازی شروع کردی کیا تمھیں ائمہ ہدیٰ کا یہ اصول معلوم نہیں کہ اگر کسی شخص میں کفر کے ۹۹ وجوہ موجود ہیں اور ایک وجہ ایمان کی بھی موجود ہو تو اسے کافر

نہیں کہا جاسکتا۔

اس شخص نے جس مسجد کی توہین کی ہے یہ ممکن ہے کہ وہ مسجد اراضی مغصوبہ (غصب شدہ زمین) پر بنائی گئی ہو۔ کیا تم نے تحقیق کرلی؟ پھر کفر کا فتوئی کیوں لگاتے ہو۔ قارئین کو یقیناً تعجب ہوگا کہ تکفیر کے نازک معاملہ میں اتنی احتیاط کرنے والے مفتی صاحب قبلہ کے سامنے جب علامہ شبلی مرحوم کی تکفیر کا فتوئی آیا تو مفتی صاحب نے اس پر دستخط کردیئے۔

علامہ سیّد سلمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ علامہ کی تکفیر کے فتوے پر جب میں نے مفتی کفایت اللہ صاحب کے دستخط دیکھے تو میں حیرت میں پڑ گیا کیونکہ میں مفتی صاحب کو بہت محتاط اور گہرا عالم سمجھتا تھا۔

بے شک مفتی صاحب بہت گہرے عالم دین تھے مگر کبھی کبھی ماحول کی شدت بڑے سے بڑے دانشور کو متاثر کردیتی ہے آخر وہ بھی بشر ہی ہوتا ہے۔

علامہ شبلی کی جدید کلامی تشریحات سے قدیم علماء کو اختلاف تھا اور ان حضرات کی طرف سے علامہ پر دہریت اور نیچریت کا فتوئی لگایا گیا تھا۔

علامہ کے خلاف یہ طوفان اتنی شدت سے اُٹھا تھا کہ حضرت مفتی صاحب جیسا محتاط عالم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔□□

بسم اللہ الرحمن الرحیم

○ عالم اسلام کے عظیم انقلابی مفکر	شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ
○ فرنگی کے خلاف سب سے پہلے جہاد کا فتویٰ دینے والے	شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ
○ جہاد بالاکوٹ کے قافلہ سالار	سیّد احمد شہیدؒ
○ توحید وسنت کے بے باک مبلغ	شاہ اسمٰعیل شہیدؒ
○ ۱۸۵۷ء کے جہاد شاملی کے امیر	حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ
○ تحریک آزادی کی چھاؤنی دار العلوم دیوبند کے بانی	مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
○ تصوف وسلوک اور فقہ کے امام	مولانا رشید احمد گنگوہیؒ
○ تحریک ریشمی رومال کے قائد	شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ
○ تحریک آزادی کے عظیم راہ نما	مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ
○ فقہ ودانش کے عظیم پیکر، ابو حنیفہؒ ثانی	مولانا مفتی کفایت اللہ
○ دعوت و تبلیغ کی عالمی تحریک کے داعی	مولانا محمد الیاسؒ
○ کاروانِ علم وفضل کے سالارِ اعظم	مولانا سیّد محمد انور شاہؒ
○ اصلاح وارشاد اور تصوف واحسان کے عظیم داعی	مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ
○ جہد مسلسل اور جفاکشی کے مثالی پیکر	مولانا سیّد عبید اللہ سندھی
○ توحید وسنت کے پرچار کے لئے شمشیر برہنہ	مولانا احمد سعید دہلویؒ
○ جنگ آزادی کے حدی خواں	سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
○ سنت نبویؐ کے عملی پیکر	مولانا احمد علی لاہوریؒ
○ باطل تحریکوں کے خلاف سیف بے نیام	مولانا غلام غوث ہزارویؒ
○ تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کے سالارِ اعظم	مولانا مفتی محمود سرحدیؒ
○ تحریک تحفظ ختم نبوت کے عظیم قائد	مولانا سیّد محمد یوسف بنوریؒ
○ تحریک آزادی کے عظیم مجاہد	مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہارویؒ
○ جمعیۃ علماء کے فکری رہنما	مولانا سید محمد میاں صاحبؒ

أُولٰئكَ آبائي فجئني بمثلهم　　إذا جمعتنا يا جرير المجامع

گلشن قاسمی کا گل سرسبد

مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ نور اللہ مرقدہٗ

از ــــــــ مولانا معز الدین احمد قاسمی

جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد کے اُفق پر جو علم وفضل کے درخشندہ و تابندہ ستارے نمودار ہوئے ہیں۔ ان میں وہ آفتاب فضل و کمال بھی ہے جس کی ضیاپاشی اور ضوباری سے عالم اسلام نصف صدی سے زائد منور رہا اس گلشن قاسمی کے گلہائے رنگا رنگ میں وہ گل سرسبد بھی ہے جس کی بوئے علم وعرفان صدیوں محسوس کی جاتی رہے گی۔ اس بزم نانوتویؒ کے سرمستوں میں وہ دانائے راز بھی ہے جس نے ہم عصروں میں تفقہ فی الدین کا ذوق پیدا کیا، جس کی بے پناہ قوت اجتہاد نے علماء دین قیم کے لیے مشعل راہ کا کام کیا۔ اور جس کی بصیرت اور حسن تدبر نے علم وسیاست کی اُلجھی ہوئی گتھیوں کو بیک جنبش نگاہ حل کر دیا۔ قدرت کی فیاضیوں نے جس کو نانوتویؒ ذکاوت، گنگوہیؒ فقاہت کا آئینہ دار اور عزم محمودیؒ کا پیکر بنایا تھا جو بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، ادیب، شاعر، خطاط، ریاضی دان، سیاست دان اور مجاہد دوراں سب کچھ تھا اپنی ہمہ جہت و ہمہ نوع خوبیوں کے باعث "اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم" کا مصداق تھا جس کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا:

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی الواحد

دنیا نے اس عظیم ہستی کو "مفتی اعظم ہند"، "فقیہ الامت"، "رئیس العلماء"، "ابو حنیفۂ زماں" اور "مفکر بے بدل" جیسے خطابات سے نوازا جو اس کی قامت پر بالکل چست تھے۔ یہ مجموعۂ کمالات ذات گرامی "مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ شاہجہانپوری ثم دہلوی رحمۃ اللہ علیہ" کی تھی۔ بالیقین آپ اپنی جامعیت و سابقیت کے باعث اقلیم علم وکمال کے تاجدار۔ میدان سیاست کے یکہ تاز، زمانے کے نبض شناس نباض، بحر شریعت وطریقت کے کامیاب غواص، مختصر یہ کہ قافلہ فضل وکمال کے درشہوار اور قافلہ حریت کے قافلہ سالار تھے:

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

ولادت اور تعلیم

یہ شہنشاہ علم وفضل شاہجہانپور کے ایک غریب خانوادہ کا چشم و چراغ ہے جو ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں شیخ عنایت اللہ بن فیض اللہ بن خیر اللہ بن عباد اللہ الخ کے گھر "محلہ سن زئی" میں پیدا ہوئے۔ شیخ عنایت اللہؒ کے فرزند ارجمند کی جبین سعادت پر علم کی بلندی کا ستارہ پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا:

بالائے سرش زہوشمندی می تافت ستارہ بلندی

مستقبل کا یہ مفتی اعظم بچپن ہی سے لہو ولعب سے محترز کھیل کود سے بے رغبت اور تعلیم وتفکر کی طرف مائل تھا نیز والد گرامی کے اندر غربت وناداری کے باوجود اولاد کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کا ولولہ صادق تھا۔ چنانچہ جب عمر پانچ برس کی ہوئی تو تعلیمی سفر شروع ہو گیا۔ حافظ برکت اللہ مرحوم کے مکتب میں قاعدہ بغدادی سے ناظرہ قرآن کریم تک اور حافظ نسیم اللہ مرحوم کے مکتب واقع محلہ درگ زئی میں اردو و فارسی کی تعلیم حاصل کی پھر مدرسہ اعزازیہ قائم کردہ مولوی اعزاز حسن خان مرحوم اعلیٰ کتابوں اور قطب عالم حضرت گنگوہیؒ کے مرید باصفا حضرت مولانا عبید اللہ خاں افغانی" متوفی ۱۳۲۱ھ تلمیذ رشید عالم شہیر مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ سے قافیہ، قدوری تک عربی کتابوں کا درس لیا۔ استاذ کی نگاہ جوہر شناس نے اس

دُور یکتاد جوہر قابل کو پہچان لیا۔ اور اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے ازہر ہند دارالعلوم دیوبند بھیجنا چاہا مگر والدین اپنی غربت و ناداری نیز مسافت کی دوری کی وجہ سے رضامند نہ ہوئے بالآخر بڑی ردوکد کے بعد مدرسۃ الغرباء شاہی مسجد مراد آباد بھیجنے پر والدین کو آمادہ کیا جو دارالعلوم دیوبند ہی کی ایک شاخ تھا اور نابغہ روزگار اساتذہ کے باعث ثانیٔ دارالعلوم بنا ہوا تھا۔

آغوشِ مدرسہ شاہی میں

۱۳۱۰ھ میں اپنے استاذ مربیّ مولانا عبید الحق خاں افغانی ؒ کا گرامی نامہ لے کر رفیقِ درس حافظ عبدالمجید کے ہمراہ مدرسۃ الغرباء شاہی مسجد مراد آباد پہنچے واقعہ کی تفصیل آپ کے خلف الرشید مولانا حفیظ الرحمٰن واصف مرحوم کی زبانی سنئے:

"غریب والدین کے لیے اپنی اولاد کو جدا کرنا اور پھر اس کمسنی میں پردیس بھیج دینا بڑا کٹھن ہوتا ہے مگر مولانا عبید اللہ خاں صاحب ؒ کا تصرف باطنی کہئے یا کارکنان قضاء و قدر کی کارسازی سمجھئے کہ یہ مسئلہ بڑی آسانی کے ساتھ طے ہو گیا اور یہ دونوں ساتھی مولانا کا خط لے کر مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد کے مہتمم مرزا حافظ بنی بیگ ؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مرزا صاحب مولانا کے پیر بھائی تھے۔ خط ان کے نام تھا مگر وہ ان دنوں بمبئی گئے ہوئے تھے۔ نائب مہتمم حاجی محمد اکبر خاں سوداگر مرحوم نے خط دیکھ کر بڑی نوازش فرمائی اور ہاتھی خانے کی مسجد میں مولوی عبدالخالق کے پاس عارضی طور پر ٹھہرادیا۔ اور بعد میں مستقل قیام کے لیے حافظ محمد اسماعیل وکیل کا دیوان خانہ واقعہ محلہ مغل پورہ تجویز کیا گیا۔ اور کھانا مولانا قاضی محمد حسن مرادآبادیؒ کے اصرار پر مولانا ممدوح کے یہاں کھاتے تھے۔ اوپر کے خرچ کے لیے اپنے ہاتھ سے ٹوپیاں بن کر بازار میں فروخت فرماتے تھے اور نہایت خودداری کے ساتھ طالب علمانہ زندگی بسر فرماتے تھے۔"

۱۳۱۱ھ میں داخلِ مدرسہ ہوئے۔ دو سال قیام رہا جس میں حضرت مولانا عبدالعلی قاسمی میرٹھیؒ تلمیذ رشید حضرت نانوتویؒ، مولانا حافظ عبدالرحمٰن امروہوی محشی بیضاویؒ، مولانا محمود حسن سہسوانیؒ، مولانا قاضی محمد حسن مراد آبادیؒ (مغل پوری) اور مولانا بشیر احمدؒ وغیرہ اساتذۂ باکمال سے مختلف علوم و فنون کی درس کتابوں کا اکتساب درس کیا اور ۱۳۱۱ھ و ۱۳۱۲ھ کے امتحانات سالانہ کے موقع پر اکابر دارالعلوم دیوبند شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، محدث شہیر مولانا خلیل احمد مہاجر مدنی مفتیٔ اعظم مفتی عزیزالرحمٰن عثمانی، مولانا حافظ محمد احمدؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند رحمہم اللہ کو امتحان دے کر تمغۂ امتیاز حاصل کیا۔ کتابیں اور ان کے نمبرات حسب ذیل ہیں۔ کنزالدقائق ۲۱، اصول الشاشی ۲۰، شرح تہذیب ۲۰، قطبی ۲۰، شرح جامی ۱۹، شرح وقایہ ۱۸، ہدایہ اوّل ۲۰، نورالانوار ۲۰، جلالین شریف ۱۹، قطبی مع میر ۲۱۔

یاد ہے کہ مجوزہ نمبر ۲۰ ہوا کرتے تھے۔ رفقائے درس میں مولانا عبدالخالق شاہجہانپوری، مولانا عبدالمجید شاہجہانپوری، مولانا فیض الحسن عمروی مراد آبادی والد گرامی مولانا فخرالحسنؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ازہرِ ہند دارالعلوم دیوبند

دو سال مدرسہ شاہی میں زیرِ تعلیم رہ کر شوال ۱۳۱۲ھ میں مرکز علم و عرفان دارالعلوم پہنچے جہاں علم کا بحر بیکراں پوری آب و تاب کے ساتھ موجزن تھا۔ تشنگانِ علوم نبوت سے بقدر ظرف سیراب ہو رہے تھے۔ زمامِ اہتمام مولانا محمد منیر نانوتویؒ کے ہاتھوں میں تھی اور منصب صدارت پر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ جیسا جہبذ وقت فائز تھا۔ احاطۂ مولسری کے کمرہ نمبر ۴۲ میں قیام رہا۔ مادر علمی میں تعلیمی مدت تین سال ہے جس کے دوران مختلف علوم و فنون کی پچیس کتابیں پڑھیں اور ۱۳۱۵ھ میں سند فراغ حاصل کی۔ حضرات اساتذہ کی فہرست میں حضرت شیخ الہندؒ کے علاوہ حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری، حضرت مولانا عبدالعلی میرٹھیؒ، حضرت مولانا

حکیم محمد حسنؒ برادر خورد شیخ الہندؒ حضرت مولانا غلام رسول بغوی ہزارویؒ اور حضرت مولانا منفعت علی دیوبندیؒ جیسے اساطینِ فضل و کمال شامل ہیں اور رفقاء درس میں محدث العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ، بانیٔ مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ مولانا سیّد احمد فیض آبادیؒ، مولانا محمد شفیع دیوبندیؒ صدر مدرس مدرسہ عبدالرب دہلی، مولانا ضیاء الحق دیوبندی صدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلی وغیرہم علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب شامل ہیں۔

بائیس برس کی عمر میں غریب خانوادہ کا چشم و چراغ بزم محمودی کا ایک دانائے راز بن کر نکلا، اپنی خداداد ذہانت و ذکاوت نیز ”آنانکہ خاک راہ بنظر کیمیا کنند“ کے مصداق اساتذہ باکمال کی فیض صحبت کے اثر سے اقران واعیان میں امتیازی مقام اور تبحر علمی و جامعیت کی وہ شان حاصل کرلی کہ شاید و باید کسی کو نصیب ہو۔ علوم عقلیہ و شرعیہ میں سے کوئی ایسا علم نہیں جس میں آپ کو مہارت تامہ حاصل نہ ہو علم و ادب کا کوئی ایسا میدان نہیں جس میں آپ نے گوئے سبقت حاصل نہ کرلی ہو۔ شیخ الاسلامؒ کا ارشاد ہے کہ ”گرچہ ہزاروں علماء نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہٗ العزیز سے علوم نقلیہ و عقلیہ کا استفادہ کیا مگر قدرت کی فیاضیوں نے جو خاص جامعیت اور سابقیت مفتی صاحب مرحوم کو عطا فرمائی تھی وہ بہت کم نصیب ہوتی ہے۔“

صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:

”كان الشيخ كفايت الله قوى العلم عالماً متقناً ضليعا طويل الباع، راسخ القدم فى الفقه، عظيم المنزلة فى الافتاء و تحرير المسائل و تنقيحها يكتبها بعبارة وجيزة متينة وكان دقيق النظر فى المسائل والنوازل جيد المشاركة فى الحديث وصناعته له ذوق فى الادب العربى وقدرة على قرض الشعر بارعاً فى الحساب والعلوم الرياضية جيد الخط۔“

الحاصل آپ ایک بلند پایہ بے مثال فقیہ و محدث ہونے کے ساتھ ادب و شاعری میں اُس مقام بلند کے مالک تھے کہ آپ کے کلام پر قدماء کے کلام کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ حساب و ریاضی میں تو مشکل ہی سے کوئی عالم آپ کا حریف ہو سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ خط نسخ و نستعلیق میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ تاہم اصل طغرائے امتیاز آپ کا بے نظیر تفقہ فی الدین غیر معمولی مجتہدانہ بصیرت اور جزئیات فقہ پر بے پایاں عبور ہے جس کی وجہ سے ملت بیضانے مفتی اعظم کا خطاب دیا اور کوئی شبہ نہیں کہ آپ کی قامتِ تفقہ پر اس خطاب کا جامہ بالکل چست آتا تھا۔ اور عالم اسلام کے مسلمہ مفتی مانے جاتے تھے۔ مختلف الخیال علماء بھی آپ کے فتاویٰ بلا چون و چرا تسلیم کرتے تھے۔ آپ کا فیصلہ ایسا مستحکم داخل ہوتا تھا کہ کسی کے لیے اس کا خلاف کرنا آسان نہ تھا۔

اسی طرح دوسرا امتیازی وصف آپ کا بے مثال حسن تدبر ہے جس کے تمام علماء ہند، زعمائے سیاست، کارپردازانِ تحریکِ آزادی قائل ہی نہیں بلکہ معتقد تھے۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ جیسے عبقری شخص کا ارشاد ہے کہ ”میں اس وقت مولانا کفایت اللہ صاحب کے حسن تدبر کا معتقد ہوں۔“ اس وصف کے باعث آپ قائدانِ ملت کے بے خطا مشیر سمجھے جاتے ہیں۔ نزاعی مسائل میں ”مصالحتی فار مولا“ پیش کرنے میں سند مانے جاتے ہیں۔ گاندھی و نہرو اور علی برادران جیسے چوٹی کے رہنما بات بات میں آپ سے مشورہ کرتے نظر آتے ہیں۔ شیخ الہندؒ اربابِ جمعیۃ کو وصیت کرتے ہیں کہ وہ مولانا کفایت اللہ کو کبھی نہ چھوڑیں۔

جمعیۃ علماء ہند کی تاسیس

آپ کے حسن تدبر کا ہی کرشمہ ہے کہ مختلف الخیال مکاتب فکر کے علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کی بنا ڈالی جو آپ کا ایسا زندہ جاوید کارنامہ ہے کہ آئندہ نسلیں اس پر جس قدر آپ کو داد دیں کم ہے۔ اور صرف جمعیۃ علماء ہی نہیں بلکہ تحریکِ آزادی کے طلوع سے لے کر اس کے غروب تک کوئی ایسی سیاسی جماعت نہ تھی جس میں آپ کے مفید مشوروں اور تدبر کا دخل نہ ہو۔ جنگِ آزادی سے متعلق کوئی پارٹی یا کانفرنس ایسی نہ تھی جو سرزمین

ہند پر اُبھری ہو۔ اور اس کے کاکل پیچاں کے سنوارنے اور اس کی خمدار زلفوں کو زینت استقامت بخشنے میں آپ کا دست راست کارفرما نہ ہو۔ کوئی تجویز، ریزولیوشن اور عملی اقدام ایسا نہ تھا جو آپ کے مشورہ اور رائے عالی کا مرہونِ منت نہ ہو، تمام اکابر و اصاغر آپ کے اس جوہر گراں مایہ کے قدرداں تھے۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ تو اپنے گھریلو اور ذاتی معاملات میں بھی آپ ہی کے مشورہ پر عمل کرتے۔ شیخ الہندؒ جب کسی سیاسی لیڈر سے بات کرتے تو آپ کو ساتھ رکھتے اور فرماتے کہ مولوی کفایت اللہ کا دماغ سیاست ساز ہے۔

درس و تدریس

آپ کے تدریسی دَور کا آغاز مدرسہ عین العلم شاہجہانپور سے ہوا جس کو آپ کے اوّلین استاذ مولانا عبید الحق خاں افغانیؒ نے مدرسہ اعزازیہ سے اختلافِ عقائد کی بنیاد پر علیحدہ ہو کر ۱۳۱۴ھ میں قائم کیا تھا۔ آپ کی فراغت کے بعد انھوں نے فوراً آپ کو بلالیا اور ۱۵؍روپے ماہوار پر تدریسی و دفتری خدمات سپرد کردیں جہاں شوال ۱۳۲۱ھ تک درس و افتاء کا کام انجام دیتے رہے اور دیگر متعلقہ خدمات و مصروفیات کو بھی بحسن وخوبی انجام دیا۔

شوال ۱۳۲۱ھ میں حضرت مولانا امین الدینؒ بانیٔ مدرسہ امینیہ دہلی کی طلب و فرمائش پر دہلی تشریف لائے اور مدرسہ امینیہ کے صدر مدرس و مفتی کے عہدے پر مامور ہوئے۔ وہ دہلی جہاں حقیقت نگر نگاہیں خاندانِ ولی اللہی کے ختم ہونے کے بعد کسی بدرِ کامل کی منتظر تھیں قدرت نے اسی خاندان کے خوشہ چینوں میں سے آپ کی ہستی کو چن لیا اور پیشانی پر ولی اللہی انوار لے کر آسمانِ دہلی کے اُفق پر نمودار ہوئے اور تقریباً نصف صدی سر زمین دہلی سے عالم اسلام کو اپنی ضیا پاش شعاعوں سے منور رکھا۔

رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ میں بانی مدرسہ امینیہ مولانا امین الدینؒ کا وصال ہوگیا تو حضرت شیخ الہندؒ نے ۹؍شوال ۱۳۳۸ھ کو مدرسہ کا انتظام و انصراف اور اہتمام بھی آپ کے سپرد کردیا۔ اس وقت سے لے کر تادمِ واپسیں آپ مدرسہ امینیہ بلکہ ہندوپاک کے مفتی اعظم ہونے کے ساتھ مدرسہ امینیہ کے مہتمم بھی رہے۔ صدر مدرس بھی اور شیخ الحدیث بھی۔ البتہ ۱۰؍ربیع الاوّل ۱۳۶۲ھ کو مدرسہ کی ایک مجلس منتظمہ تشکیل دے کر اہتمام اس کے سپرد کردیا پھر بھی تمام امور آپ ہی انجام دیتے۔ ۵۵ سالہ زمانہ درلیس میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اربابِ فضل و کمال تیار ہوئے جن میں شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی امروہویؒ، مولانا مفتی مہدی حسن شاہجہانپوریؒ صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ، مولانا اکرام اللہ خاں ندویؒ ایڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ، مولانا مفتی عبد الغنی پٹیالویؒ شیخ الحدیث و مفتی مدرسہ امینیہ دہلی، مولانا حافظ سیّد محمد حسین فرزند ارجمند پیر جماعت علی شاہؒ، مولانا مفتی محمد اسماعیل بسم اللہ سورتیؒ مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات، مولانا محمد تقی امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جیسی شخصیات شامل ہیں۔

طرزِ تدریس و طریقۂ تعلیم میں اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ انتہائی مختصر اور جامع تقریر ہوتی۔ مسلک حنفیہ کی توثیق پر ایسے ایسے دلائل اس حسن و خوبی کے ساتھ پیش کرتے کہ مستفیدین از سرنو یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ حنفیہ کا مسلک اس قدر کتاب و سنت کے موافق ہے تو دنیا ان کو قیاسی کیوں کہتی ہے۔

تصنیف و تالیف

درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا ذوق بھی ابتداء عمر سے تھا مگر تدریسی، سیاسی، اور فتویٰ نویسی کی مصروفیات و مشاغل کی وجہ سے آپ کی تصنیفات کم ہیں پھر بھی جو ہیں وہ آپ اپنی شاہکار ہیں۔

۱۔ رسالہ "البرہان" مدرسہ عین العلم شاہجہانپور کے زمانہ تدریس میں تردید قادیانیت کے لیے یہ رسالہ جاری فرمایا جو آپ کے دہلی آجانے کے بعد بند ہوگیا۔ اس کے شماروں میں جو تردید قادیانیت پر آپ کے مضامین ہیں اگر اُن کو کتابی صورت دے دی جائے تو آپ کی پہلی علمی و مذہبی یادگار ثابت ہوں گے۔

۲۔ علامہ شبلی کا فتویٰ خود اپنے الحاد و زندقہ پر۔ ۱۳۳۲ھ ہند پریس دہلی سے شائع ہوا۔

۳۔ مسلمانوں کے مذہبی و قومی اغراض کی حفاظت۔ ۱۹۱۷ء میں دلی پرنٹنگ پریس میں طبع ہوا۔

۴۔ رسالہ شیخ الہند (حالات اسیری و سوانح شیخ الہند) حالات شیخ الہندؒ پر یہ پہلا رسالہ ہے ۱۹۱۸ء میں انجمن اعانت نظربندان اسلام کی طرف سے شائع ہوا۔

۵۔ روض الریاحین (عربی قصیدہ) ۱۳۲۷ھ میں افضل المطابع دہلی میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

۶۔ تعلیم الاسلام (چار حصے) یہ آپ کی مشہورِ زمانہ تصنیف ہے۔ بے شمار مدارس میں بچوں کے لیے داخل نصاب ہے۔ متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

۷۔ کفایت المفتی۔ ۹ جلد۔ یہ آپ کا علمی شاہکار ہے جو آپ کے فتاویٰ پر مشتمل ہے۔ آپ کے خلف الرشید مولانا حفیظ الرحمٰن واصف مرحوم نے حسن ترتیب کے ساتھ مرتب فرمایا ہے۔

۸۔ دلیل الخیرات فی ترک المنکرات۔

۹۔ خیر الصلاۃ فی حکم الدعاء للاموات۔ یہ دونوں رسالے ۱۳۳۶ھ میں طبع ہوئے۔

۱۰۔ النفائس المرغوبہ فی حکم الدعاء بعد المکتوبہ۔

۱۱۔ الصحائف المرفوعہ۔ یہ دونوں رسالے یکجا ۱۳۴۹ھ میں جید برقی پریس دہلی سے طبع ہوئے۔

۱۲۔ رسالہ قنوت نازلہ۔

ان کے علاوہ متعدد سیاسی رسائل اور مضامین بھی آپ نے تحریر فرمائے ہیں۔

ملّی، قومی اور سیاسی خدمات

اس باب میں آپ کی خدمات اس قدر وسیع ہیں کہ دفتر کا دفتر تیار ہو جائے۔ یہ مختصر مضمون اس کا متحمل نہیں تاہم صرف چند عنوانات ذکر کر دیئے جاتے ہیں جو طالبانِ تاریخ کیلئے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔

۱۔ ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں "جمعیۃ الانصار" کا قیام عمل میں آیا۔ آپ اس کے رکن قرار پائے۔ اس کے تمام اجلاسوں میں شرکت کی۔ یہی وہ تحریک ہے جو ۱۹۱۶ء میں ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے ظاہر ہوئی۔ آپ ایک مدت تک اس تحریک کی مرکزی قوت رہے۔

(الرشید دارالعلوم نمبر، ص ۴۶۵)

(۲) ۱۳۳۱ھ - ۱۹۱۳ء میں جنگ بلقان کے مجروحین کے لیے طلبائے مدرسہ امینیہ کو ساتھ لے کر چندہ کر کے ان مظلوموں کو پہنچایا جس کی میزان تین ہزار آٹھ سو چورانوے روپے آٹھ آنے نو پائی ہے۔

۳۔ ۱۹۱۶ء میں لارڈ مانٹیگو کی آمد کے موقع پر آپنے میثاق لکھنؤ (کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ہوئے سمجھوتہ) پر ایک مفصل تنقید بصورت پمفلٹ شائع کیا۔ جس میں آپنے سب سے پہلے آزادی کی آواز بلند کی جبکہ آزادی کا نام لینا بھی خطرناک تھا۔

۴۔ رولٹ ایکٹ کے نفاذ اور تحریک شیخ الہند کے قائدین کی گرفتاری و جلاوطنی کے بعد ۱۹۱۷یا ۱۹۱۸ء میں حکیم اجمل خاں مرحوم وغیرہ سے "انجمن اعانت نظربندانِ اسلام" قائم کرائی۔

۵۔ دسمبر ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کا گیارہواں اجلاس دہلی میں ہوا۔ اس میں دیگر علماء کے ساتھ آپ نے شرکت کی صدر استقبالیہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم تھے۔ ان کا خطبہ استقبالیہ آپ ہی نے تیار کیا تھا جو اتنا پر جوش اور مدلل تھا کہ صوبہ متحدہ کی حکومت نے بغاوت کے اندیشہ میں اس کو ضبط کر لیا۔

۶۔ ۱۳ر نومبر کو دہلی میں مولوی فضل الحق کی صدارت میں خلافت کانفرنس ہوئی جس میں آپنے برطانیہ کے جشن صلح کا بائیکاٹ کرنے کی تجویز پیش کی جس کی دیگر علماء کے علاوہ سیٹھ چھوٹانی اور مسٹر گاندھی نے بھی تائید کی۔

۷۔ نومبر ۱۹۱۹ء میں خلافت کانفرنس کے موقع پر مختلف الخیال مکاتب فکر کے علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے "جمعیۃ علماء ہند" قائم کی جس کے آپ ۱۹۳۹ء تک صدر رہے اور پھر تادم وفات ۱۹۵۲ء تک اس کی مجلس عاملہ کے رکن رکین۔ آپ کے زمانۂ صدارت میں جمعیۃ علماء ہند کے گیارہ عظیم الشان اجلاس ہوئے جس میں چھٹا اجلاس حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی صدارت میں

مراد آباد میں ہوا۔ جمعیۃ علماء کی روشن تاریخ آپ کا زندہ جاوید کارنامہ ہے۔

۸۔ ۱۹۲۲ء میں سوامی شردھانند کی شدھی تحریک اور ڈاکٹر مونجے کی سنگٹھن تحریک شروع ہوئی اور ارتداد کی مہم جاری ہوئی تو آپ نے جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اس تحریک کو نیست و نابود کر کے دَم لیا۔ شعبۂ تبلیغ و حفاظت اسلام قائم کیا۔ ۲۶؍ستمبر ۱۹۲۴ء کو اتحاد کانفرنس میں بھی آپ نے اعلانِ حق بلند کیا۔

۹۔ ۲۶؍ذی قعدہ ۱۳۴۴ھ کو مکہ معظمہ میں سلطان ابن سعود کی دعوت پر علامہ شریف شرف عدنان کی صدارت میں ایک عالمی موتمر اسلامی منعقد ہوئی جس میں آپ نے جمعیۃ علماء ہند کا وفد لے کر بحیثیت رئیس الوفد شرکت کی۔ مجلس مضامین کے ارکان میں مفتی اعظم فلسطین علامہ سیّد امین الحسینیؒ کے بعد آپ ہی کا اسم گرامی تھا۔ ان کے مطالبہ پر اس اجلاس کے ایجنڈے میں حکومت حجاز کی تشکیل کا مسئلہ بھی شامل کیا گیا۔ اس موتمر میں آپ نے نمایاں طور پر حصہ لیا۔ انسدادِ غلامی کی تجویز پیش کر کے پاس کرائی اور ایک تجویز پیش کر کے پاس کرائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عالم اسلام کے ہر عقیدے کے مسلمان اپنے عقائد کے مطابق اعمال حجاز و زیارت میں آزاد ہوں گے۔ حکومتِ حجاز اپنے معتقدات کی رُو سے کسی پر کوئی پابندی عائد نہیں کرے گی۔"

۱۰۔ ۱۹۲۹ء میں آپ نے سارداایکٹ کے خلاف "مجلس تحفظ ناموس شریعت" بنائی اور جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے عام ایجی ٹیشن اور قانون شکنی کا اعلان کیا۔ خود بھی اس قانون شکنی میں شریک ہوئے۔ ساردا بل پر بڑی معرکۃ الآراء تنقید کی جو "شریعت حفاظت" کے نام سے شائع ہوئی۔

۱۱۔ ۱۹۳۰ء میں نہرو رپورٹ پر ایک مفصل و مدلل تنقید شائع کی۔

۱۲۔ آزادئ ہند کی تحریک میں دو مرتبہ گرفتار ہوئے۔ پہلی بار ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی میں قانون تحفظ امن عامہ اور بغاوت کے جرم میں ۱۱؍اکتوبر ۱۹۳۰ء کو آپ کے دولت خانہ سے صبح چار بجے گرفتار کیا گیا اور دوسری بار جب دوسری گول میز کانفرنس دسمبر ۱۹۳۱ء کی ناکامی کے بعد دوبارہ سول نافرمانی تحریک جاری ہوئی اس موقع پر جمعیۃ علماء ہند کا پہلا ڈکٹیٹر آپ کو بنایا گیا۔ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں ایک لاکھ افراد کے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے آزاد پارک سے گرفتار کیے گئے۔ پہلی بار ۶ ماہ گجرات جیل میں اور دوسری بار ۱۸ ماہ ملتان جیل میں رہے۔

۱۳۔ ۱۹۳۸ء میں تقسیم فلسطین کے خلاف پورے ملک میں زبردست مظاہرہ کرایا اور ۷؍اکتوبر ۱۹۳۸ء کو مصر میں علامہ علی علوبہ پاشا کی صدارت میں موتمر فلسطین ہوئی جس میں آپ جمعیۃ علماء ہند کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اس سفر میں حضرت مولانا عبدالحق مدنیؒ مہتمم جامعہ قاسمیہ مراد آباد بھی آپ کے ہمراہ تھے۔

الغرض آپ نے ملک وملت کے لیے جو عظیم القدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی فہرست ہی اتنی طویل ہے کہ پوری کتاب تیار ہو جائے:

پھر سن لینا فرصت میں داستاں میری

ان عظیم خدمات و بے مثال کمالات کے باوجود آپ کی رفعت تواضع کا یہ عالم تھا کہ آپ کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ کسرنفسی، تواضع اور فروتنی میں آپ کا کوئی نظیر نہیں۔ گویا آپ فرمانِ رسول "من تواضع لله رفعه الله" کے مصداق اور اسوۂ نبوی "كان يخدم نفسه" کے مجسم پیکر تھے۔ ایسا کیوں نہ ہو تاجبکہ:

فروتنی است دلیل رسیدگانِ کمال
کہ چوں سوار بہ منزل رسید پیاد شود

حادثۂ وصال

علم و فضل کا یہ آفتاب عالم تاب ۳۱؍دسمبر ۱۹۵۲ء - ۱۳۷۲ھ کو غروب ہو گیا مگر اس کی جلائی ہوئی قندیلیں روشن ہیں اور تا ابد روشن رہیں گی اس گنجہائے گراں مایہ کو یکم جنوری ۱۹۵۳ء کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے جوار میں دفن کر دیا گیا:

آسماں اس کی لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزہ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مفتی اعظم

حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحبؒ

از ــــ مسعود حسن صدیقی

حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا نقشہ تو کوئی اہل دل عالم ہی پیش کر سکتے ہیں لیکن اللہ رب العزت کا فضل و کرم ہے کہ اس نے ایک بوڑھے عامی کا نام بھی مفتی صاحب کے نام لیواؤں میں لکھے جانے کا موقع عنایت فرمایا۔

حضرت مفتی صاحب کی ولادت ۱۸۷۵ء مطابق ۱۲۹۲ھ میں بمقام شاہجہاں پور (یوپی) ہوئی۔ والد شیخ عنایت اللہ صاحب شاہجہاں پور کے ایک دیندار بزرگ تھے۔ مسلم شرفاء کے دستور کے مطابق قرآن پاک پڑھایا۔ پھر اردو، فارسی کی ابتدائی کتب کی تعلیم دی۔ اس کے بعد دل پر پتھر رکھ کر والدین نے مراد آباد مدرسہ شاہی میں تعلیم کے لیے بھیج دیا۔ دو سال بعد دیوبند تشریف لے گئے اور دارالعلوم میں داخلہ لیا۔ تین سال دارالعلوم دیوبند میں حصولِ علم کیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جب کسی کو دینے پر آتا ہے تو خوب دیتا ہے۔ تعلیم دین کی اور وہ بھی دارالعلوم دیوبند میں۔ دورانِ تعلیم رفیق خصوصی حضرت مولانا حسین احمد مدنی صحاح ستہ کے ساتھیوں میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری اور مولانا امین الدین صاحب بانی مدرسہ امینیہ، دہلی اور اساتذہ میں مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھی، مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی، مولانا منفعت علی صاحب، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، مولانا حکیم محمد حسن صاحب دیوبندی، اور سب سے بڑھ کر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔

اس تراش خراش کے بعد ہیرا کتنا اعلیٰ ہوگا اس کا اندازہ لگانا ہم جیسے لوگ تو کیا بڑے بڑوں کے لیے مشکل ہے۔ زمانہ تعلیم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ مراد آباد اور دیوبند میں زمانہ طالب علمی نہایت خودداری سے گذارا اور کروشیا سے ٹوپیاں بُن کر ان کی آمدنی سے اپنے اخراجات پورے کرتے تھے۔

فراغت کے بعد کچھ عرصہ شاہجہاں پور ہی میں مدرسہ اعزازیہ میں مدرس رہے۔ پھر اپنے ہم سبق مولانا امین الدین صاحب کے بلانے پر مدرسہ امینیہ دہلی تشریف لے آوے۔ اور بطور مفتی و صدر مدرس کام شروع کیا۔ مولانا امین الدین کے انتقال کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ہمدردانِ مدرسہ سے مشورہ کے بعد مدرسہ امینیہ کا انتظام و اہتمام بھی سپرد کر دیا۔ مفتی صاحب نے ایک مجلس انتظامیہ بنائی اور اس کے مشورہ سے تاعمر مدرسہ امینیہ میں بطور مہتمم، صدر مدرس اور مفتی سب کچھ مفتی صاحب ہی کام کرتے رہے۔ مدرسہ کی عمارت اور مسجد کو از سر نو تعمیر کرایا اور دنیائے علم میں امینیہ اوّل درجہ کے مدرسوں میں شمار ہونے لگا۔ آپ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے بھی رکن تھے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے بیعت تھے۔

مفتی صاحب کے ہزاروں شاگرد ہندوستان و پاکستان کے علاوہ برما، ملایا، انڈونیشیا، افغانستان، ایران، عراق، شام، تبت، چین اور ممالک افریقہ تک کے تھے۔ ہندوستان کے شاگردوں میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب، مولانا اعزاز علی صاحب اور مفتی مہدی حسن صاحب جیسی ممتاز شخصیتیں بھی تھیں۔

مفتی صاحب کے فتاویٰ نہایت صاف، واضح اور مختصر الفاظ میں ہوتے تھے اور اہم فتاویٰ الجمعیۃ میں بھی شائع ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے

کہ ایک مرتبہ ایک صاحب نے دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، شیعہ، سنّی، قادیانی وغیرہ بہت سے فرقوں کے نام لے کر دریافت کیا تھا کہ یہ سب ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں۔ اب مسلمان کون ہے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا تھا کہ جتنے فرقوں کے آپ نے نام لیے ہیں، وہ سب مسلمان ہیں سوائے قادیانیوں کے جن کا نبی علیحدہ ہے۔

آپ کے فرزند اکبر مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصف نے مفتی صاحب کے فتاویٰ مرتب کر کے شائع کر دیئے ہیں۔

مفتی صاحب نے اسلامی تعلیمات کو مختصر طور پر مرتب کیا اور تعلیم الاسلام کے نام سے شائع کیا۔ یہ کتاب نہایت مقبول ہے اور اس کا انگریزی و ہندی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

ترک موالات کے بارے میں پانچ سو علماء کا مشہور فتویٰ بھی مفتی کفایت اللہ صاحب نے مرتب کیا تھا۔

جمعیۃ علماء ہند کے قیام میں آپ کا بڑا حصہ ہے اور اکابر علماء وقت نے صحیح طور پر ان کو جمعیۃ کا معمارِ اوّل قرار دیا ہے۔ آپ تقریباً بیس سال جمعیۃ علماء ہند کے صدر رہے اور دورانِ صدارت بہت سے اہم امور انجام دیئے۔

۱۹۲۲ء میں سوامی شردھانند کی تحریک شدھی کے خلاف کام کر کے بہت سے مسلمانوں کو ہندو ہونے سے بچایا۔

۱۹۲۵ء میں موتمر عالم اسلامی مکہ معظمہ میں بطور رئیس الوفد شریک ہوئے۔ اور مجلس مضامین کے نامزد ارکان میں مفتی اعظم فلسطین علامہ امین الحسینی کے بعد آپ ہی کا نام تھا۔

۱۹۲۹ء میں آپ کی زیر سرکردگی جمعیۃ علماء ہند نے شاردا ایکٹ کے خلاف "مجلس تحفظ ناموس شریعت" بنائی اور ہندوستان بھر میں اس ایکٹ کی خلاف ورزی کی۔

نہرو رپورٹ پر ایک مفصل تبصرہ شائع کیا۔ آپ کی زیر سرکردگی تقسیم فلسطین کے خلاف ہندوستان بھر میں ایجی ٹیشن ہوا اور تقسیم فلسطین کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ تحریک آزادی ہند کے سلسلہ میں دو مرتبہ گرفتار ہوئے۔ ایک بار چھ ماہ کی قید ہوئی اور دوسری بار ڈیڑھ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔

مولانا احمد علی صاحب لاہوری امیر انجمن خدام الدین جو ملتان جیل میں مفتی صاحب کے ساتھ تھے فرماتے ہیں کہ "مفتی صاحب کے اخلاق حمیدہ کا جو منظر جیل میں دیکھا وہ جیل سے باہر دیکھنے کا کبھی موقع نہ ملا۔ خدام (سی کلاس) قیدیوں کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتے تھے۔ جن قیدیوں کو ان کی خدمت کے لیے مقرر کیا جاتا تھا ان سے کام نہیں لیتے تھے کہ یہ بھی تو ہم جیسے قیدی ہیں۔ مولانا احمد سعید صاحب فرماتے ہیں کہ سیاسی و اخلاقی قیدیوں کے پھٹے ہوئے کپڑے سی دیا کرتے تھے۔

۱۹۳۰ء میں قصہ خوانی بازار پشاور میں تحریک آزادی کے سلسلہ میں برٹش گورنمنٹ نے بے تحاشہ گولیاں چلائیں اور ان گنت پٹھانوں کو شہید کیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے سردار وٹھل بھائی پٹیل نے جو اپنے وقت کے مانے ہوئے بہترین سیاست داں تھے مفتی صاحب کی سیاستدانی، ذہانت و ذکاوت کی بے انتہا تعریف کی جو اس وقت اخباروں میں شائع ہوئی لیکن رپورٹ حکومت نے ضبط کر لی تھی۔

بیس سال صدر رہنے کے بعد جمعیۃ علماء ہند کے صدر شیخ الاسلام حضرت مدنی" منتخب ہوئے۔ اسوۂ صحابہ کے مطابق اور حضرت خالد بن ولید کی سنت پر عمل کرتے ہوئے زندگی کے آخری لمحہ تک مکمل تعاون دیا۔ تبدیلی عہدہ کا دوسرے لوگ احساس بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ میرے آنکھوں دیکھی بات ہے ان اکابر کے سلسلہ میں۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ جمعیۃ علماء ہند کے دفتر سے حضرت شیخ الاسلام حضرت مفتی صاحب سے ملاقات اور مشورہ کے لیے روانہ ہوئے۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔ حضرت مفتی صاحب کے مکان پہنچنے کے بعد میں نے رخصت چاہی۔ حضرت مفتی صاحب نے فرمایا آپ بھی تشریف لائیے۔ میں بھی ساتھ اندر چلا گیا۔ مکان کے اندر کے کمرہ میں یہ دونوں بزرگ مشورہ میں مصروف تھے۔ میں علیحدہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس دوران اس کمرہ کی جو کیفیت تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ جب بھی خیال آتا ہے دل کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔

میں تقریباً چھ سال کوچہ چیلان میں رہا جہاں حضرت مفتی

صاحب کا مکان تھا۔ میں جب مفتی صاحب سے ملنا چاہتا جس مسجد میں وہ نماز پڑھتے تھے چلا جاتا تھا۔ نماز کے بعد سلام و مصافحہ کے بعد ساتھ ساتھ آتا۔ مفتی صاحب اپنے مکان میں چلے جاتے اور میں آگے اپنے مکان کو چلا جاتا۔ لیکن جب کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہوتا یا کسی خواب کی تعبیر لینی ہوتی تو مکان پر جاکر آواز دیتا "مفتی صاحب!" مفتی صاحب خود ہی تشریف لے آتے تھے۔ دوباری میں لکڑی کی ایک بینچ تھی اس پر بیٹھ جاتے اور مجھ سے بھی بیٹھنے کو کہتے۔ برابر میں بیٹھ کر اپنی بات کہتا اور مسئلہ کا جواب یا خواب کی تعبیر لے کر آجاتا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مفتی صاحب نے مصروفیت کا ذکر کر کے جلدی کی ہو یا ناگواری کا اظہار کیا ہو، کبھی پیشانی پر بل نہ آیا۔ مفتی صاحب نہایت بااخلاق تھے لیکن رعب دار شخصیت تھی۔

معاملات میں نہایت محتاط تھے۔ مثلاً جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس پشاور ۱۹۲۸ء میں اپنے بڑے صاحبزادے مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ ان کی عمر اس وقت سولہ سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔ ان کا سفر خرچ اور کھانے کا صرفہ باوجود استقبالیہ کے اصرار کے نہیں لیا۔ فرمایا کہ یہ اگرچہ صدر جمعیۃ علماء کا بچہ ہے لیکن جمعیۃ کا رکن تو نہیں ہے۔

مفتی صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کرتے تھے اور بغیر تفصیلی کیفیت معلوم ہوئے فیصلہ نہیں کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت تمام مرکزی سرکاری ملازمین سے دریافت کیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان میں رہنا پسند کریں گے یا پاکستان جانا چاہیں گے۔ میرے لیے یہ بڑا سخت مسئلہ تھا۔ بلالحاظ ہندو مسلم تمام دوست کہتے تھے کہ پاکستان لکھو، گھر والے بھی کہتے تھے کہ پاکستان لکھو کیونکہ اب ہندوستان میں مسلمان کو خاص کر سرکاری ملازمین کو رہنا ناممکن کے قریب ہوگا۔ لیکن میں نظریہ پاکستان کا مخالف تھا۔ پھر حضرت شیخ الاسلام سے تعلق۔ پاکستانی جن کو گالیاں دیتے تھے ان سے محبت اور جن کی تعریف کرتے تھے ان سے دوری۔ دیوبند جانے کا وقت نہیں تھا لہٰذا ارادہ کیا کہ مفتی صاحب سے مشورہ کروں۔ جانے کا ارادہ کرہی رہا تھا کہ دروازہ پر کسی نے آواز دی۔ گیا تو دیکھا حضرت مفتی صاحب کے چھوٹے صاحبزادے خلیل الرحمٰن صاحب کھڑے ہیں۔ یہ بھی سرکاری ملازم تھے۔ کہنے لگے کہ میں نے والد صاحب سے مشورہ کیا تھا کہ ہندوستان لکھوں یا پاکستان، فرمایا کہ مجھے دفتر کے حالات کا علم نہیں۔ بہتر ہے کہ مسعود صاحب سے مشورہ کرو۔ اس لیے آیا ہوں۔ مجھے انتہائی حیرت ہوئی اور کہا کہ میں تو خود مفتی صاحب سے مشورہ کرنے آرہا تھا۔ کہنے لگے وہ کوئی رائے دینے پر تیار نہیں ہیں اور مجھے آپ کے پاس مشورہ کے لیے بھیجا ہے۔ اس سے سبق حاصل کریں۔ وہ حضرات جو ہر معاملہ میں رائے دینے یا فیصلہ کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں چاہے اس سلسلے میں کچھ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔

ایک واقعہ اور یاد آیا۔ چتلی قبر (دہلی) پر ایک معمر دیندار شخص کی بکری تھی۔ ناشتہ کا سامان میں وہاں سے لایا کرتا تھا۔ ایک دن ان کو پریشان دیکھ کر میں نے وجہ دریافت کی۔ کہنے لگے کہ میرا لڑکا گھر سے ناراض ہو کر چلا گیا ہے۔ سخت پریشانی ہے۔ مختصر یہ کہ حکیم شریف الدین صاحب بقائی نے جن کا مطب بکری کے قریب ہی تھا ان کو مشورہ دیا کہ مفتی صاحب سے کہو۔ مفتی صاحب مدرسہ سے واپسی میں اکثر حکیم صاحب کے پاس بیٹھتے تھے۔ بکری والے صاحب آئے اور تذکرہ کیا۔ حکیم صاحب نے ان کی سفارش کی۔ مفتی صاحب نے چند منٹ خاموش رہ کر فرمایا کہ گھبراؤ مت۔ انشاء اللہ ایک ہفتہ میں واپس آجائے گا۔ چنانچہ وہ ٹھیک ایک ہفتہ میں خود واپس آگیا۔

ہمدرد دواخانہ کے قریب محلہ میں ایک بزرگ رہتے تھے۔ حافظ فخر الدین صاحب معمر آدمی تھے۔ لیکن خوش مزاج اور بے تکلف۔ مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کے خلیفہ تھے۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ حافظ صاحب! اس وقت دہلی میں سب سے بڑا ولی کون ہے؟ فرمایا "مفتی کفایت اللہ صاحب" یہ اس زمانہ کی بات ہے جب مولانا محمد الیاس صاحب امیر تبلیغی جماعت حیات تھے۔ میں ان دنوں جماعت میں چلا جاتا تھا۔ اور مرکز بھی۔ مولانا الیاس صاحب کا آخری زمانہ تھا۔ صاحبِ فراش تھے۔ نماز کے وقت ان کا پلنگ اُٹھا کر پہلی صف میں داہنی جانب رکھ دیا جایا کرتا تھا۔

مجھ سے رات کو قیام کے لیے فرماتے لیکن میں مکان واپس چلا آتا۔ ایک دن فرمایا "آج جمعرات ہے تم رات کو یہیں قیام کرنا۔" والد صاحب مرحوم بھی ساتھ تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ مولانا فرمارہے ہیں ٹھہر جاؤ۔ میں ٹھہر گیا۔ رات کو دو بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ دیکھا بارش ہو رہی ہے اور بارش میں چمک ہے۔ لیکن لوگ حوض پر وضو کر رہے ہیں۔ صحن میں چل پھر رہے ہیں۔ (اس زمانہ میں مسجد کا صحن اور حوض کھلے ہوئے تھے) بڑی حیرت ہوئی کہ ان کو بھیگنے کا خیال نہیں۔ اتنے اطمینان سے وضو کر رہے ہیں، تاہم اُٹھا اور کھلے صحن میں آیا تو پانی کی بارش نہیں تھی۔ رحمت کی بارش تھی۔ اب مفتی صاحب کا درجہ کیا ہوگا۔ اللہ ہی جانے یا اللہ والے۔ میں بڑا بدنصیب ہوں کہ میں نے کسی سے کچھ حاصل نہ کیا۔ کاہلی کے باعث دنیا کے دھندوں میں پھنسا رہا۔ اللہ والوں نے میرے سخت دل کو پگھلانے کے لیے کھلی کھلی نشانیاں دکھائیں لیکن یہ سنگلاخ زمین سنگلاخ ہی رہی۔ لیکن اس اعتبار سے خوش نصیب سمجھ کر دل کو تسلی دے لیتا ہوں کہ اللہ والوں کی نگاہ میں تو رہا۔ میں نے بہت کچھ کھویا مثلاً خوش نصیب لوگ رمضان المبارک کا مہینہ دیوبند میں گذارتے ہیں۔ شوق شوق جاتے ہیں مجھ سے مولانا اسعد مدنی مدظلہ نے خود فرمایا کہ رمضان میں دیوبند آجاؤ چاہے چند ہی روز کے لیے ہو۔ کاہلی کے باعث نہ جاسکا۔ اب تو جسم میں طاقت بھی نہیں رہی۔ میں نے اپنی عمر کے اسّی سال ضائع کیے۔ اس کا اب احساس ہے جو بیکار ہے اسی لیے اس مضمون کے پڑھنے والوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اللہ والوں کے قریب گذاریں اور دنیا سے کچھ لے کر جائیں۔

حضرت مفتی صاحب کا انتقال ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۲ء (۷۲ ۱۳ھ) رات کے ساڑھے دس بجے ہوا اور یکم جنوری ۱۹۵۳ء کو یادگار حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے دروازے اور ظفر محل کے درمیان مدفون ہوئے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

مفتی صاحب کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں بوقت انتقال تھیں۔ بڑے صاحبزادے مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصف مفتی صاحب کے بعد مدرسہ امینیہ کے بہت عرصہ تک مہتمم رہے اور اپنا کتب خانہ بھی چلاتے رہے۔ مفتی صاحب کے فتاویٰ آپ ہی نے مرتب کیے ہیں۔ مفتی اعظم کی یاد کے نام سے مفتی صاحب کے حالات بھی شائع کیے تھے لیکن یہ کتاب اب نایاب ہے۔ دوسرے صاحبزادے خلیل الرحمٰن صاحب، حکومت ہند میں ملازم تھے۔ ہندوستان میں رہنے کا ابتدائی فیصلہ کیا تھا لیکن فسادات کے دور میں پاکستان چلے گئے۔ ان کے داماد مولانا سمیع اللہ صاحب تھے جو ایک تاریخی شخصیت تھے اور اردو بازار دہلی میں اپنا کتب خانہ چلاتے تھے۔ یہ نہ صرف دہلی بلکہ ہندوستان بھر کی مشہور شخصیت تھے۔ اور شاعر، ادیب، عالم، غیر عالم، پاکستانی اور ہندوستانی دونوں ذہنوں اور نظریوں کے اصحاب فکر کا مرکز ان کا کتب خانہ تھا۔

حضرت مفتی صاحب کے متعلق شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے تعزیتی مضمون کا مختصر حصہ ملاحظہ فرمایئے اور حضرت مفتی صاحب کی شخصیت کا اندازہ کیجیے۔

"(مفتی کفایت اللہ صاحب کو) اخلاق فاضلہ میں خداوند عالم نے کمال عطا فرمایا تھا۔ دریائے سیاست کے بہترین شناور تھے۔ تدبر و تفکر کے انمول موتیوں سے آپ کا دامن بھرا رہتا تھا۔ ہر معاملہ کی گہرائی اور آخری تہہ تک پہنچنا آپ کی ذکاوت کا ہمیشہ شاہکار رہا ہے۔"

بلند پایہ مفتی، وسیع النظر عالم، دُور اندیش، زیرک، دقیقہ رس، سیاستداں، بہترین مدرس اور استاد۔ شہرت طلبی اور نام و نمود کی خواہش کی ہوا بھی آپ کے پاس سے ہو کر نہیں گذری تھی۔ فروتنی اور تواضع میں آپ بالکل اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کے قدم بقدم چمکتے ہوئے ستارے تھے۔

(نوٹ) علاوہ ان باتوں کے جن کا تعلق میری ذات سے ہے اور میں نے اپنا حوالہ دیا ہے باقی مضمون کے ماخذ "الجمعیۃ کا مفتی اعظم نمبر" مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصفؔ کے مختلف مضمون، تاریخ دارالعلوم مصنفہ سیّد محبوب رضوی صاحب شائع شدہ از کراچی ماہنامہ "ندائے شاہی" کے تاریخ شاہی نمبر میں شائع شدہ مولانا معز الدین احمد قاسمی کا مضمون ہیں۔ ☐☐

مولانا مفتی کفایت اللہؒ

ایک صاحبِ عزیمت عالم

تحریر ——— مولانا محمد ابراہیم فکری (مجاہد آزادی)

خلافت تحریک سے آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ جمعیۃ علماء ہند کے بیس سال تک صدر رہے۔ ۱۹۲۲ء میں ان کو چھ ماہ کی قید ہوئی۔

مفتی صاحب کے گھر کی تلاشی

۱۳ر دسمبر ۱۹۲۲ء تقریباً چھ بجے مفتی صاحب کے مکان پر پولیس پہنچی۔ ڈپٹی اکرام الحق، پیرزادہ نذیر الحق انسپکٹر سی۔ آئی ڈی عبدالعزی خاں سب انسپکٹر تھانہ، مسٹر بلونت رائے مجسٹریٹ درجہ اوّل اور ان کے ساتھ ۲۵-۳۰ سپاہی، ڈپٹی اکرام الحق نے مفتی صاحب کو تلاشی کا وارنٹ دکھایا اور کہا وارنٹ انگریزی میں ہے اور کسی مشتبہ خط و کتابت اور اسلحہ کی تلاشی کے لیے جاری کیا گیا۔ مفتی صاحب نے فرمایا آپ اپنا کام کیجیے۔ گھر میں پردہ کرالیا اور ان کو اندر بلالیا۔ مکان کی کنڈی بند کر دی اور پھر کئی سپاہی تلاشی میں لگ گئے۔ ایک ایک پرزہ اور مکان کا ایک ایک کونہ ایسی کوشش سے دیکھا کہ باید و شاید۔ تلاشی تین گھنٹے جاری رہی۔ ایک ایندھن کے ڈھیر کو کرید کر پھینک دیا اور مفتی صاحب کے مکان سے جمعیت کا متفقہ فتویٰ کا مسودہ لے گئے۔ (اخبار مسلم ستمبر ۱۹۲۲ء)

جمعیت کے دستی پریس میں چھپی ہوئی کاپیاں بھی پولیس ایکٹ کے تحت اپنے ساتھ لے گئے۔

'تعلیم الاسلام' ان کی کتاب جو چار حصوں پر مشتمل ہے، بے حد و نہایت مقبول ہے۔ اب اس کا ہندی اور انگریزی میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔ مدرسہ امینیہ کشمیری گیٹ، دہلی کے شیخ الحدیث و صدر مدرس رہے۔

میں جب ۱۹۴۲ء میں ملتان جیل سے رہا ہوا تو ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑے تپاک سے ملے اور مجھے ایک روپیہ عنایت کیا جس کو میں نے تبرک کے طور پر قبول کیا۔

دہلی میں آپ کا انتقال ہوا۔ مہرولی میں ظفر محل میں دروازے کے پاس دفن ہوئے۔ مزار پر کتبہ لگا ہوا ہے۔

فقہ و فتاویٰ میں بھی حضرت مفتی اعظمؒ کا اعلیٰ مقام تھا۔ عزیمت سے بھرپور ان کے فتاویٰ آج بھی فقہ کی کتابوں خاص طور پر ان کے فتاویٰ کے مجموعہ کفایت المفتی میں عوام کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ انگریزی سامراج کے دور میں ان کے خلاف فتویٰ دینا کتنا مشکل تھا۔ اس کا ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے۔ مگر مفتی صاحب مرحوم نے رضاکار بننے اور مجالس منعقد کرنے کے بارے میں جواز کا جو فتویٰ صادر فرمایا تھا وہ آج کے مسلمانوں کے لیے مینارۂ نور ثابت ہو سکتا ہے۔ فتویٰ حضرت مولانا عبدالحلیم صدیقیؒ کا تحریر کردہ ہے جس کی حضرت مفتی صاحبؒ تصویب فرمائی ہے۔ فتاویٰ حسب ذیل ہے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں کہ قومی اور مذہبی قسم کے معاملات کے لیے رضاکار (والنٹیئر) بننا اور مذہبی احکام کی تبلیغ یا قومی اور وطنی مقاصد کی اشاعت کے لیے جلسے کرنا، اور اس سلسلے میں جیل جانا یا اور تکلیفیں اُٹھانا شرعاً جائز اور ثواب کا کام ہے یا ناجائز اور موجب مواخذہ ہے، نیز اس معاملے میں کانگریس کے احکام کی تعمیل کرنا کیسا ہے؟

جواب: دین و مذہب اور بندگانِ خدا کی خدمت کے لیے رضاکار بننا اور مذہب اور قوم کی خدمت کے لیے شرعاً جائز اور اخلاقاً بہتر اور جائز بلکہ بہترین کام ہے۔ اور اسی طرح قومی اور مذہبی مقاصد کے لیے اور اس کی تبلیغ کے لیے مجالس منعقد کرنا نہ صرف جائز بلکہ

مستحسن ہے۔اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنا شرعاً جائز ہے اور اس میں تکلیف اُٹھانا اور صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کرنا موجب ثواب ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے باوجود کفار کی مزاحمت کے اور ایذار سانی کے اپنے دروازہ کے سامنے نماز پڑھنا نہ چھوڑا۔ حالانکہ مکان کے اندر نماز پڑھ سکتے تھے اور ایذائے کفار سے بچ سکتے تھے۔

رضاکار بنے اور انعقاد مجالس سے روکنے والے احکام استبداد اور جبر سے پیدا ہوتے ہیں حقانیت اور انصاف سے انھیں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ایسے جابرانہ احکام کا نفاذ ہندوستانیوں کے لیے ایک سخت ترین آزمائش وامتحان کا وقت ہے اور ایک فتنہ ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ افضل الجہاد کلمہ عدل عند سلطان جائر۔

حقانیت کے ساتھ احکام کی خلاف ورزی کرنا ایک اخلاقی جنگ ہے جو انسانی حقوق کو کچلنے کی طاقت کے خلاف جاری کی گئی ہے۔ مرکزی خلافت کمیٹی اور کانگریس دونوں نے قانون شکنی کا فیصلہ کرلیا ہے۔لیکن بہرصورت جو شخص اپنی طبیعت پر قابو نہ رکھتا ہو اس کو خود چل کر پھر کمزوری کا اظہار کرکے تحریک کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ جو شخص گرفتار کیا جائے اس کو پورے استقلال اور استقامت کے ساتھ مصائب کو برداشت کرنا چاہیے۔ صرف خدا کے رحم و کرم پر بھروسا رکھنا چاہیے اور صرف اسی سے ڈرنا چاہیے۔ یاد رکھو کہ ایمان واستقامت ہی نزول رحمت کے اصلی اسباب ہیں۔

عبدالحلیم صدیقی عفی عنہ
(ناظم جمعیۃ علماء ہند)

الجواب صحیح

محمد کفایت اللہ غفرلہ (صدر جمعیۃ علماء ہند)
(مرقومہ یکم فروری ۱۹۲۲ء)

فتاویٰ نویسی میں کمال کے ساتھ ساتھ قومی وملی معاملات میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے۔ حجاز سے شریف مکہ کا اقتدار ختم ہو کر سلطان ابن سعود کو سرزمین حجاز کی ولایت نصیب ہو چکی تھی۔ چونکہ سلطان ابن سعود مشہور نجدی عالم شیخ عبدالوہاب نجدی کے مسلک پر عامل تھے اس لیے انھوں نے انتہائی شد ومد کے ساتھ اپنے مسلک کی اشاعت شروع کردی اور زیارت قبر وغیرہ پر پابندی عائد کردینے کے علاوہ آثار ومقابر صحابہ کو منہدم کرانا شروع کردیا۔

اس کے بعد یہ خبر عوام تک پہنچی کہ اب یہ حکومت گنبد خضرا کو بھی خدانخواستہ منہدم کرنے جارہی ہے اس خبر سے پوری دنیا میں ایک کہرام مچ گیا۔ ہر طرف سے وفود اور عوام نے زبردست احتجاج کیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک تار صدر جمعیۃ علماء ہند مفتی کفایت اللہ صاحب کی طرف سے بھی سلطان کے نام بھیجا گیا جس کے جواب میں سلطان ابن سعود نے لکھا۔

”آپ کے پیغام برقی مورخہ ۸/دسمبر متعلقہ حرم نبوی گنبد خضرا اور روضۂ پاک کے سلسلہ میں ہم جواب دیتے ہیں کہ خدانخواستہ اس قسم کا نہ کوئی ارادہ تھا نہ کوئی اظہار کیا گیا ہے۔ اور نہ آئندہ کیا جائے گا اور کسی قسم کی تبدیلی کا بھی خیال نہیں ہے۔ اور نہ کوئی شخص گزند پہنچانے کے ارادے سے اس کے پاس بھی جاسکتا ہے۔ جب تک ہماری جان میں جان ہے اپنی جان اور مال سے ہم اس کی حفاظت کریں گے۔ (بحوالہ الجمعیۃ ۱۸/دسمبر ۲۳ء)

انگریزی سامراج کے فتنہ سامان لوگ حضرت مفتی صاحب کے اوپر الزام لگایا کرتے تھے کہ وہ نظام حیدرآباد کے نمک خوار ہیں حالانکہ جن لوگوں اور علماء کرام کو نظام مرحوم وظیفہ دیا کرتے تھے۔ وہ ان کی علمی خدمات کے سلسلہ میں ہوا کرتا تھا اور غیر مشروط ہوتا تھا لیکن حضرت مفتی صاحبؒ نے اسے بھی قبول نہیں کیا جس کا ثبوت خود ریاست حیدرآباد کے انگریز ریذیڈنٹ مسٹر کائس کے اس خط سے مل جاتا ہے جو اس نے دہلی کے چیف کمشنر مسٹر تھومسن کے اس خط کے جواب میں لکھا ہے جس میں اس نے حیدرآباد ریاست کو لکھا تھا کہ مفتی کفایت اللہ کا وظیفہ بند کردیا جائے اس لیے کہ وہ حکومت کے خلاف تحریک چلارہے ہیں جس کے جرم میں انھیں چھ ماہ کی سزا بھی ہو چکی ہے۔ مسٹر تھومسن کے اس خط کے جواب میں مسٹر کائس نے لکھا تھا کہ مفتی کفایت اللہ کو حیدرآباد سرکار سے کوئی وظیفہ نہیں ملتا تھا۔ مولانا احمد سعید کو ملتا تھا جسے بند کردیا گیا۔

مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحبؒ اور

تحریک اتحاد و اصلاح مدارس

مولانا محمد افتخار حسین قاسمی استاد حدیث مدرسہ امینیہ

حضرت مفتی صاحب جب دہلی کے مدرسہ امینیہ میں تشریف لائے، تو آپ نے رفتہ رفتہ اس درسگاہ کے تعلیمی نظام میں مفید اصلاحات نافذ فرمائیں۔ چنانچہ آپ نے مدرسہ امینیہ کے آٹھویں سالانہ جلسہ منعقدہ ۷ رذی الحجہ ۱۳۲۲ھ بروز یکشنبہ مطابق ۱۲ر فروری ۱۹۰۴ء میں مدارس عربیہ کی اصلاح واتحاد کے لیے ایک مقالہ پڑھا جو روئداد ۲۱-۱۳۲۲ھ کے صفحہ ۳۵ سے ۴۱ پر مشتمل ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے اس طرح خیالات کا اظہار فرمایا:

"اس وقت بالخصوص چند امور خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں اور ان پر غور فرمانے اور ان کے مناسب مشورہ دینے کی اہل الرائے حضرات سے درخواست کرتا ہوں، وہ ایسے امور ہیں جن کے لیے مجموعی بلکہ ان پر اس نونہال علم کی شادابی، اور تروتازگی منحصر ہے۔ ان کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ کمہلایا جارہا ہے۔ وہ ایسی باتیں ہیں جن پر اس سرچشمہ کی صفائی و شفافی کا دارومدار ہے اور ان کے نہ پائے جانے سے یہ گدلا ہو جاتا ہے۔"

(روئداد مدرسہ امینیہ ۲۲-۱۳۲۱ھ)

اس کے بعد حضرت مفتی صاحب نے چند تجاویز پیش کیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ تمام مدارس اسلامیہ کا مقصود ایک ہے، یعنی چمن علم دین کی آبیاری، اور اس باغ کی یہ سب کیاریاں ہیں، لہٰذا تمام مدارس کو انتظامی حیثیت سے بھی ایک نظام میں منسلک ہونا چاہیے اور ایک کو دوسرے کا مخالف نہ ہونا چاہیے۔

۲۔ مدارس اسلامیہ کے ترقی نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ ان کے کارکن یعنی اہل شوریٰ اور منتظمین وہ لوگ ہیں جن کو علم دین کا ذوق اور مناسبت نہیں ہے، بلکہ اکثر نئی وضع کے پابند اور طرز کے شیدائی اور علم دین سے محض بہرہ ہیں۔ اگر اہل شوریٰ اہل علم اور دیانتدار ہیں تو ان کے مہتمموں کی نیت میں کھوٹ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل شوریٰ میں اہل علم بھی داخل ہوں اور تمام امور انتظامی و تعلیمی ان کے مشورے سے فیصل ہوں اور مہتمموں کو خدا کا خوف اور اپنے فرائض کا احساس ہونا چاہیے اور اس مال میں سے جو خدا نے ان کو بطور امانت سونپا ہے بقدر ضرورت اپنے اوپر خرچ کرنا چاہیے۔

۳۔ مدرسہ کا اہتمام کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے پوری فرصت، توجہ اور لیاقت شرط ہے۔ ضروری ہے کہ مہتمم مدبر، تجربہ کار، امورِ انتظامی سے واقف ہو۔ اور اس کے ذمہ کوئی اور کام بطور فرض منصبی کے نہ ہو۔ ایک شخص پوری توجہ سے دو کام نہیں کر سکتا۔

۴۔ مہتمم اور اہل شوری مدرسے کے امور میں خدا کی طرف سے وکیل ہیں۔ لہٰذا مؤکل کی رضا مدنظر رہنی چاہیے اور مدرسہ کے انتظام اور ضروریات پر کامل توجہ دینی چاہیے۔

۵۔ مہتممین اور مدرسین کو چاہیے کہ ان خدا کے مہمانوں (طلبہ کے ساتھ) نہایت نرمی اور خیر خواہی کا برتاؤ کریں۔ ان کی مشکلات میں ان کی اعانت اور مدد کو باعث فخر سمجھیں۔

۶۔ طلبہ کے داخلہ کے وقت احتیاط سے کام لیا جائے اور پچھلے مدرسہ سے نیک چلنی کی سند لے کر داخل کیا جائے۔

۷۔ اہل خیر حضرات کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جو خدا کے ان مہمانوں کی دعوت کرتے ہیں اور ان اعلیٰ تعظیم کے حقدار

لوگوں کی انتہائی توہین اور تضیع اوقات کا سبب بنتے ہیں، یہ طے کرلیا جائے کہ طلبہ کو مدرسہ سے باہر کسی دعوت میں ہرگز نہ بھیجا جائے۔ اگر دعوت کرنا ضروری ہو تو ایک دن قبل مہتمم کو تعین وقت اور تعداد کے ساتھ اطلاع دی جائے اور مدرسہ میں پابندی وقت کے ساتھ کھانا لاکر اپنے آدمیوں کے انتظام میں کھلایا جائے۔

حضرت مفتی صاحب نے اصلاحی تجاویز کے ساتھ اتحاد مدارس پر بھی کافی زور دیا اور اس پر کافی عمدہ تقریر کی۔

آپ کی ان کوششوں کا نتیجہ ہوا کہ ہندوپاک کے سب سے بڑے دارالعلوم، دارالعلوم دیوبند نے سب سے پہلے اس آواز پر لبیک کہا اور دارالعلوم کے منتظمین نے اس بات پر رضامندی کا اظہار کیا کہ وہ دوسرے مدارس کے طلبہ کو اس وقت تک داخل نہیں کریں گے جب تک کہ وہ اپنے سابقہ مدارس کی طرف سے نیک چلنی کی سند نہ پیش کریں۔

روئداد مدرسہ امینیہ ۱۳۲۷ھ میں اس کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے:

اتحادِ مدارس و کارکنانِ مدرسۂ امینیہ کو مدت سے یہ خیال تھا کہ عربی پڑھنے والے طلبہ کے داخلہ کا انتظام نہایت باضابطہ اور قواعد پر مبنی ہو۔ ان کی یہ مطلق العنانی کہ جہاں چاہا چل دیا اور جو چاہا پڑھا، تعلیم کو سخت مضرت پہنچا رہی ہے۔ اہل مدرسہ اس کی کوشش ۱۳۲۲ھ سے کررہے ہیں۔ مدرسۂ امینیہ کی سالانہ روئداد متعلقہ ۱۳۲۲ھ کے صفحہ ۳۵ سے صفحہ ۴۰ تک یہ مضمون بہت زور کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اور پھر ۱۳۲۷ھ کے جلسہ کی مختصر مطبوعہ رپورٹ کے صفحہ ۶ پر بھی اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

مدارس اسلامیہ کے مہتممین کی خدمات میں عرض کیا گیا کہ آپس میں اتفاق کرکے اس کا انتظام کریں۔ بارے الحمد للہ کہ حضرات کارکنان مدرسہ دیوبند نے اس سے کلی اتفاق کرتے ہوئے پختہ وعدہ فرمالیا کہ مدرسہ دیوبند اور دیگر مدارس جو اس کے ساتھ ہیں ان میں کوئی ایسا طالب علم جو کسی دوسرے مدرسہ سے آیا ہے اس وقت تک داخل نہ کیا جائے گا جب تک کہ وہ اپنی نیک چلنی کی سند پیش نہ کرے۔ اگرچہ اس کا اجراء ابھی پورے طور پر نہیں ہوا مگر اس میں شک نہیں کہ اب وہ وقت بہت قریب ہے کہ اس مبارک تجویز کی بے شمار برکتیں ہمیں اور مدارس اسلامیہ اور ان کے طلبہ کے شامل حال ہوں۔

اتحاد مدارس کی تحریک کافی حد تک کامیاب رہی کہ دارالعلوم کے منتظمین اس بات پر رضامند ہوگئے کہ مدرسہ امینیہ دہلی کے فارغ التحصیل طلبہ کی اپنے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد میں دستار بندی کریں گے۔

چنانچہ دارالعلوم دیوبند کا ایک سالانہ اجتماع ۶-۷-۸/ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۷-۱۸-۱۹/ اپریل ۱۹۱۰ء بمقام دیوبند منعقد ہوا جس میں ہر طبقہ کے اہل اسلام نے شریک ہوکر مدرسہ دیوبند کی مقبولیت عامہ کا تمام ہندوستان میں سکہ بٹھادیا جس کے شرکاء کی واقعی تعداد تو خدا جانتا ہے مگر سرکاری رپورٹ سے بیس بائیس ہزار اور عام مبصرین کی رائے میں تیس ہزار تھی۔ جس میں تقریباً تین سو علماء کو دستارِ فضیلت عطا کی گئی تھی۔

اس مبارک اجتماع میں مدرسہ امینیہ کے فارغ التحصیل طلباء کی دستار بندی کی گئی جس کا اعلان بذریعہ اشتہار و خطوط کردیا گیا تھا۔ مدرسہ ہذا کے دستار بند علماء کو جو دستار فضیلت دی گئی اس کے کنارہ پر یہ عبارت سنہری حرفوں میں طبع کردی گئی تھی:

عمامة الفضيلة من المدرسة الاسلاميه الديوبند
لمتعلم مدرسة الأمينية الدهلوية

اور ایک...... مطبوعہ سند جس پر مدرسہ دیوبند و مدرسہ امینیہ کی مہریں ثبت ہیں، دستار کے ساتھ عطا کی گئی۔ دارالعلوم دیوبند کے اس عظیم الشان اجتماع کے پوسٹر کی عبارت مندرجہ ذیل تھی:

"مدرسہ امینیہ دہلی کے فارغ التحصیل طلبہ کی مدرسہ اسلامیہ دیوبند کے سالانہ جلسہ میں دستار بندی
مدارس اسلامیہ کے اتحاد کا پہلا عملی نمونہ۔"

بالخصوص مذکورہ عنوان بالا دونوں مدرسوں کے اتفاق کا دلکش

نقشہ عنقریب ہمدردانِ قوم و مذہب کے پیش نظر ہونے والا ہے۔
جن لوگوں کے پاک دل عرصے سے اتحاد و اتفاق کے مشتاق اور آنکھیں منظر اتحاد کی منتظر تھیں، انھیں اراکین مدرسہ دیوبند و مدرسۂ امینیہ نہایت مسرت سے یہ مژدہ سناتے ہیں کہ مدرسہ دیوبند کے اس عظیم الشان جلسے میں جو ۶-۷-۸/ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۷-۱۸-۱۹/اپریل ۱۹۱۰ء کو ہونے والا ہے، آپ کی آنکھیں ٹھنڈی اور دل مسرور ہوجائیں گے۔ یہ جلسہ جس طرح اور خصوصیات کی وجہ سے ممتاز ہوگا اسی طرح اتحاد و اتفاق کے مبارک سلسلہ کی ابتدا کرنے کے لحاظ سے بھی بے مثال و بے نظیر ہوگا۔ مدرسہ امینیہ دہلی جو خوبیٔ تعلیم و حسنِ انتظام کی جہت سے مدارس دہلی میں ایک ممتاز مدرسہ ہے، اس کے فارغ التحصیل طلبہ میں سے منتخب علماء کی دستاربندی اس جلسہ میں ہوگی۔ اراکین مدرسہ دیوبند تمام اہلِ اسلام اور بالخصوص ان حضرات کو جو خاص مدرسہ امینیہ سے دلچسپی رکھتے ہیں مبارکباد دیتے ہوئے اس مسرت بخش جلسے میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ وہ قدوم میمنت لزوم سے جلسے کی عزت بخشیں گے۔

المکلف

محمد احمد غفرلہ (ابن حضرت مولانا محمد قاسم)
مہتمم مدرسہ اسلامیہ دیوبند ضلع سہارنپور
ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ

مہر: ۱۲۹۷ عربی دیوبند مدرسہ اسلامی

مدرسہ امینیہ دہلی کے اُن فارغ التحصیل طلبہ کے نام جنھیں مدرسہ عالیہ دیوبند کے عظیم الشان جلسۂ دستاربندی میں دستار فضیلت عطا کی گئی:

۱۔	مولوی حافظ خیر الدین صاحب	سرسہ ضلع، حصار
۲۔	مولوی حافظ سیّد محمد حسین صاحب	سیالکوٹ
۳۔	مولوی حافظ سیّد محمد معصوم صاحب	شاہ پور
۴۔	مولوی حافظ سیّد مہدی حسن صاحب	شاہجہانپور کلاں
۵۔	مولوی سیّد محمد اسحاق صاحب	مونگیر
۶۔	مولوی حافظ محمد شفیع صاحب	روہتک
۷۔	مولوی علی اصغر صاحب	جالندھر
۸۔	مولوی سراج الحق صاحب	میر یسال
۹۔	مولوی محمد یعقوب صاحب	پرتاپ گڈھ
۱۰۔	مولوی محمد علی صاحب	میمن سنگھ
۱۱۔	مولوی حافظ محمد عبدالتواب صاحب	رائے بریلی

حوالہ جات:

(۱) مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ (۲) مفتی اعظم نمبر 'الجمعیۃ' دہلی (۳) بیس بڑے مسلمان (۴) مفتی اعظم کی یاد۔

قطعۂ تاریخ وفات

نتیجہ فکر: جناب ابوالوفا مولانا جلال الدین صاحب سابق مجسٹریٹ ٹونک،
مرسلہ منظور الحسن صاحب برکاتی، ٹونک

فکرِ تاریخِ وفاتِ مفتیِ اعظم میں جب
ہر طرف برپا تھا شور و غل دیارِ ہند میں

اے زہے عزّ و شرف یہ غیب سے آئی صدا
شمعِ افتا ہوگئی ہے گل دیارِ ہند میں

۲ ۷ ۳ ۱ ھ

CITY HOTEL
CITY HOTEL
CAPSTAN
PEPSI
CITY HOTEL
M.D.= SHAHID AKHLAQ
AKHLAQ COMPLEX, GHANTAGHAR
MEERUT-2
City Hotel Deluxe
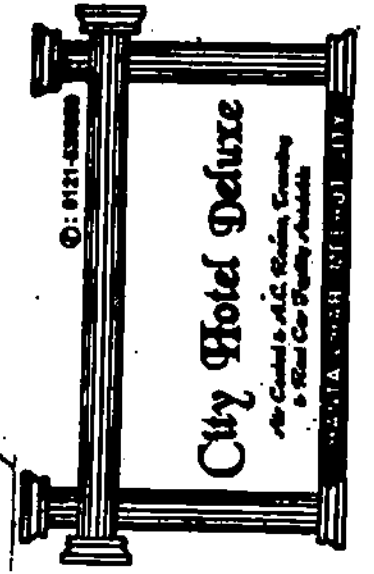
باطل تحریکوں کے خلاف ننگی تلوار تھے

حضرت مفتی اعظم

محمد سالم جامعی

انگریزی سامراج نے ہندوستان اور اس کے مکینوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لینے کے بعد جب یہ فیصلہ کیا کہ اب ان ہندوستانیوں کو جو اپنے اپنے مذہب پر عمل کر کے ابھی بھی ہندو اور مسلمان سکھ اور پارسی کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں انھیں مذہب کے لحاظ سے عیسائیت کی طرف مائل کیا جائے اور چونکہ انگریز اور عیسائیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ مسلمان تھے اس لیے اس نے مسلمانوں کو ان کے دین سے بیگانہ کر دینے کے لیے مثبت اور منفی ہر دو پہلو اختیار کیے۔ ایک طرف عیسائی مشنریز کے غول کے غول ملک کے گلی کوچوں میں اُتار دیئے گئے جو انتہائی شاطرانہ انداز میں اسلام اور داعی اسلام کو نشانہ بنا کر عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کا کام کر رہے تھے اور دوسری طرف ہندو اور مسلمانوں میں صدیوں سے قائم اتفاق و اتحاد کو ختم کرنے کے لیے انھوں نے نرم چارہ پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں اور ہندوؤں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ ان کا مذہب خطرہ میں ہے اور مسلمانوں نے تمھارے آباواجداد کو زور زبردستی سے مسلمان بنایا تھا۔ پھر کیا تھا انگریز کا یہ نرم چارہ حرکت میں آگیا اور اس نے شدھی کی تحریک شروع کر دی اور چونکہ اسے انگریزی سامراج کی پوری پوری سرپرستی حاصل تھی اس لیے انھوں نے ناخواندہ اور تاریخی حقائق سے ناواقف مسلمانوں کو یہ کہہ کر گمراہ کرنا شروع کر دیا کہ ان کے باپ دادا پہلے ہندو ہی تھے اور مسلمان بادشاہوں نے انھیں ڈرا دھمکا کر مسلمان بنایا تھا۔ کچھ لوگوں نے اس پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر اسلام چھوڑ کر ہندو دھرم قبول بھی کر لیا تھا لیکن یہ تحریک اس پیانہ پر کامیاب نہ ہو سکی جس کی انگریزی سامراج کو امید تھی۔ اس کے بعد اس نے خود مسلمانوں میں افتراق و انتشار کا منصوبہ بنایا جس کے لیے ایک طرف اس نے خانہ ساز نبوت کا قادیان میں دروازہ کھولا اور دوسری طرف حرب عقائد کا سلسلہ شروع کر کے دیوبندی مکتب فکر جو مسلمانوں کا اجتماعی مکتب فکر ہے، کے مقابلہ میں بریلوی مکتب فکر کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ نے اسلام بالخصوص دیوبندی مکتبۂ فکر کے اپنے دَور کے عظیم ترجمان تھے، میدان میں آئے اور ہر اس سطح پر ان فرقِ باطلہ کا رد کیا جہاں اس کی ضرورت سمجھی گئی۔

شدھی تحریک

تحریک خلافت کے خاتمہ کے بعد ۱۹۲۲ء میں جب سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک شروع کی اور ہزاروں مسلمانوں کو مرتد کر لیا تو جمعیۃ علماء ہند نے اس کی روک تھام کے لیے کوشش شروع کی۔ تبلیغی وفود بھیجے گئے اور جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام جلسے جلوس منعقد کر کے اس کے خلاف رائے عامہ منظم کی گئی۔

سب سے پہلا تبلیغی وفد جو حضرت مفتی اعظمؒ نے مرتب فرما کر اپنی دعاؤں کے ساتھ روانہ فرمایا تھا اس کے صدر مولانا محمد عرفان مرحوم (مدیر اوّل اخبار الجمعیۃ) اور نائب صدر مولانا وحید حسین ٹونکی (مدرس مدرسہ امینیہ) تھے۔

حضرت مفتی صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود بھی ایک وفد لے کر بمقام اجمیر ہ پہنچے اور وہاں کے مسلمانوں کو مرتد ہونے سے بچالیا۔

شدھی تحریک کی وجہ سے ایک طرف سے تو ملک کے اندر فسادات اور بلوے جاری تھے اور دوسری طرف مہاتما گاندھی کا اس

سلسلہ میں اتحاد کے لیے ۲۱ دن کا برت بھی جاری کیا تھا۔

۲۶ر ستمبر ۱۹۲۴ء کو سنگم تھیٹر مقابل ایڈورڈ پارک دہلی میں پنڈت مدن موہن مالویہ کی صدارت میں ایک عظیم الشان اتحاد کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں مفتی اعظم کے علاوہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالمحاسن سجاد، حکیم اجمل خان، مولانا احمد سعید، مفتی محمد صادق قادیانی، اور سوامی شردھانند، پنڈت رام چندر اور ملک کے دیگر زعماء موجود تھے۔

صدر اجلاس نے اپنی تقریر میں اشتراک مذاہب اور اتحاد عمل پر تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے مذہب سے سزائے قتل مرتد اور تبلیغ کو نکال دیں تاکہ امن واتحاد قائم ہوسکے۔

دوسرے لیڈروں نے بھی کہا کہ ہندو مسلمانوں میں صلح کس طرح ہوسکتی جبکہ مذہب اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ اس کانفرنس میں فریق مخالف بڑی تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ ان کے بڑے بڑے مشہور مناظر اور پنڈت موجود تھے۔ اس کے ساتھ ہی جدید تعلیم یافتہ مسلم لیڈران بھی ان مسائل میں برادران وطن کے ساتھ تھے۔ مفتی محمد صادق قادیانی نے کہا کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہیں ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی کی بھی یہ ہی رائے تھی جس کے بعد چاروں طرف سے اسلام پر اعتراضات کی بوچھار شروع ہوگئی۔ اس طوفان میں روشنی کی ایک کرن حضرت مفتی اعظمؒ کی ذات گرامی تھی جو اسلام اور شعائر اسلام کے دفاع کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی اور پھر جس کی تائید کے لیے سب کو مجبور ہونا پڑا۔

حضرت مفتی اعظمؒ نے فرمایا کہ:

"اسلام کی بنیاد تبلیغ پر ہے۔ تبلیغ اس کے خمیر میں داخل ہے۔ اس کو تبلیغ کے حق سے کوئی نہیں روک سکتا اور بے شک اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اور یہ اسلام کا کھلا ہوا واضح اصول ہے ہمیں اس کے ظاہر کرنے میں کوئی تامل نہیں، تاہم اس سزا کو جاری رکھنے کا حق صرف سلطان اسلام کو ہے۔ چنانچہ موجودہ حالات میں اسلامی حدود کے جاری ہونے کا کوئی سوال نہیں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا کہ مولانا یہ تو فرمائیے کہ سوراج کے بعد کیا ہوگا۔ آپ نے جواب دیا کہ "سوراج کے بعد جمہوری مجلس مقننہ ہوگی، کیا وہ اسلامی احکام نافذ کرے گی؟ اگر کرے گی تو تمام احکام جاری ہوں گے۔ مگر ہندوستان کے مستقبل کے مشترک پلیٹ فارم پر اسلامی حکومت کا تصور پیش نظر نہیں ہے۔"

اس سلسلہ میں اکابر علماء کے درمیان خط وکتابت بھی ہوئی۔ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ایک خط حضرت مفتی صاحب کو لکھا۔ حضرت مفتی صاحب کا جواب ایک مفصل روئداد ہے جسے ہم یہاں ذکر کررہے ہیں:

خط از مولانا کفایت اللہ
بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی

دہلی، ۱۱ر ربیع الاول ۱۳۴۳ھ

مولانا المحترم، دامت فیوضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

مجھے سخت ندامت اور افسوس ہے کہ میں مفصل طور پر جناب کے تاروں کا جواب اس کے قبل نہ دے سکا، ایک اجمالی تار ارسال خدمت اقدس کردیا تھا۔ جناب کے تاروں سے جناب والا کا تیقظ اور اسلامی غیرت اس پایہ کا ثابت ہوگیا کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

مولانا! واقعہ یہ ہے کہ پہلے دن کے اجلاس موتمر میں خاکسار اگرچہ شریک تھا، مگر پہلا ریزولیوشن انگریزی میں پڑھا گیا تھا۔ اور اس کا اردو ترجمہ یا حاصل مطلب بیان کیا گیا، مگر میں بحلف عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس فقرے کا جو سزائے ارتداد کے متعلق ہے۔ اس وقت بالکل علم اور احساس نہ ہوا۔ واللہ اعلم کہ اردو میں وہ بیان سے رہ گیا یا میں نے نہیں سنا۔ تجویز پاس ہوگئی۔

دوسرے روز جناب کا تار ملا۔ اس سے مجھے فوری خیال ہوا اور میں نے پہلی تجویز کو تلاش کرکے دیکھا تو اس میں وہ الفاظ موجود تھے، سخت افسوس ہوا۔ اگرچہ معاملہ سب کا سب ہندوستان کے متعلق تھا تاہم الفاظ میں عموم ضرور تھا۔ میں سخت کشمکش میں پڑ گیا، بالآخر سوائے اس کے کوئی تدبیر نہ کرسکا کہ ریزولیوشن نمبر۴ کی تمہید

میں میں نے اپنی ترمیم بایں الفاظ پیش کی اور صدر صاحب کو معاملہ سمجھا کر اور ہاؤس اور اپنے بعض مہربانوں سے بحث مباحثہ کر کے یہ لفاظ بڑھوائے کہ ریزولیوشن نمبر ا میں ہندوستان کی مختلف قوموں کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے جو عام اصول قرار دیے گئے ہیں الخ۔ اب ریزولیوشن نمبر ۴ بتاتا ہے کہ ریزولیوشن نمبر ا کا عموم مطلق نہیں ہے بلکہ وہ ہندوستان کے ساتھ مقید ہے اور ہندوستان سے بھی برٹش انڈیا مراد ہے۔ ہندوستانی ریاستیں بھی اس میں داخل نہیں ہیں۔

نیز جبکہ بعض ہندو مقررین کی طرف سے یہ مضمون بیان کیا گیا کہ جب تک مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مرتد کو واجب القتل سمجھتے رہیں گے اور گویا قتل کرتے رہیں گے اس وقت تک ہندو مسلمانوں میں نباہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے بھرے مجمع میں اس کا جواب دیا کہ بیشک اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اور ارتداد اسلام کے نزدیک ہولناک گناہ اور بدترین جریمہ ہے اور یہ اسلام کا ایک کھلا ہوا روشن اصول ہے۔ مجھے اس کے ظاہر کرنے اور بیان کرنے میں کسی قسم کا تامل نہیں۔ مگر یہ کہنا کہ ہندوستان کے فسادات اس عقیدہ کے نتائج ہیں، اور مسلمان اس لیے ہندوؤں سے لڑتے ہیں کہ ان کو ارتداد یا اشاعت ارتداد کی سزا دیں غلط ہے۔ اس لیے کہ جیسا یہ اسلام کا مستحکم اصول ہے کہ ارتداد کی سزا قتل ہے اسی طرح یہ بھی اسلام کا اصول ہے کہ اس سزا کو جاری کرنے کا اختیار سلطان اسلام کو ہے۔ پس موجودہ حالت میں ہندوستان میں مرتد کی سزا قتل ہونے سے کوئی تعلق نہیں، جس طرح تمام حدود اور قصاص یہاں جاری نہیں اسی طرح مرتد کی سزا بھی جاری نہیں۔ اور نہ مسلمان اس پر قادر ہیں۔

اس پر مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے فرمایا کہ مولانا یہ تو فرمایئے کہ بعد سوراج کیا ہوگا؟ میں نے کہا کہ سوراج کے بعد واضعان قانون کے اختیارات کی جو نوعیت ہو اس کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ اگر سوراج کے بعد اسلامی قانون کی ترویج کا کوئی موقع ہوا تو یقیناً اس کے موافق احکام جاری ہوں گے۔ اور نہ ہوا تو حالت جس کی مقتضی ہوگی وہ ہوگا۔

تبلیغ کے متعلق میں نے صاف کہہ دیا کہ اسلام کی بنیاد تبلیغ پر ہے اور اس کے خمیر میں تبلیغ داخل ہے۔ وہ ایک کھلا ہوا تبلیغی مذہب ہے۔ اس کا دروازہ تمام دنیا کے لیے کھلا ہوا ہے اور اس کے دامن کے نیچے تمام بنی آدم آسکتے ہیں۔ اس کو حق تبلیغ سے کوئی نہیں روک سکتا اور ہندوستان کی موجودہ فضا میں مسلمانوں کو بھی یہ موقع نہیں کہ وہ کسی کو تبلیغ مذہب سے روک سکیں۔ ہاں جس طرح اسلام کی تبلیغ جبر و اکراہ، اطماع و خداع وغیرہ سے پاک ہے اس طرح دوسرے بھی ان ذمائم سے علاحدہ رہ کر صرف تبلیغ کر سکتے ہیں۔ یہ ذمائم درحقیقت تبلیغ مذہب کے لیے نہیں بلکہ اغراض نفسانی کے لیے کام میں لائے جاتے ہیں۔

ان مضامین کو میں نے بھرے مجمع میں پوری بلند آہنگی اور وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا۔ حتیٰ کہ سوامی شردھانند اور پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ بڑے بڑے ہندوؤں نے بھی کہہ دیا کہ اب ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔

ہاں پنڈت رام چندر جی نے کہا کہ کیوں صاحب اگر سلطان اسلام کے حکم کے بغیر کوئی مسلمان مرتد کو قتل کر دے تو اس کی کوئی سزا ہے؟ میں نے کہا ہاں...... وہ افتیات علی السلطان کے جریمہ کا مرتکب ہے۔ اور اس کی سزا بادشاہ کی رائے پر ہے۔

ہاں مفتی محمد صادق قادیانی نے کہا کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہیں ہے بلکہ اسلام ہر شخص کو ضمیر کی آزادی دیتا ہے تو اس پر مولانا حسین احمد صاحب نے نہایت بلند آہنگی سے اور میں نے بھی کہہ دیا کہ یہ آپ کی رائے ہے، اسلامی اصول نہیں ہے۔ اسلام میں بے شک مرتد کی سزا قتل ہے۔

مولانا: ایک ہفتے تک رات دن معاملات کو سلجھانے اور حقوق اسلامیہ و قومیہ کی حفاظت کی غرض سے کام کرنے میں جن دقتوں کا سامنا ہوا اس کا بیان مشکل ہے۔ جن حضرات نے دیکھا ہے وہی اندازہ کر سکتے ہیں۔ میں صرف اس قدر عرض کر سکتا ہوں کہ میری شرکت شخصی حیثیت سے تھی، اور اس کی تصریح بھی کر دی گئی تھی۔ اور

میں نے اپنی عقل فاتر و فہم قاصر اور دینی بساط کے موافق مذہبی اور قومی حقوق کی حفاظت میں کوئی فروگذاشت نہیں کی، اپنوں سے بھی اور غیروں سے بھی پوری نبرد آزمائی ہوئی۔

ہاؤس میں تقریراً و تحشاً ہر طرح حقوق کی حفاظت کی۔ مطمح نظر صرف یہ تھا کہ ہندوستان میں آپس کا نفاق اور جنگ و جدل بند ہو۔ اور ہر فریق اپنی جگہ اپنے فرائض مذہبی میں آزاد ہو اور دوسروں کے لیے رُکاوٹ نہ ڈالے۔ ہندوستان کی موجودہ حالت میں یہی ہماری پوزیشن ہے اور اسی کو پیش نظر رکھ کر تجاویز مرتب کی گئی ہیں۔ باوجود اس کے اگر مجھ سے کوئی غلطی یا فروگذاشت ہوئی ہو تو میں اس کے اعتراف کے لیے تیار ہوں۔ امید کہ جناب والا دعا سے فراموش نہ فرمائیں گے۔

خاکسار محمد کفایت اللہ غفرلہ

شدھی کی تحریک کے رد میں حضرت مفتی صاحب مختلف علاقوں کا دورہ فرماتے، اور دیہات والوں کی سطح اور ذہنیت کے مطابق تقریر فرماتے۔ اور خطاب کرتے۔ گاؤں والے آپ کی دلنشین اور سیدھی سادی گفتگو سے متاثر ہو کر دوبارہ اسلام میں داخل ہو جاتے۔

"اس فتنہ ارتداد کے زمانہ میں حضرت مفتی صاحب کو خبر ملی کہ فلاں گاؤں پورے کا پورا مرتد ہو گیا ہے لہٰذا حضرت مفتی صاحب نے مولانا احمد سعید کو حکم دیا کہ وہ فوراً گاؤں پہنچ کر صورت حال معلوم کریں۔ مسلمانوں کی تبلیغی جماعت کا وہاں پہنچنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ تاہم مولانا احمد سعید صاحب جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ آریہ سماج ان سے یہ کہتے تھے:

"تمہارے باپ دادا سب ہندو تھے، مسلمانوں نے آکر تم کو زبردستی مسلمان بنایا، اور تمہاری چوٹیاں کاٹیں۔"

یہ سن کر حضرت مفتی صاحب وہاں پہنچے اور جلسے کا اعلان کرا کر ان سب لوگوں کے سامنے آپ نے تقریر فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ:

"آج اس گاؤں میں آکر اور ایک بہادر قوم کے سپوتوں سے مل کر میں بے انتہا خوش ہوا ہوں۔ ملکانہ قوم دنیا کی چند بہادر قوموں میں سے ایک ممتاز قوم ہے۔ یہ قوم ہندوستان کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ تمہارے باپ دادا نے ہمیشہ ہندوستان کی حفاظت کی۔ دشمنوں سے کبھی ہار نہیں مانی۔ لوگ تمھیں آکر بہکاتے ہیں کہ تمہارے باپ دادا کو مسلمانوں نے مار مار کر زبردستی مسلمان بنایا تھا اور ان کی گردنیں پکڑ پکڑ کر چوٹیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ کیا واقعی تمہارے باپ دادا ایسے ہی کمزور اور ڈرپوک تھے؟

مجھے یقین نہیں آتا! دیکھو بھائی، یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور دھوکا دیتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تمہارے باپ دادوں سے کوئی آنکھ بھی نہیں ملا سکتا تھا۔ وہ اسلام کو ایک اچھا اور سچا دین سمجھ کر اپنی خوشی سے مسلمان ہوتے تھے۔ کیا تم اپنے سچے دین کو چھوڑ کر اپنے باپ دادوں کی روحوں کو صدمہ نہیں پہنچا رہے ہو۔"

آپ کی اس تقریر نے نفسیاتی طور پر ان کے دلوں پر اس قدر اثر کیا کہ اس گاؤں کے تمام لوگ ازسرِ نو مسلمان ہو گئے۔

شدھی تحریک کی طرح حضرت مفتی اعظمؒ نے دوسری باطل تحریکوں اور سرگرمیوں کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ عیسائی مشنریاں جو انگریز سامراج کی سرپرستی میں پورے ملک خاص کر تمام مسلمانوں کو عیسائی بنالینا چاہتی تھیں حضرت مفتی اعظمؒ نے ان کا بھی مقابلہ کیا اور انھیں نہ صرف پسپائی پر مجبور کر دیا بلکہ انھیں ملک سے فرار پر بھی مجبور ہونا پڑا۔

ردِّ عیسائیت

اس سلسلہ میں حضرت مفتی صاحب ایک طرف تو مدرسہ امین العلوم شاہجہانپور میں عربی فارسی کتب کا درس دیتے تھے اور دوسری طرف ضرورت پڑنے پر عیسائیوں سے مناظرہ بھی کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مناظرہ کا حال حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہی شیخ الادب والحدیث دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

"میں حضرت مفتی صاحب سے شاہجہانپور میں سکندرنامہ پڑھتا تھا کہ معلوم ہوا کہ سبزی منڈی (شاہجہانپور) میں عیسائیوں نے اسلام اور داعیٔ اسلام کے خلاف کچھ کچھ کہنا شروع کر دیا ہے۔ حضرت مفتی اعظمؒ اپنے ایک شاگرد کو ساتھ لے کر مجمع میں جا گھسے۔ اور ان بدزبانوں پر اعتراضات شروع کر دیئے۔ اوّل تو وہ سمجھے کہ

کوئی ناواقف بول رہا ہے، مگر اعتراضات کی اہمیت نے بتایا کہ معترض کوئی معمولی انسان نہیں ہے، تو مناظرہ سے انکار کر کے سب نے گانا شروع کر دیا۔ حضرت مفتی صاحب نے تقریباً دس قدم کے فاصلہ پر کھڑے ہو کر ان اعتراضات کا جواب دیا اور خود ان کے مسلمات ہی سے ان پر اعتراضات شروع کر دیئے۔

دو ہفتہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر ختم ہو گیا۔ اور وہ اس طرح ختم ہوا کہ عیسائیوں کی تقریر میں بجز میرے کہ میں یادداشت مرتب کرنے کی غرض سے جایا کرتا تھا کوئی ایک متنفس بھی ان کے پاس نہ جاتا تھا۔

اس کے چند سال کے بعد امریکن مشن کے ایک مشہور مبلغ پادری جوالا پرساد نے موسم گرما کے ایک رمضان میں جلسہ کا اعلان کر دیا۔ اور اشتہار میں شائع کیا کہ آریوں اور اہل اسلام کو بھی رفع شبہات کا موقع دیا جائے گا۔

یہ اجلاس مشن اسکول کے وسیع ہال میں ہوا۔ حضرت مفتی صاحب در حضرت مولانا عبدالکریم بغوی ظہر کے بعد وہاں پہنچے۔ پادری صاحب وقت معینہ سے دو گھنٹے بعد تشریف لائے۔ تقریر شروع کی، عشاء کا وقت آگیا۔ حضرت مفتی صاحب اور مولانا عبدالکریم کے ساتھ ہم نے ایک مسجد میں پانی کے ساتھ روزہ افطار کر لیا تھا مگر اب بھوک زیادہ لگی۔ قرآن شریف تراویح میں پڑھنا تھا۔ میں چلا آیا مگر یہ دونوں حضرات وہاں شب کے بارہ بجے تک رہے۔

یہ جلسہ کس طرح ختم ہوا مجھ کو معلوم نہ تھا لیکن صبح کو ہر کہہ و مہ کی زبان پر تھا کہ ان دونوں مولویوں نے اسلام کی لاج رکھ لی۔ خدا جانے یہ کہاں سے آگئے تھے۔ اس وقت تک ان دونوں سے عوام ناواقف تھے۔

میں بہادر گنج کے بازار میں پہنچا تو مسلمانوں کی ٹولیاں اسی کا تذکرہ کر رہی تھیں کہ ایک شخص نے کہا کہ، مگر ان میں جو ایک دُبلا پتلا سو کھا سا ادمی تھا، ہم نے دیکھا وہ شیر کی طرح غراتا تھا اور اس کی ہر بات پر پادری صاحب کو پسینہ آجاتا تھا۔"

قاری محمد طیب صاحب نے ذکر فرمایا کہ حافظ ذاکر علی صاحب آپ کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں جو شاہجہانپور کے بااثر اور مشہور وکلاء میں سے ہیں۔ انھوں نے بیان کیا کہ "شاہجہانپور میں کوئی عیسائی پادری آگیا، اس نے اسلام اور مسلمانوں کو چیلنج کیا۔ وہ اپنی لائن کا بڑا فاضل تھا۔ ہر ایک کو اس کے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ حضرت مفتی صاحب اس وقت ایک غیر معروف مدرس تھے۔ بحثوں اور مناظروں سے بالکل الگ تھلگ، ہمہ وقت درس و مطالعہ میں مصروف، کسی کو یہ تصور بھی نہ تھا کہ وہ پادری کے مقابل آجائیں گے، لیکن پادری کی تحدی سن کر حضرت مفتی صاحب میدان میں آگئے۔ اور اس طرح اس سے نبرد آزما ہوئے کہ بحث و مناظرہ میں اسے عاجز کر دیا حتی کہ خود انجیل کے حوالوں سے اس پر حجتیں قائم کر دیں۔" یہ انتہائی ذکاوت کی بات تھی کہ وقت کے وقت انجیل کا مطالعہ اس گہری نظر سے کیا کہ ایک آدھ شب ہی میں اس سے استخراج مسائل اور اتمام حجت پر قدرت حاصل کر لی، جس سے پادری کا منہ بند ہو گیا۔ اور وہ شکست کھا کر فرار ہوا۔

عیسائیت کے علاوہ حضرت مفتی صاحبؒ نے رد قادیانیت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

رد قادیانیت

حضرت مفتی صاحبؒ کی ذات گرامی فرق باطلہ و ضالہ کے لیے ننگی تلوار تھی، چنانچہ آپ کا قادیانیوں سے بھی کئی بار مناظرہ ہوا اور قادیانیوں کے رد میں آپ نے متعدد کارنامے انجام دیئے۔

چنانچہ شاہجہانپور میں ایک تاجر چونہ حاجی عبدالقدیر حافظ سیّد علی اور حافظ مختار احمد کے ذریعے "فتنۂ قادیانیت" نے ہاتھ پیر پھیلانے شروع کیے۔ مولوی محمد اکرام اللہ خاں مرحوم نے ان کے رد میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ حضرت مفتی صاحب نے اس کو ناکافی سمجھ کر خود ایک رسالہ "البرہان" جاری کیا۔ اس کے مدیر آپ خود تھے۔ اور منیجر مولانا مفتی مہدی حسن کے بڑے بھائی منشی سلطان حسن تھے۔ اس کا پہلا شمارہ شعبان ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوا۔ اس رسالہ میں قادیانیت کی تردید میں نہایت عمدہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ وہ زمانہ تقریر و تحریر کی آزادی کا نہیں تھا، اس رسالہ کی بمشکل اجازت ملی

تھی۔ غالبًا یہ رسالہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ آپ نے دہلی میں اقامت طے نہ فرمائی۔

مفتی اعظمؒ کے صاحبزادے مولانا حفیظ الرحمٰن واصفؔ مرحوم نے ردّ قادیانیت کا ایک واقعہ تحریر فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ ریل کے سفر میں حضرت والد ماجد کے ہم رکاب تھے، جس ڈبے میں ہم دونوں تھے اس میں دہلی کے سوداگروں میں سے دو معزز دولت مند حضرات بھی ہم سفر تھے۔ اور ان کے قریب دو تین بھاری بھرکم قادیانی مولوی بیٹھے تھے۔ اور مرزا غلام احمد کی صداقت اور نبوت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ان میں سے ایک بڑا مولوی بڑے زور و شور سے بول رہا تھا۔ بڑا لسان اور طرار معلوم ہوتا تھا۔ حضرت مفتی صاحب کچھ فاصلے پر تھے، اور ان لوگوں کی گفتگو سن رہے تھے۔ قادیانیوں کے مخاطب کبھی کبھی جواب دیتے تھے مگر پھر لاجواب ہو جاتے تھے۔ آخر حضرت نے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کی گفتگو میں دخل انداز تو نہیں ہونا چاہتا تھا مگر معاملہ دین کا ہے، اس لیے خاموش بھی نہیں رہ سکتا۔

میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے جو ابھی فرمایا ہے کہ آنحضرت صلعم خاتم النبیین ہیں اور مرزا صاحب کی نبوت سے ختم نبوت میں کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا، کیونکہ مرزا صاحب کی نبوت حضور ہی کی نبوت کا ایک جزء اور ضمیمہ ہے۔ تو یہ فرمائیے کہ حضورؐ کے اس قول "لا نبی بعدی" میں تو کسی خاص قسم کی نبوت کی تخصیص نہیں ہے، مطلق نبوت کی نفی ہے۔ ضمنی، غیر ضمنی، اور ظلی بروزی کی تخصیص کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ لائے نفی نے جنس نبوت کے تمام اقسام و اصناف کی نفی کر دی ہے، پھر بیچ میں یہ نبوت ضمنی کیسی؟

قادیانی مولوی نے جواب دیا کہ جس طرح سچا خواب نبوت کا چالیسواں حصہ ہوتا ہے اسی طرح ضمنی نبوت بھی ہوتی ہے۔ اور چونکہ آنحضرت صلعم کی نبوت کا دائرۂ عمل قیامت تک ہے اور آپ خاتم الانبیاء ہیں اس لیے آپ کے ہی دین کی تجدید کے لیے نبی آسکتا ہے اور اس سے آپ کی ختم نبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

حضرت مفتی اعظمؒ نے فرمایا کہ نبوت کا چالیسواں حصہ اگر کسی کو عطا کر دیا جائے تو وہ شخص نبی نہیں بن جائے گا۔ انسان کی ایک انگلی کو انسان کا لقب نہیں دیا جا سکتا۔ اور چونکہ تم دونوں کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لیے نبی ہیں پھر حضور کا یہ فرمان کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس کا کیا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا؟ بولیے جواب دیجئے، حضرت مفتی اعظم نے بار بار جواب مانگا مگر ان پر ایسا سناٹا چھا گیا کہ کوئی آواز نہیں ہی نکلی۔ قادیانی ایسے مبہوت ہوئے کہ کوئی جواب ہی نہ دے سکے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ آپ لوگوں کا یہ کہنا کہ حضور قیامت تک کے لیے نبی ہیں خود اس بات کا اقرار ہے کہ حضور کی بعثت کے بعد عہدۂ نبوت کبھی کسی کو عطا نہیں کیا جائے گا پھر دورانِ نبوت کسی اور نبی کی بعثت کے کیا معنی؟ حضرت مفتی اعظمؒ کی اس جرح کے بعد ان قادیانی مولویوں کے چہرے زرد پڑ گئے۔ ہونٹ خشک ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت مفتی اعظمؒ نے تقریباً ایک گھنٹہ رد قادیانیت، نبوت اور ختم نبوت پر وہ جامع اور فاضلانہ تقریر فرمائی جو اپنی مثال آپ تھی۔ اس طرح حضرت مفتی اعظمؒ اپنے دَور میں باطل تحریکوں کے خلاف ایک برہنہ تلوار بنے ہوئے تھے۔

مجلس تحفظ ناموس شریعت کا قیام

انگریزی سامراج نے عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کے لیے ان تحریکوں کا ہی سہارا نہیں لیا بلکہ اس نے بعض ایسے قانونی اقدامات بھی کیے جو اس کی اشاعت عیسائیت کی پالیسی میں مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ سارد اایکٹ ۲۹ء مخلوط شادیوں کا ایکٹ جیسے قانون مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ حضرت مفتی اعظمؒ نے ان قانون کی مخالفت اور مسلمانوں کے دین و ایمان کے تحفظ کے لیے ۱۹۲۹ء میں "مجلس تحفظ ناموس شریعت" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس کے تحت جمعیۃ علماء ہند نے حضرت مفتی اعظمؒ کی قیادت میں عام ایجی ٹیشن اور قانون شکنی کا اعلان کیا خود بھی اس قانون شکنی میں شریک ہوئے۔ سارد ابل پر آپ کی معرکۃ الآراء تنقید کو اہل علم حلقوں میں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایک مجلس کا حال لکھتے

ہیں کہ:

"۱۹۲۹ء کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا احمد سعید جو اس وقت جمعیۃ علماء کے ناظم عمومی تھے، ایک سلسلہ میں لاہور جانے والے تھے، ساردا بل کی بحث چل رہی تھی کہ مولانا محمد علی مرحوم نے جامع مسجد میں ایک پرزور تقریر کی۔ اور جمعیۃ علماء اور مجلس تحفظ ناموس شریعت پر سخت نکتہ چینی کی اور اس وقت ہونے والی ہڑتال کی مخالفت کی۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحب کی روانگی ملتوی ہو گئی۔

اور حضرت مفتی صاحب نے اس التواء کی وجوہ سے خادم (مولانا حبیب الرحمٰن صاحب) کو مطلع کر دیا اور ساتھ میں تاکید کی کہ اس تفصیل کی اطلاع سے میں مولانا ظفر علی خان، غلام رسول مہر اور مولانا سالک کو جو اس وقت جمعیۃ علماء کے ہم نوا تھے، خبر نہ کروں تاکہ اختلافات زیادہ نہ بڑھیں۔

حضرت مفتی اعظمؒ نے ۱۹۲۹ء میں ساردا ایکٹ اور ۱۹۳۲ء میں مخلوط شادیوں کے ایکٹ کی زبردست مخالفت کی۔ اور رائے عامہ کو منظم کر کے ان قوانین کے خلاف جدوجہد کی، مخلوط شادیوں کے ایکٹ کے سلسلہ میں آپ کی تحریک پوری طرح کامیاب رہی۔

صوبہ سرحد و صوبہ پنجاب و صوبہ بمبئی وغیرہ میں اسلام کے معاشرتی قوانین کے بجائے بہت سے مسلمان غیر اسلامی رواج پر عمل در آمد کرتے تھے۔ اور برطانوی عدالتیں اسلامی قانون کے مقابلے میں ان رواجوں کو ترجیح دیتی تھیں۔

جمعیۃ علماء ہند بارہا مسلمانوں کو ان رواجوں کو ختم کرنے اور شریعت اسلامیہ پر عمل کرنے کی طرف توجہ دلاتی رہی۔ علماء حق نے اپنے وعظوں میں مسلمانوں کو نصیحتیں کیں۔ اخبارات میں مضامین لکھے گئے مگر کوئی مفید نتیجہ بر آمد نہ ہوا کیونکہ برطانوی عدالتیں رواج کے مطابق فیصلہ کرنے پر قائم تھیں۔

آخر مجبور ہو کر سب سے پہلے جمعیۃ علماء صوبہ سرحد نے اس سلسلہ میں قدم اُٹھایا اور حضرت علامہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کی رہنمائی میں ایک مسودہ قانون "شریعت بل" کے نام سے تیار کیا، جس کا منشایہ تھا کہ مسلمانوں پر نکاح، طلاق، مہر اور ترکہ وغیرہ میں اسلامی قانون نافذ ہوں، چنانچہ صوبہ سرحد کی اسمبلی میں جمعیۃ علماء صوبہ سرحد اور مسلمانانِ سرحد کی کوششوں سے یہ شریعت بل قانون بن گیا جس سے اسلامی قانون کا وقار ایک حد تک قائم ہو گیا اور بہت سے مسلمان گناہ عظیم سے بچ گئے۔

(مآخذ و مراجع: الجمعیۃ مفتیٔ اعظم نمبر، مفتی اعظم کی یاد، بیس بڑے مسلمان، کفایت المفتی)

قطعہ

از جناب مولوی مظہر عبد الحق صاحب اشہرؔ، پیارم پیٹی، مدراس

آہ حضرت مفتیٔ اعظم بنزدِ حق رسید	حامل عرفان و علم و سر محمودؔ و رشید
اختر کامل، ولادت عبدہٗ عرش بود	از ولی مغفور، اشہر سالِ فوت آید پدید
۱۲۹۲ ۱ ۸	۲ ۷ ۳ ۱ ھ

تصویر کشی حضرت مفتی صاحبؒ کی نظر میں

از ـــــــــ پروفیسر بدرالدین الحافظ، نئی دہلی

مذکورہ بالا عنوان کے ذیل میں آنے والے مسئلہ کی تشریح کے لیے میں اس مضمون کی ابتداء مولانا برہان الدین سنبھلی کی مندرجہ ذیل عبارت سے کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو اس موضوع پر ایک جامع تحریر معلوم ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

”یہ مسئلہ کچھ عرصہ پہلے تک یہاں مختلف فیہ نہیں تھا بلکہ تقریباً اکابر اس کی حرمت کے قائل تھے، مگر ادھر جب سے برصغیر ہند و پاک کے عالم اسلام کے دیگر ملکوں سے روابط بڑھے اور وہاں کے علماء کا بہت سے مسائل میں مداہنت کی حد تک پہنچا ہوا غیر معمولی توسع سامنے آیا (جن میں فوٹو کا مسئلہ بھی ہے) تو یہاں کے عوام اور بعض مدارس کے کچھ فضلاء میں بھی وہی رنگ چڑھتا نظر آنے لگا، مگر خدا کا شکر ہے کہ متورع علماء اور محتاط ارباب فتوی کی اکثریت کا نقطۂ نظر نہیں بدلا ہے، فوٹوں کو جائز سمجھنے اور کہنے والے بالعموم تصویر اور فوٹوں میں یہ فرق بیان کرتے ہیں کہ تصویر ہاتھ سے بنائی جاتی ہے جبکہ فوٹو مشین سے عکس کو محفوظ کرنے کا نام ہے لہٰذا دونوں کی حقیقت ایک نہیں، اس لیے دونوں کا حکم بھی الگ ہونا چاہیے، عجیب اتفاق ہے کہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ جب عالم اسلام کے راہنما ملک مصر کے اندر ”مؤتمر اسلامی“ میں شرکت کرنے تشریف لے گئے جہاں ان کا غیر معمولی اعزاز کیا گیا کہ مؤتمر کے صدر کی داہنی طرف ان کو نشست دی گئی اور مجلس مضامین کے صدر بنائے گئے نیز شیخ الازہر کا مرتبہ شاہ کے بعد سب سے بڑا سمجھا جاتا تھا اور وہ کہیں نہیں جاتے تھے۔ دو مرتبہ مفتی صاحب کی قیام گاہ پر مزاج پرسی کرنے تشریف لائے، وہاں مفتی صاحبؒ سے جب فوٹو کے بارے میں سوال کیا گیا تو وہاں بھی مفتی صاحبؒ نے جواب میں اس کی حرمت کا بانگ دہل اعلان کیا۔ اس سوال و جواب کو ہم ایسی شخصیت کے حوالہ سے یہاں نقل کر رہے ہیں جس کی عظمت کے آگے عوام کے ہی نہیں علماء عصر کے بھی سر جھکے نظر آتے ہیں۔ میری مراد مولانا عبدالحق مدنی“ (وفات ۱۹۷۴ء) سے ہے جن کی پیدائش مدینہ طیبہ کی ہے اور تعلیم و تربیت بھی اسی مقدس سرزمین میں ہوئی۔ یہ مولانا مدنی“ مفتی صاحب کے رفیق سفر اور شریک مؤتمر تھے۔ وہ نقل فرماتے ہیں اور اس سوال و جواب کے الفاظ یہ تھے۔

علماء مصر: التصویرالممنوع انما هو الذی یکون بصنع الانسان و محالجة الایدی وهذا لیس کذلك انما هو عکس الصوره۔ (ممانعت تو صرف اس تصویر کی ہے جو انسان کے عمل اور ہاتھوں کی کاریگری سے ہو، فوٹو میں کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ یہ تو صورت کا عکس ہے)

حضرت مفتی صاحبؒ: کیف ینتقل هذا العکس من الزجاجة الی الورق۔ (یہ عکس کیمرہ لینس سے کاغذ پر کس طرح منتقل ہوتا ہے)

علماء مصر: بعد عمل کثیر۔ (بہت کچھ کاریگری کے بعد)

حضرت مفتی صاحبؒ: ای فرق بین معالجة الایدی وضع الانسان والحمل الکثیر۔ (انسان کے عمل، ہاتھوں کی کاریگری اور بہت کچھ کاریگری میں کیا فرق ہے)

علماء مصر: نعم هو شیٔ واحد۔ (کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ ایک ہی چیز ہے)

حضرت مفتی صاحبؒ: اذا حکمهما واحد (لہٰذا حکم بھی سب کا ایک ہے)

علماء مصر حضرت مفتی صاحب کی اس حاضر جوابی سے بے حد

متاثر ہوئے اور کچھ ایسے خاموش ہوئے کہ کوئی جواب نہ دے سکے۔"

(مجلہ فکر اسلامی بستی، معاصر فقہ اسلامی نمبر اشاعت خاص، ص ۱۴۴ تا ۱۴۶)

اس طرح مندرجہ بالا گفتگو میں حضرت مفتی صاحبؒ کا موقف تو واضح ہو گیا۔ لیکن اس مسئلہ میں آپ کی وسعت نظر اور بالغ فکر کی تصریح کے لیے کفایۃ المفتی سے ماخوذ چند مثالیں اور پیش کی جاتی ہیں۔

سوال: عکسی تصویر کھنچوانا کیا حکم رکھتا ہے اور انسان اور جانوروں کی تصویر میں کیا فرق ہے۔ انکشافات جدیدہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ درخت بھی جاندار ہیں تو کیا اس کا حکم بھی انسان اور جانوروں کے حکم کے مساوی ہے۔

جواب: تصویر کھینچنا اور کھنچوانا ناجائز ہے خواہ دستی ہو یا عکسی دونوں تصویریں ہیں اور تصویر کا حکم رکھتی ہیں۔ تصویر سے مراد جاندار کی تصویر ہے خواہ انسان ہو یا حیوان۔ مکانات کے نقشے، درختوں کی تصویریں ناجائز نہیں ہیں۔ تحقیقات جدیدہ سے درختوں میں جس قسم کی حیات دریافت ہوئی ہے وہ انسان و حیوان کی حیات سے مختلف ہے۔ دونوں زندگیوں کا تفاوت بدیہی اور شاہد ہے۔ بس حکم کا اختلاف کچھ مستبعد نہیں ہے۔

محمد کفایت اللہ غفر لہ مدرسہ امینیہ دہلی

شرعاً جائز ہے یا نہیں۔ پس اگر جائز ہے تو کیوں اور اس میں کیا مصلحت ہے اور اگر ناجائز ہے تو اس طرح سے تصویر کھنچوانے اور کھینچنے والوں کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے۔ آیا ایسے اشخاص کے پیچھے نماز میں اقتداء درست ہے اور کیا یہ لوگ فاسق کے حکم میں داخل ہیں۔ اور اس قسم کی تصویریں اپنے پاس رکھنا درست ہے یا نہیں۔

المستفتی حاجی داؤد ہاشم یوسف رنگون

۲۳ را کتوبر ۱۹۳۷ء

جواب: تصویر بنانے اور بنوانے کی جو ممانعت ہے وہ ہاتھ سے تصویر بنانے اور بنوانے یا فوٹو کے ذریعے سے تصویر اُتارنے اور اتروانے کو شامل ہے۔ جاندار کی تصویر خواہ کسی طریقہ سے بنائی جائے تصویر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو گھر میں رکھنا ممنوع ہے، تصویر سے مراد چہرہ یعنی سر کی تصویر ہے، خواہ نصف بدن کی ہو یا پورے قد کی، ہاں سر اور چہرہ نہ ہو تو باقی بدن کی تصویر مباح ہے۔ بعض علماء مصر فوٹو کی تصویر کو مباح قرار دیتے ہیں، بعض نصف بدن کی تصویر کو مباح بتاتے ہیں، مگر ہمارے خیال میں یہ دونوں قول مرجوح اور بے دلیل ہیں۔ لازمی سفر کے لیے پاسپورٹ کے واسطے فوٹو مباح قرار دیا جا سکتا ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

اب اسی موضوع سے متعلق ایک ایسا سوال ملاحظہ فرمایئے جس کی نوعیت قدرے مختلف ہے اور اب سے تقریباً ستر سال قبل حضرت مفتی صاحبؒ نے جو، جواب تحریر فرمایا ہے اس کی ضرورت اور معنویت آج کتنی اہم ہے۔

سوال: جدید طریقۂ فوٹوگرافی سے جو تصویریں کھینچی جاتی ہیں ان میں آئینہ کی طرح عکس آتا ہے۔ البتہ مستقل اور غیر مستقل طور پر صورت قائم ہو جانے کا فرق ہے۔ پس ارشاد ہو کہ بلاضرورت شدیدہ مثلاً لازمی پاسپورٹ وغیرہ میں جدید طریقۂ فوٹوگرافی سے جاندار کے پورے قد کی تصویر کھینچنا اور کھنچوانا

تصویر کے احترام سے متعلق آج کے ہندوستان میں جس طرح کے مسائل پیش آرہے ہیں وہ حضرت مفتی صاحبؒ کے دور میں شروع ہو چکے تھے، اور آپ نے ان پر ایسا جامع جواب عنایت فرمادیا تھا جو ہمیشہ رہنمائی کرتا رہے گا۔ ملاحظہ ہو:

سوال: زید میونسپلٹی میں ایک اسکول میں بحیثیت مدرس ملازم ہے۔ میونسپلٹی کے آفیسران گاندھی کے مجسمہ یا تصویر پر پھولوں کا ہار پہنانے کے لیے زید کو حکم دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے مجسمہ یا تصویر پر ہار ڈالنا یا پہننا جائز ہے یا نہیں۔ اگر ملازم حکم عدولی کرتا ہے تو ملازمت سے برطرف کر دیئے جانے کا خطرہ

ہے۔

جواب: مسلمانوں کے لیے تصویر کا رکھنا اس کا احترام کرنا، اس پر پھول ڈالنا جائز نہیں، زید کو عذر کر دینا چاہیے کہ مجھے اپنے مذہب کے لحاظ سے یہ فعل جائز نہیں ہے اگر اس پر اس کے آفیسر ناراض ہو کر اسے ملازمت سے علیحدہ کر دیں تو صبر کرے، خدا مسبب الاسباب ہے اور وہ رزق رسانی کی کوئی اور صورت کر دے گا۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ

(مندرجہ بالا تمام سوال وجواب کفایۃ المفتی جلد نہم سے ماخوذ ہیں)

اس کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ کے مکمل اور مہتم بالشان فتاویٰ کو ہم عصر حاضر کے فتاویٰ سے موازنہ کر کے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آج کے مفتی بھی اُنہی حدود و قیود کے ساتھ تصویر کشی کے مسائل پر اپنی رائے رکھتے ہیں اور وہی موقف اختیار کر رہے ہیں جو حضرت مفتی صاحبؒ کا موقف تھا۔ ملاحظہ ہو مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے مفصل مضمون کا خلاصہ:

۱۔ ذی روح کے مجسمے بنانا مطلقاً حرام اور ناجائز ہیں۔

۲۔ ایسی تصویریں بھی قطعی طور پر ناجائز ہیں جن کی کسی قوم میں پرستش اور اور عبادت کی جاتی ہو، جیسے گرونانک جی اور ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق کرشن اور رام جی وغیرہ اور عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح اور حضرت مریم کی تصویریں۔

۳۔ ذی روح کی تصویروں کو اس لیے بنانا کہ ان کو لٹکایا اور آویزاں کیا جائے یا مقام احترام میں رکھا جائے یا تصویر اس مقصد کے لیے نہ کھینچی گئی ہو مگر اس کا استعمال اسی طرح ہوا کرے، ہر دو صورتیں ناجائز ہیں۔

۴۔ عام تصویریں جن میں احترام یا عبادت اور پرستش مقصود نہ ہو بھی ناجائز ہی ہیں جیسا کہ عام علماء ہند و پاک کا مسلک ہے۔ البتہ یہ مسئلہ اجتہادی اور مختلف فیہ ہے اور سلف و خلف کا اس پر اتفاق نہیں ہے جیسا کہ اوپر ذکر کی ہوئی تفصیلات اور ہمارے زمانہ کے عام علماء عرب اور ہند و پاک میں بھی بعض ثقہ اور مستند علماء کرام کے تعامل سے واضح ہوتا ہے۔

۵۔ جہاں تصویر ایک ضرورت بن جائے مثلاً دفاعی مقاصد کے پیش نظر تصویر لی جائے، پولیس اسٹیشنوں میں اشرار اور غنڈہ عناصر کی تصویریں محفوظ رکھی جائیں، ریلوے بس اور مختلف مقامات میں شناخت کے لیے تصویر درکار ہو، پاسپورٹ اور حج کے لیے تصویر کھنچوانی ہو، یہ تمام صورتیں درست اور جائز ہیں۔

۶۔ جن فقہاء نے تصویر کو حرام قرار دیا ہے انھوں نے بھی اس کی صراحت کر دی ہے کہ اگر سر کٹا ہو یا ایسی تصویر ہو جس سے صورت کی شناخت نہ ہو سکے اس پر تصویر کا اطلاق نہیں ہوگا اس لیے میڈیکل اور طبی مقاصد کے لیے انسان کے جسم کے بعض حصوں کی جو تصویریں لی جاتی ہیں اور جو اکثر اوقات جسم کے اندرونی حصوں سے متعلق ہونے کی وجہ سے ناقابلِ شناخت ہوتی ہیں ان میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔"

(مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، جدید فقہی مسائل اوّل، ص ۱۹۵، قاضی پبلشرز، نظام الدین نئی دہلی، طبع ۱۹۹۱ء)

موجودہ دور کے معروف پاکستانی عالم مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: "فوٹو گرافی تصویر سازی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے اس کو تصویر سازی سے الگ کوئی چیز سمجھنا اور بذریعہ فوٹو حاصل شدہ تصاویر کو تصاویر نہ کہنا ایک بدیہی غلطی ہے اور خالص نفس کا فریب ہے۔ فوٹو کی تصویر، بت، مورتی اور مجسمہ کا یکساں حکم ہے اور یہ سب حرام ہیں۔

(جسٹس مولانا مفتی تقی عثمانی، فوٹو کی شرعی حیثیت، ص ۱۶، شائع کردہ عبدالغنی محمد اسماعیل تاجر عطر، چاندنی چوک دہلی)

میرزھرھلاھلکوکبھیکھہسکاقند

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی سیاسی خدمات

عادل صدیقی

ہندوستان کو آزاد کرانے میں مسلمانوں خاص کر علماء کرام کے رول کی اہمیت کو کوئی بھی مورخ نظرانداز نہیں کر سکتا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا، ناکام ہو جانے کے بعد مسلم دانشوروں نے یہ سوچا کہ ابھی ہندوستانیوں کی حربی صلاحیت اس قدر ترقی یافتہ نہیں ہے کہ سامراجیت کا مقابلہ میدانِ جنگ میں کیا جا سکے۔ اس لیے اس ذہنی تبدیلی کے بعد انھوں نے یہ پلان بنایا کہ سامراجیت کے خلاف لڑائی کے لیے اب ذہن سازی کی ضرورت ہے، چنانچہ ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کا آغاز اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اور اس کے زیر اثر بجنور، مراد آباد، اور دیگر متعدد مقامات پر عربی مدارس کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ الحمد للہ ان عربی مدارس نے آج تک اپنی حب الوطنی پر آنچ نہیں آنے دی، افسوس تو اس بات کا ہے کہ آج ہمارے ملک کے نوجوانان علماء دین کی خدمات سے ناواقف ہیں جن کی انتھک کوششوں اور بے مثال قربانیوں سے انھیں آزادی ملی۔ قربانی دینے والے اور قوم کی رہنمائی کرنے والے ان علماء کی تعداد بہت زیادہ ہے، مثال کے طور پر شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا سیّد حسین احمد مدنی، مولانا محمد میاں، مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ اور دیگر بہت سے علماء کرام۔ یہاں ہمارا موضوع مولانا محمد کفایت اللہ ہیں جن کی بے مثال قربانیوں اور وطن دوستی سے ملک میں نہ صرف فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو تقویت ملی بلکہ آپ کی علمی اور فکری صلاحیتوں کا نقش دوام آج بھی روز روشن کی طرح تاباں ہیں۔

ابتدائی زندگی

مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ کی ولادت ۱۸۷۵ء مطابق ۱۲۹۲ھ میں بمقام شاہجہاںپور یوپی ہوئی۔ آپ کے والد شیخ عنایت اللہ شاہجہانپور کے ایک عالم دین اور بزرگ ہستی تھے۔ دستور کے مطابق مفتی صاحب نے بچپن میں قرآن کی تعلیم حاصل کی اور پھر اردو، فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے مدرسہ شاہی مراد آباد میں تعلیم حاصل کی۔ دو سال بعد دیوبند آئے اور دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گئے اور تین سال تک دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی۔ آپ کے رفیقانِ خصوصی میں حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی، حضرت مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا امین الدین بانی مدرسہ امینیہ شامل تھے۔

سیرت

آپ میں خودداری بدرجہ اتم تھی۔ دورانِ طالب علمی کروشیا سے ٹوپیاں بن کر اپنے اخراجات کے خود کفیل بنے۔ آپ میں جذبہ انسانیت کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، معمولات کے پابند تھے۔ زیادہ وقت مطالعے اور غور و فکر میں گزرتا تھا۔ لایعنی باتوں سے مطلق گریز کرتے تھے۔ دوستوں عزیزوں اور رفقاکار میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

بچپن کا دور اور ماحول کے اثرات

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کی جنگِ آزادی لڑی گئی، اس سے قبل اسلامی علوم و فنون کا سرچشمہ حضرت شاہ ولی اللہ تھے لیکن ۱۸۵۷ء کے دوران یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور علمی حلقے منتشر ہو گئے اور ۱۸۶۶ء میں خاندانِ شاہ ولی اللہ کے علمی اور روحانی جانشینوں نے اس سلسلے کو پھر زندہ کیا اور ہندوستان میں اسلام کی بقا اور اور اس کے عروج نیز ملک کو بدیسی چنگل سے آزاد کرانے کے

خیال سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور ان کے رفقائے کار نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور حضرت حاجی عابد حسین صاحب کے مشورے سے اسلامی دنیا کے علمی، دینی اور اسلامی مرکز دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ اس دارالعلوم کے پہلے مایۂ ناز طالب علم محمود حسن دیوبندی تھے جو ملک و قوم کی خدمت میں زندگی بھر لگے رہے۔

ابھی انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد بھی نہ پڑی تھی کہ مادرِ وطن کے اس سپوت نے جو بعد میں مفتی اعظم بنے ایسے اسلامی اثرات قبول کیے جن کی روشنی میں ملک و وطن کی وسیع تر بنیادوں پر خدمات انجام دی جاسکیں۔ آپ کی بلندیٔ کردار، فکر و عمل، وسعتِ نظر اور فراخ حوصلگی نے ہندوستانی باشندوں کے لیے آبرومندانہ زندگی کا سامان فراہم کیا۔ یہ وہ دور تھا جبکہ جنگ طرابلس اور بلقان کی وجہ سے مسلمانوں میں ہیجان پھیلا ہوا تھا اور شیخ الہند نے ہندوستان سے برطانوی سامراج کو ختم کرنے کے لیے جو اسکیم تیار کی تھی اس کا سبھی خاص و عام کو مختلف طرح سے علم تھا۔ جنگ بلقان کے وقت مفتی صاحب کو ملت پروری کے جذبات پریشان کر رہے تھے۔ ہندوستان سے ڈاکٹر انصاری ایک طبی وفد لے کر ترک سپاہیوں کی مرہم پٹی کے لیے روانہ ہوئے اور جب وہ واپس آئے تو علامہ شبلی نے ان کے خیر مقدم کے لیے ایک نظم کہی۔

سیاسی خدمات

مفتی اعظم نے ملک و قوم کی خدمت کے لیے جمعیۃ علماء کا پلیٹ فارم منتخب کیا کیونکہ جمعیۃ بار بار اس بات کا اعلان کر چکی تھی کہ اس کا نصب العین مکمل آزادی ہے اور اس پر تمام مسلمانانِ ہند متفق ہیں اور اس کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔ جمعیۃ علماء نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ وطن آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، ان کا مذہب آزاد ہوگا۔ مسلم کلچر اور تہذیب و ثقافت آزاد ہوگی وہ کسی ایسے آئین کو ہرگز قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

۱۵ر اگست ۱۹۴۲ء کو مفتی کفایت اللہ صاحب نے یہ بیان اخبارات میں شائع کرایا۔ اس پر مولانا احمد سعید صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا عبدالحلیم صدیقی کے دستخط بھی تھے۔

"ہندوستان کی مکمل آزادی تمام ہندوستانیوں کا متحدہ و متفقہ مطالبہ ہے۔ حکومتِ برطانیہ نے اس متفقہ و متحدہ مطالبے کو تسلیم کرنے اور حکومت کے اختیارات ہندوستانیوں کی طرف منتقل کرنے میں جس تساہل اور شہنشاہت کی ضد اور ہٹ سے کام لیا ہے، وہ تمام ہندوستان پر روشن ہے۔ اس نازک ترین دور میں جبکہ ہر طرف سے مصیبتوں کے بلاخیز طوفان اُمنڈ رہے ہیں، حکومت استعمار کے نشہ سے اس طرح سرشار ہے جس طرح ۱۹۳۹ء سے پہلے تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ اس جنگِ آزادی میں کامیابی کی شرط اولین تمام ہندوستانیوں کا اتحاد اور متحدہ محاذ ہے۔ اگر تمام ہندوستانی متحد ہو کر حکومت کے مقابل کھڑے ہوگئے تو فتح یقینی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ انگریزوں سے کہہ دیا جائے، حکومت کے سارے اختیارات ہندوستانیوں کو دے کر خود دست بردار ہو جائیں۔ ہندوستان کی آزادی کامل کے مقصدِ عظیم میں کانگریس، جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار اور دیگر تمام ترقی پسند جماعتیں متحد ہیں۔"

۲۳ر نومبر ۱۹۱۹ء کو دلی میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی، اس اجلاس میں ملک کے نامور علماء شریک ہوئے۔ اجلاس کے دوران یہ طے ہوا کہ علماء کو ایک متحدہ قومی پلیٹ فارم پر جمع ہونا چاہیے اور جمعیۃ علماء کے نام سے ایک تنظیم بنانی چاہیے۔ اس جلسے میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کو صدر اور سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب کو ناظم مقرر کیا گیا اور پھر اس اجلاس میں ملک کی آزادی کے مطالبے کے ساتھ حضرت شیخ الہند اور مولانا ابوالکلام آزاد کی رہائی کا پرزور مطالبہ کیا گیا۔ جمعیۃ علماء کے اجلاس عام دلی میں ۱۹-۲۰ر اور ۲۱ر نومبر کو مفتی کفایت اللہ صاحب نے خطبہ صدارت پیش فرمایا کیونکہ شیخ الہند علیل تھے اور اجلاس میں شرکت نہ کر سکے تھے۔ مفتی صاحب نے اس اجلاس میں ترکِ موالات کے سلسلے میں پوری قوت سے تحریک چلانے کی تجاویز منظور کرائیں اور اعلان کیا کہ سرکار انگلشیہ کے ساتھ موالات اور نصرت کے تمام تعلقات اور معاملات رکھنے حرام ہیں۔ اس میں یہ بھی اعلان کیا گیا کہ:

۱۔ تمام خطابات اور اعزاز فوراً واپس کر دیئے جائیں۔
۲۔ کونسلوں کی ممبری سے علیحدگی اختیار کی جائے۔
۳۔ کالجوں اور اسکولوں میں سرکاری امداد نہ لی جائے۔
۴۔ دشمنانِ دین کی فوجوں میں ملازمت نہ کی جائے۔
۵۔ عدالتوں میں مقدمات نہ لے جائے جائیں اور وکیلوں کو ان مقدمات کی پیروی سے روکا جائے۔

مفتی کفایت اللہ کا نام ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس میں شرکت کے لیے جمعیۃ کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اس کانفرنس کی ایک شاخ نے سب کمیٹی نہرو رپورٹ میں ضروری ترمیمات کا مسودہ پیش کیا۔

۱۱/اکتوبر ۱۹۳۰ء کو مفتی کفایت اللہ صدر جمعیۃ کو گرفتار کر لیا گیا اور آپ کی جگہ شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی کو قائم مقام صدر بنایا گیا۔

۱۹۳۱ء میں جمعیۃ علماء ہند کے سول نافرمانی پروگرام کے تحت حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کو پہلا ڈکٹیٹر بنایا گیا۔ حضرت مفتی صاحب دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں ایک لاکھ افراد کی قیادت کرتے ہوئے آزاد پارک سے گرفتار کیے گئے اور اٹھارہ ماہ جیل میں رہے۔

مفتی کفایت اللہ نے نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کو بھی ہندوستانیوں کے مسائل سے آگاہ کرایا۔ آپ قاہرہ گئے اور قضیہ فلسطین سے متعلق موتمر عالم اسلامی کی میٹنگ میں شرکت کی اور وہیں ہندوستانی عوام کے جذبۂ آزادی کی تڑپ سے ان سب لوگوں کو آگاہ کر دیا۔

۳/اگست ۱۹۳۸ء کو جمعیۃ کی مجلس عاملہ کا اجلاس دہلی میں مفتی صاحب کی صدارت میں ہوا۔ جس میں فلسطین کے کاز کی حمایت کی گئی اور برطانوی سامراج کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا گیا اور تمام مسلمانوں سے سول نافرمانی کی تحریک میں شامل ہو جانے کی اپیل کی گئی۔ فلسطین کمیٹیاں قائم کی گئیں۔

بہرصورت ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ ان اکابرین ملک کے تفصیلی حالات کا ذکر کیے بغیر نامکمل رہے گی۔ حصولِ آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں اور برادرانِ وطن میں سیاسی بصیرت اور پائیدار اصولوں کی بنیاد پر وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنے میں ان محبان وطن کا اہم حصہ ہے۔ آزادی کے پچاس برسوں میں اگر ملک کا سیکولر کردار مستحکم ہوا ہے اور ہندوستان نے دنیا میں ایک اہم مقام حاصل کیا ہے تو اس کا کریڈٹ ان بلند پایہ اصولوں کو جاتا ہے جو ہمارے اکابرین نے بلا لحاظ مذہب وملت قوم و وطن کے وسیع تر مفاد میں پیش کیے۔ آج ملک میں قومی اتحاد کی جس قدر ضرورت محسوس کی جارہی ہے، اتنی شاید پہلے کبھی نہ محسوس کی گئی ہو مگر تاریخ آزادی کے غیر جانبدارانہ مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ملک کے اتحاد کو تقویت دینے کے لیے ان اکابرین نے جس قدر سر اور دھڑ کی بازی لگائی ہے، اتنی شاید کسی اور نے نہیں لگائی۔ اسی اتحاد کی خاطر انھوں نے اپنوں کی گالیاں سنیں 'شوبوائے' جیسی حقارت آمیز اصطلاحات کا سامنا کیا مگر:

زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

تاریخ وفات

نتیجہ فکر جناب حافظ عبید اللہ البصیر صاحب ٹونک

واعفُ عنّا، واغفرلنا، وارحمنا

۳ ۵ ۹ ۱ ء

مادہ تاریخ

از جناب مولانا بدر صاحب سنبھلی

محی الملّۃ والدین مفتی کفایت اللہؒ

۲ ے ۳ ۱ ھ

اعلیٰ ترین عطریات وخوشبویات
کیلئے واحد نام صرف اجمل
اجمل

حضرت مفتی اعظم کے سفر آخر کا منظر

(ماخوذ از اخبار 'نئی دنیا' وغیرہ۔ مورخہ ۲-۳/جنوری ۱۹۵۳ء)

یکم جنوری ۵۳ء۔ سترکروڑ مسلمانوں کے مذہبی پیشوا حضرت مفتی اعظم کی وفات کی خبررات کو جونہی شہر میں پھیلی ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ شہر کے تمام مسلم علاقوں میں کاروبار بند ہوگئے۔ اور ہرقسم کی دوکانیں مفتی صاحب کے غم میں آج بند ہیں۔ یہاں تک کہ کھانے پینے کی بھی دُکانیں بند ہیں۔ شہر میں بعض جگہ ماتمی سیاہ جھنڈیاں بھی اظہار غم کے طور پر لگادی گئی ہیں۔ ہر طرف سناٹا ہے اور اُداسی چھائی ہوئی ہے۔ آج مذبح بھی بند ہے۔

نماز فجر کے بعد ہی مفتی صاحب کے مکان کے باہر لوگوں کا ہجوم ہو گیا تھا۔ اور بڑھتا جارہا تھا۔ ایک طرف بازار چتلی قبر تک اور دوسری طرف دریا گنج تک سڑکیں بھر گئی تھیں۔ مجمع کی طرف سے آخری دیدار کی خواہش کی جارہی تھی۔ زنانہ مکان خواتین سے بھر گیا تھا اور اُس طرف کی گلی میں بھی خواتین کا ہجوم تھا۔ غرضکہ، سات بجے زیارت شروع ہوئی۔ چہرۂ مبارک سے کفن ہٹادیا گیا تھا۔ مردانہ مکان کے چھوٹے سے صحن کے بیچ میں جنازہ رکھا تھا۔ لوگ ایک قطار کی صورت میں آرہے تھے۔ یہ قطار بازار چتلی قبر سے مکان تک مسلسل رواں تھی۔ زیارت کے وقت منتظمین کی ہدایت تھی کہ کوئی صاحب ٹھہر کر زیارت نہ کریں برابر چلتے رہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس لائن کو روک دیا جاتا تھا اور خواتین کو اسی طریقے سے زیارت کا موقع دیا جاتا تھا۔ یہ دیکھا جارہا تھا کہ لائن میں زیادہ تر آدمیوں کے آنسو رواں تھے۔ غرضیکہ ایک عجیب سکون ووقار اور کمیر العقول نظم وضبط کے ساتھ یہ لائن بارہ بجے تک مسلسل چلتی رہی۔

اس کے بعد میت کو زینہ پر سے اُتارا گیا۔ اور گلی میں لاکر مسہری میں رکھا گیا۔ تقریباً سوا بارہ بجے جنازہ اٹھا۔ اس وقت ایک عجیب رقت انگیز منظر تھا۔ کوچہ چیلان سے جامع مسجد تک سڑکیں اور گلیاں ہزاروں روتے ہوئے انسانوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کچھ تو بڑے زور زور سے رو رہے تھے اور بعض کے چہرے نہایت غمگین اور اُداس تھے۔ عورتیں مکانوں کی چھتوں پر رو رہی تھیں۔ مرحوم کے مکان سے جامع مسجد تک آدمی ہی آدمی تھا۔ لوگ غم ویاس کے عالم میں اپنے مذہبی پیشوا کے آخری دیدار کے منتظر کھڑے تھے۔

جنازے کو جن چار حضرات نے پہلے اٹھایا ان میں آگے حضرت مفتی اعظم کے خلف اکبر مولوی حفیظ الرحمان واصف اور حکیم شریف الدین صاحب بقائی تھے۔ جب جنازہ چلا تو بارش شروع ہوگئی۔ تقریباً سوا بجے جنازہ پریڈ گراؤنڈ (میدان درمیان لال قلعہ و جامع مسجد) پہنچا۔ باوجود سخت سردی اور بارش کے لوگوں کا ہجوم بڑھتا ہی جارہا تھا۔ جنازہ کی مسہری میں لمبے لمبے بانس باندھ دیئے گئے تھے۔ پھر بھی ہزاروں آدمی کندھا نہیں دے سکے۔ جنازے کے مجمع میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی ہر فرقے کے لیڈر اور عوام شریک تھے۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نماز جنازہ پڑھائیں گے۔ مگر وہ وقت پر دہلی نہیں پہنچ سکے۔ شب گذشتہ کو دہلی کی مشہور درگاہ صابریہ کے سجادہ نشین شیخ طریقت پیرجی کرار حسین صاحب کی بھی وفات ہوگئی تھی۔ ان کا جنازہ بھی یہیں پہنچ چکا تھا۔ اور مفتی اعظم کے جنازہ کے برابر ہی رکھا ہوا تھا۔ ایک سالک طریقت کا ایک عالم شریعت کا دونوں جنازوں کی ایک نماز ہوئی جو حضرت مولانا احمد سعید صاحب نے پڑھائی۔ جنازہ کے بالکل قریب اگلی صف میں پاکستان کے ہائی کمشنر اور ان کے فرسٹ سکریٹری مسٹر عبدالرحمٰن اور اسٹاف کے کچھ اور لوگ کھڑے تھے۔

نماز جنازہ ایک لاکھ آدمیوں نے پڑھی۔ اس کے بعد جس وقت جنازہ چلا تو دہلی دروازہ تک ڈیڑھ لاکھ آدمی شریک تھے۔ جنازہ

کا فقید المثال منظر قابل دید تھا۔ ہر شخص اس ہستی کی عظیم الشان موت پر رشک کر رہا تھا جس کی عقیدت میں لوگ جوق در جوق دہلی اور بیرون دہلی سے چلے آرہے تھے۔ پریڈ گراؤنڈ سے دہلی دروازہ تک کی وسیع سڑکیں انسانوں کا ایک سمندر معلوم ہوتی تھیں۔ سڑکوں کے دونوں طرف ہندو مسلمان سکھ عورتیں اور بچے کھڑے تھے۔ اور جامع مسجد کی سیڑھیوں اور مشرقی دروازہ اور دوطرفہ دالانوں میں ہزاروں مسلم خواتین اپنے مرحوم پیشوا کے جنازے کے آخری دیدار کے لیے بھری ہوئی تھیں۔ اتنے عظیم الشان ہجوم کا کنٹرول قدرت ہی کر رہی تھی۔ نہ فوج کی ضرورت پیش آئی نہ پولیس کی۔

دہلی دروازہ کے باہر پہنچ کر جنازہ ایک بڑی سی ایمبولینس کار میں رکھا گیا۔ اور مہرولی کی طرف چلا۔ گورنمنٹ کی طرف سے فری بسوں کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ لوگ اپنے پیسے خرچ کر کے بسوں کاروں اور تانگوں میں مہرولی جارہے تھے۔ (دہلی دروازے سے مہرولی کا فاصلہ گیارہ میل ہے) ساڑھے چار بجے جنازہ مہرولی پہنچا اور ظفر محل کے پاس جاکر رُکا۔ بعد نماز عصر میت کو قبر میں اُتارا گیا۔ قبر میں اتارنے سے پہلے نماز عصر کے بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، مولانا قاری محمد طیب صاحب، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی جو دیوبند سے دہلی پہنچ چکے تھے آخری دید کے لیے تشریف لائے۔ اس کے بعد حضرت مولانا احمد سعید صاحب اور مولوی حفیظ الرحمان واصف نے قبر میں اتر کر میت کو لحد میں رکھا۔ تقریباً مغرب کے وقت ہزاروں انسان اپنی اس جلیل القدر اور گراں مایہ دولت کو سپرد خاک کر کے واپس ہوئے۔

تجہیز و تکفین اور مہرولی تک کے تمام انتظامات میں شہر کے تمام محلوں کے سرکردہ حضرات نے اور خاص کر پہاڑی بھوجلا کے جاں نثار اور عقیدت مند لوگوں نے نمایاں حصہ لیا۔ اخبارات سے معلوم ہوا کہ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے شہروں میں مفتی اعظم کی غائبانہ نماز جنازہ بھی ادا کی گئی۔ □□

قطعہ تاریخ وفات

از مولانا مفتی سیّد حفیظ الدین صاحب امام مسجد رنگریزاں، دہلی

آہ اے مفتی اعظم آہ ! آہ! — گشت عالم از غمت در اضطراب
آہ اے علامۂ فرخندہ بخت — آہ اے فہامۂ عالی جناب
آہ اے علامۂ فخرِ جہاں — در غمت گریہ کناں ہر شیخ و شاب
موتِ عالم موت عالم راست شد — مات خیر الخلق ذو فصل الخطاب
کل حیّ ذائق کاسَ الفناء — ھکذا المسطور فی امّ الکتاب
قد جری الدمعُ علی قدر الاذیٰ — شابھت اجفاننا سحّ السحاب
اِن یکن غابَ عن الدنیا ففی — جنۃ المأویٰ لہ اعلیٰ المتاب
جملہ عالم تیرہ و تاریک شد — شمسنا حقاً توارت بالحجاب

ہاں سر بد گو بہ بُر تائب بگو
مفتی ہندوستاں ، غفراں مآب
۱۳۷۲ھ

مفتی اعظمؒ کے شاگرد رشید اور رفیقِ خاص

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ

جن کے تذکرے کے بغیر حضرت مفتی اعظمؒ کا تذکرہ نامکمل ہے

از مولانا حفیظ الرحمٰن واصف

استاد اور شاگرد کا تعلق لازم و ملزوم کی طرح ہوتا ہے اور اگر رفاقت اور باہمی اعتماد بھی اس میں شامل ہو جائے تو پھر وہ ایک جان دو قالب والی بات ہو جاتی ہے۔ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ اور سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا یہ دونوں استاد اور شاگرد بھی تھے اور ایک دوسرے کے ہر شعبۂ زندگی میں رفیق اور ساتھی بھی۔ اس لیے دونوں کا تذکرہ ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہی رہتا ہے۔ ہم ذیل میں مفتی اعظمؒ کی نسبت سے ان کے عزیز شاگرد، ہر وقت کے ساتھی اور ان کے ساتھ ہر مہم میں شامل رہنے والے سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ کے مختصر حالات بھی پیش کر رہے ہیں جن میں اکثر حالات ایسے ہیں جن کا خود ایک دوسرے سے تعلق ہے اور اس طرح سحبان الہندؒ کا یہ تذکرہ حضرت مفتی اعظمؒ کا ہی تذکرہ معلوم ہوتا ہے۔

مولانا احمد سعید اُجڑی ہوئی دلّی کی ایک عظیم الشان یادگار تھے۔ اور اگر یوں کہا جائے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے وہ دلّی کی رہی سہی عظمت کا کھنڈر بن کر رہ گئے تھے تو بے جا نہ ہوگا۔

ان پر مقالہ لکھنے بیٹھا تھا۔ قلم اٹھایا اور لکھا۔ اور لکھتا ہی چلا گیا۔ اور معلوم نہیں کیا لکھا؟ اور کتنا لکھا؟ یہ منثور مرثیہ مولانا مرحوم کا ہے؟ یا دہلی مرحوم کا؟ یا ماضی مرحوم کا؟ میں فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں۔ بہر حال جو کچھ قلم کی زبان سے نکلا وہ جذبات کی ترجمانی اور ایک متاعِ گم شدہ کی کہانی ہے۔

مولانا احمد سعید کا تذکرہ بغیر حضرت مفتی اعظمؒ کے تذکرے کے مکمل نہیں ہو سکتا۔ میرا انداز تحریر میرے قدرتی انتساب کا تقاضا تھا۔ مجھے معذور سمجھا جائے۔

ہائے دلی

دلّی کی ہوا کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ مرطوب ہے۔ مگر اب سے بیتے ہوئے سو برس کی تاریخ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارا تجربہ اس کے خلاف ہے۔ مرطوب آب و ہوا میں فولادی آئینہ زنگ آلود ہو جاتا ہے اور اس کے جوہر غائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن دلّی کی ہوا میں پوشیدہ جوہر ابھرتے ہیں۔ دلّی اپنے اندر بھی بے انتہا جوہر رکھتی ہے اور اس کی ہوا جوہر قابل کو صیقل کر کے ابھارنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ کہاں تک نام شمار کروگے۔ سو برس کی تاریخ کو جتنا کھنگالو گے لعل والماس ہی نکلیں گے اور اس کی خاک کو جتنا رول کر دیکھو گے موتی ہی موتی نظر آویں گے۔ دلی کی خاک نے جہاں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ جیسے علماء مولانا اسمٰعیل شہید جیسے مجاہد، غالب و داغ جیسے شاعر، نواب ضیاء الدین احمد جیسے مورخ و نساب حکیم اجمل خاں جیسے طبیب، منشی ذکاء اللہ جیسے ماہر ریاضی، سر سید احمد خاں جیسے مدبر وایثار پیشہ، مفتی صدر الدین خاں جیسے مفتی شاہ محمد اسحٰق جیسے محدث پیدا کیے۔ وہاں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ جیسے جوہر قابل کو صیقل دے کر چمکایا۔ مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری،

مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ جیسے اکابر ملت کو اپنی آنکھوں کا تارا بنایا۔ جوہر شناسی اور قدر افزائی بھی اس اُجڑی ہوئی دلی کا خاصہ ہے۔

دنیا میں ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو اپنے ماحول کی ناسازگاری کے باوجود کارزار حیات میں قدم بڑھاتے ہیں اور آگے بڑھاتے ہی رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ملک و قوم کے ممتاز اکابر کی صف اول میں داخل ہوجاتے ہیں۔ ان کی پوری زندگی شدید مجاہدات میں گزرتی ہے۔ ان کو بڑی بڑی اذیتوں اور حوادث سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ مگر ان کی ہمت کبھی جواب نہیں دیتی۔ اور وہ اپنی ایک شاندار تاریخ اور عظیم الشان کردار چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

زمانہ حاضرہ پر جب ہم نگاہ ڈال کر تجسس کرتے ہیں۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دلی کی ان مجاہد ہستیوں میں سے جنھوں نے اپنی ذاتی محنت و کاوش سے ایک عظیم الشان کردار پیدا کیا۔ اور دلی کی تہذیبی و معاشرتی خصوصیات کو قائم رکھا۔ مولانا احمد سعید کی ہستی ایک آخری نمونہ تھی۔ اس شمع کے گل ہوجانے کے بعد محفل تاریک ہے فضا اداس ہے اور جگہ خالی ہے۔ معلوم نہیں یہ جگہ کب تک خالی رہے گی۔ اور دلی کی خاک سے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا احمد سعید۔ مسٹر آصف علی، خواجہ حسن نظامی جیسے فرزند کب پیدا ہوں گے۔

لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

خاندانی حالات اور ابتدائی تعلیم

مولانا مرحوم کا سن پیدائش ۱۳۰۶ھ ہے۔ یہ خود مولانا مرحوم نے ہی راقم الحروف کو بتایا تھا۔ فرماتے تھے کہ دن اور تاریخ معلوم نہیں مگر مہینہ ربیع الثانی کا تھا۔ ازروئے تقویم یہ دسمبر ۱۸۸۸ء کے مطابق ہے۔ یکم ربیع الثانی ۱۳۰۶ھ کو ۵ر دسمبر ۱۸۸۸ء ہوتی ہے۔ شمسی حساب سے پیدائش کا مہینہ بھی دسمبر ہے اور وفات کا بھی دسمبر اس حساب سے اکہتر سال کی عمر پائی۔ اور قمری حساب سے تہتر سال سے کچھ زائد عمر پائی۔ مولد و منشا کوچہ ناہر خاں دریا گنج دہلی ہے۔

آپ کے والد حافظ نواب مرزا زینت المساجد میں منصب امامت پر فائز تھے۔ اور کتب بھی پڑھاتے تھے۔ آپ کے دادا خواجہ نواب علی دلی شہر کے مشہور صوفی خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ آپ کے بزرگوں کو جلال الدین اکبر بادشاہ نے عرب سے کشمیر میں بلایا تھا۔ شاہجہاں بادشاہ کے زمانے میں یہ خاندان کشمیر سے آگرہ آیا۔ اور کچھ عرصے وہاں رہ کر دہلی میں منتقل ہوا۔ اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے تک کشمیری کٹرہ میں سکونت پذیر تھا۔ کشمیری کٹرہ لال قلعے کے سامنے پتھر والے کنوئیں کے میدان میں (پاری کرونگ آفس کے آس پاس) آباد تھا۔ انگریزوں نے دلی کو فتح کرنے کے بعد کشمیری دروازہ سے لے کر دلی دروازہ تک کی آبادی کو مسمار کردیا۔ اس کی زد میں یہ کشمیری کٹرہ بھی آگیا۔ آپ کے آباواجداد کو مغل دربار میں رسائی حاصل تھی اور خواجہ زادہ مغل کا خطاب عطا ہوا تھا۔

آپ نے ابتدائی تعلیم مولوی عبدالمجید مصطفیٰ آبادی سے حاصل کی۔ اور تکمیل حفظ قرآن کی دستار بندی مدرسہ حسینیہ بازار ٹیا محل میں ہوئی۔

مدرسہ حسینیہ کو ۱۳۲۲ھ-۱۹۰۴ء میں مولانا محمد حسین فقیر رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادوں مولانا محمد ابراہیم وغیرہ نے شیخ کریم بخش ساکن ترکمان دروازہ اور دیگر مسلمانوں کے چندہ سے تعمیر کیا تھا۔ وہاں مولانا محمد حسین فقیرؒ کا وعظ ہوتا تھا۔ غالباً ۱۳۲۳ھ میں ان کی وفات ہوئی تو ان کے صاحبزادے مولانا محمد ابراہیم کا وعظ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں مولانا احمد سعید کی عمر ۱۶-۱۷ برس کی ہوگی۔ آپ مولانا فقیرؒ کے اور ان کے بعد مولانا راسخ اور مولانا محمد ابراہیم کے وعظ سنتے تھے۔

مولانا فقیر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں بڑے صاحبزادے مولانا حبیب الرحمٰن اور ان سے چھوٹے مولانا عبدالرحمٰن راسخ پہلی بیوی کی اولاد تھے۔ اور دوسری بیوی کی اولاد میں مولانا محمد ابراہیم بڑے اور مولانا محمد الحق چھوٹے تھے۔ مولانا راسخ فن شعر و سخن کے بھی امام تھے اور وعظ و تقریر میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ ان کا وعظ اردو بازار کی مسجد میں بعد نماز جمعہ ہوا کرتا تھا۔ یہ مسجد اب مولانا احمد سعید کی مسجد کہلاتی ہے۔ پہلے بہت مختصر تھی۔ مولانا راسخ کے انتقال کے بعد اس میں مولانا احمد سعید کے وعظ شروع ہوئے۔ پھر مسجد کی توسیع اس

طرح ہوئی کہ پڑوسی میں ایک حاجی عبدالوہاب رہتے تھے انھوں نے اپنا آدھا مکان مسجد کو دے دیا۔ اس کو شامل کر کے مسجد کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔

غرض کہ جب آپ مولانا راسخ کے وعظ سنتے تھے چونکہ آپ کے اندر فطرۃً جوہر قابل موجود تھا، وعظ سنتے سنتے خود بھی وعظ کہنے لگے۔ علمی قابلیت حفظ قرآن سے آگے نہ تھی۔ لکھنا بھی غالباً نہیں آتا تھا۔ مدرسہ حسینیہ میں مولانا محمد ابراہیم کا اور مدرسہ حسین بخش میں مولانا کرامت اللہ خاں کا وعظ ہوتا تھا۔ مولانا کرامت اللہ خاں اگر چہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ مگر رضا خانیت کی طرف میلان زیادہ تھا دونوں حضرات اپنے اپنے وعظوں میں اختلافی مسائل بیان کرتے اور ایک دوسرے کا رد کیا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں سماع موتی کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ بڑے زور کی جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ مدرسہ حسینیہ میں تعلیم پانے والے لڑکے بھی اس قسم کے معرکوں کی نقل کر کے مناظرہ سیکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا احمد سعید مولوی محمد ابراہیم بنتے تھے اور صوفی حکیم ممتاز احمد ہاشمی (مولانا احمد سعید کے برادر نسبتی) مولوی کرامت اللہ خاں کا پارٹ ادا کرتے تھے۔ دونوں کھڑے ہو کر مناظرہ کرتے تھے۔

اُس زمانے میں وعظ و تذکیر کا طریقہ عصر حاضر سے کچھ مختلف تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں وعظ اور مولود شریف کی محفلیں منعقد کیا کرتے تھے۔ وہ محض محفلیں ہی ہوتی تھیں ان کو جلسہ نہیں کہا جاسکتا، اور غالباً لفظ جلسہ جو مفہوم اب رکھتا ہے وہ اس زمانے میں نہیں تھا۔ کیونکہ ان محفلوں کے لیے عام پوسٹر شائع نہیں کیے جاتے تھے۔ صرف محلے میں زبانی اعلان کرا دیا جاتا تھا۔ یا کچھ مسجدوں میں خاص خاص علماء کا وعظ مقرر تھا۔

شروع شروع میں مولانا کو ایسی ہی محفلوں میں بلایا جاتا تھا۔ بعد میں کوچہ چیلاں کی مسجد جو آپ مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ کی مسجد کہلاتی ہے اس میں بھی مولانا نے ہر جمعرات کو وعظ کہنا شروع کیا۔ ایک مرتبہ مولانا نے فرمایا۔

"بھئی! ہماری زندگی تو شروع سے ہی قلندرانہ زندگی ہے۔ جب ہم کسی کے گھر پر جا کر وعظ کہتے تھے تو دو روپے نذرانہ ملتا تھا۔ کچھ تار کشی کا کام کر لیتے تھے اس طرح عسرت کے ساتھ گزر بسر ہوتی تھی۔"

گوٹہ ٹھپہ وغیرہ میں جو چاندی سونے کا یا تانبہ کا ملمع شدہ تار استعمال کیا جاتا ہے۔ آج کل مشینوں سے باریک کیا جاتا ہے۔ اب سے چالیس سال قبل یہ مشینیں نہیں آئی تھیں۔ دو چرخیاں ہوتی تھیں جو ایک چوکی پر لگی ہوتی تھیں۔ بائیں ہاتھ کی چرخی پر تار لپٹا ہوا ہوتا تھا۔ دائیں ہاتھ کی چرخی کو ایک فولادی کیل کے ذریعے ہاتھ سے گھمایا جاتا تھا۔ بیچ میں بارہ لگا ہوتا تھا۔ تار اس میں سے کھینچا ہوا دائیں ہاتھ کی چرخی پر منتقل ہوتا تھا بارہ ایک گول ٹکلی چپٹی کی بنی ہوئی ہوتی ہے جس کے بیچ میں ہیرے وغیرہ کا چھوٹا سا سوراخ دار جوئل ہوتا ہے اس میں سے تار کو نکال کر کھینچتے اور باریک کرتے ہیں۔ غرض کہ یہ محنت طلب طریقہ تھا تار کشی کا۔ اور آپ کے والد بھی یہ کام کرتے تھے۔ مولانا کا نو عمری کا زمانہ تھا جبکہ آپ کے والد کی وفات ہوگئی اور متعلقین کی کفالت کا بار آپ کے ہی کندھوں پر آگیا۔

مناظروں کا دور

ہندوستان پر جب انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو انھوں نے ایک طرف تو عام مذہبی آزادی کا اعلان کیا۔ دوسری طرف یہ کیا کہ سیاسی اثر ڈالنے کے لیے انگریزی کالج کھولنے شروع کیے اور ان میں اپنی مرضی کا نصاب تعلیم رائج کیا۔ اور مذہبی و دینی حیثیت سے ذہنوں کو مسخ کرنے کے لیے عیسائی مشن بھیجنے شروع کیے۔ تبدیل مذہب کے لیے ان کا طریقہ یہ تھا کہ روپے اور نوکریوں اور لڑکیوں کا لالچ دے کر عیسائی بناتے تھے۔ اور اس مہم پر کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ ہوتا تھا۔ قابل اور مستعد پادری ہندوستان میں آکر اردو کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اردو میں تقریر کرنے کی مشق کرتے تھے اور عام مجمعوں میں اسلام پر اعتراضات کرتے تھے اور خوب کیچڑ اچھالتے تھے۔ علماء اسلام نے جوابی تقریریں شروع کیں اور مناظروں کا دور شروع ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں علماء اسلام پر جو بیتی اس کی

داستان بڑی درد انگیز ہے۔ تاریخ کے اوراق اس کے گواہ ہیں کہ حکومت متسلطہ نے ان کو بالکل پیس ڈالا تھا۔ اور صدیوں تک کے لیے ابھرنے کی سکت نہ چھوڑی تھی۔ انگریزی بڑی دانا قوم ہے۔ وہ جانتے تھے کہ جتنی قوت وشدت سے ان کو برباد کیا گیا ہے یہ اتنی ہی قوت سے ابھریں گے۔ اور ممکن ہے کہ جلد ہی ابھریں پادریوں کو بھیج کر ان کو مناظرے میں الجھادیا۔ بہر حال اس یورش کا مقابلہ کرنا علماء کا ایک اہم فریضہ تھا۔ انھوں نے پوری جواں مردی وہمت سے اس فتنے کا مقابلہ کیا۔ پادریوں سے مقابلہ ہو ہی رہا تھا کہ آریوں نے بھی وار کرنے شروع کر دیے۔ اور کچھ عرصے کے بعد ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی۔ پادریوں اور پنڈتوں سے عوام بھڑکتے تھے۔ کیونکہ وہ غیر مذہب کے لوگ تھے۔ اور پادری تو ویسے بھی سات سمندر پار سے آئے تھے۔ اس لیے تبدیل مذہب میں کچھ نمایاں کامیابی نہ ہوئی۔ اب اسلام کی گود میں ہی پرورش پایا ہوا ایک سورما نمودار ہوا۔ جس نے پہلے مجددیت کا اور پھر پیغمبری کا دعویٰ کیا۔ اور اسلام کی تبلیغ کے عنوان سے بغلی گھونسہ بن کر ہزاروں مسلمانوں کو مرتد کر کے سلطنت برطانیہ کا وفادار بنایا۔ (عیسائی مشنریوں کی مکمل تاریخ کتاب "فرنگیوں کا جال" مصنفہ مولانا امداد صابری کے صفحات پر ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہے)

علماء ان طوفانوں کا مقابلہ بھی کر رہے تھے اور استخلاص وطن کی جدوجہد میں بھی مصروف تھے۔ ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اتفاق واتحاد کی فضا ہموار ہو چکی تھی کہ انگریزوں نے ایک اور بھرپور وار کیا۔ یعنی ۱۹۲۲ء میں شدھی کا طوفان بڑے زور شور سے اٹھا اور اس نے ہندو مسلم اتحاد کے ٹکڑے اُڑا دیئے۔ غرض کہ علماء کو اس طوفانی عہد سے واسطہ پڑا تھا۔ استخلاص وطن کی جدوجہد کے ساتھ اسلام اور شعائر اسلام کی حفاظت کے لیے بھی چومکھی لڑ رہے تھے۔

انیسوی صدی عیسوی کے اوائل میں چاندنی چوک بازار میں کوتوالی کے سامنے فورہ نارتھ بروک کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر عیسائی پادری تبلیغی تقریریں کیا کرتے تھے۔ (اب فوارہ کی سیڑھیاں توڑ دی گئی ہیں اور سڑک کی سطح بھی اونچی ہو گئی ہے۔) عیسائیوں میں سے زیادہ تر احمد مسیح اور ہندوؤں میں سے زیادہ تر پنڈت رام چندر لکچر دیتے تھے۔ سرکاری پابندی کے مطابق ایک دن ایک ہی فرقے کے مقرر لکچر دے سکتے تھے۔ علمائے اسلام کے لیے بھی ایک دن مقرر تھا۔ اس قسم کی تقریریں گھنٹہ گھر کے نیچے بھی ہوتی تھیں۔ اور ان میں مولانا اشرف الحق (مولانا امداد صابری کے والد جو صاحب حال وقال بزرگ تھے اور مولوی لٹھ کے خطاب سے مشہور تھے) اور مولوی حفیظ اللہ خاں اور دیگر علماء حصہ لیا کرتے تھے۔ یہ اجتماعات بالعموم شام کے وقت ہوتے تھے۔

عربی تعلیم کی ابتداء

غالباً ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۰ء تک کا زمانہ تھا جبکہ مولانا کی عمر بیس بائیس برس کی ہوگی۔ آپ بھی کبھی کبھی فوارہ پر تقریر کرتے تھے۔ سامنے نواب روشن الدولہ کی سنہری مسجد میں مدرسہ امینیہ تھا۔ اور حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ اس کے صدر مدرس تھے۔ مدرسے کے طلبہ بھی ان تقریروں میں آکر کھڑے ہو جاتے تھے۔ انھیں میں سے حضرت مفتی اعظمؒ کے ایک ہونہار ذی استعداد اور منتہی شاگرد مولانا قاری حافظ محمد یاسین سکندر آبادی بھی تھے۔ یہ مدرسہ حسینیہ میں بھی کبھی کبھی چلے جاتے تھے اور مولوی احمد سعید سے واقف تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے ایک مرتبہ مولانا احمد سعید کی تقریر کی تعریف سنی تو اپنے شاگرد سے کہا کہ اس نوجوان واعظ سے کسی وقت پوچھنا کہ اس نے کہاں پڑھا ہے اور کہاں تک پڑھا ہے؟ قاری صاحب موصوف وعظ میں شریک ہوتے ہی تھے ختم ہونے پر نوجوان واعظ کے ساتھ ہولیے۔ راستے میں پوچھا کہ مولوی صاحب! آپ نے کہاں پڑھا ہے؟ قاری صاحب موصوف ایک طالب علم تھے اور نوجوان واعظ کو کم سے کم دارالعلوم دیوبند کا فاضل ترین فیض یافتہ خیال کرتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی محسوس نہیں کیا تھا کہ استاد محترم نے یہ خدمت کیوں میرے سپرد کی ہے؟

غرض کہ مولانا نے قاری صاحب کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھا دیا اور اصل بات کا جواب نہیں دیا۔ دوسرے دن پھر پوچھا مگر بات کو پھر ٹال دیا گیا۔ وہ ٹالتے رہے وہ پوچھتے رہے اور آخر نوجوان

واعظ نے ایک دن یہ جواب دیا کہ "مولوی صاحب آپ یہ بات پوچھتے ہیں تو مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ کہیں پڑھا ہو تو بتاؤں۔ بھئی میں نے تو کہیں نہیں پڑھا اور کچھ نہیں پڑھا۔ البتہ پڑھنے کی آرزو ہے۔" قاری صاحب موصوف کو یقین نہیں آیا۔ لیکن کچھ عرصے میں تعلقات بڑھے۔ زیادہ میل جول ہوا تو قاری صاحب کو معلوم ہو گیا کہ واقعی یہ اَن پڑھ ہیں۔ پھر انھوں نے مولانا کو رائے دی کہ آپ مدرسہ امینیہ میں داخلہ لے لیجیے اور علم حاصل کیجئے۔ مولانا نے کہا کہ بھئی مولوی صاحب! میں کیونکر پڑھ سکتا ہوں۔ والد کے انتقال کے بعد سے گھربار کا سارا بوجھ مجھ پر ہے۔ شادی بھی ہو چکی ہے۔ دن بھر محنت کرتا ہوں جب کہیں جاکر کام چلتا ہے اور آذوقہ نصیب ہوتا ہے ان حالات میں داخلہ لے کر پڑھنے کی فرصت کہاں؟

مگر اُن کو پڑھانا اور ان کو پڑھنا مقدر تھا۔ قاری صاحب نے اپنے استاد محترم سے اجازت لے کر مولانا کے گھر جاکر رات کے وقت پڑھانا شروع کر دیا۔ مگر چونکہ اس صورت میں قاری صاحب کا حرج ہوتا تھا وہ خود بھی پڑھتے تھے۔ اس لیے مولانا سنہری مسجد میں ہی جاکر رات کو ان سے پڑھنے لگے۔ ہوتا یہ تھا کہ دن میں مولانا مال تیار کر کے شام کو فتحپوری بازار کے دوکانداروں کو دیتے ہوئے سنہری مسجد میں آجاتے تھے۔ اور سبق پڑھ کر گھر جاتے تھے۔ ایک سال تک قاری صاحب نے ان کو پڑھایا اور جب ابتدائی کتابیں نکلوا چکے تو باضابطہ مدرسہ امینیہ میں داخلہ کر دیا۔ یہ مولانا محمد یاسین وہی ہیں جن کو حضرت مفتی اعظمؒ نے رائے پور (سی۔ پی) میں بھیج دیا تھا۔ آپ نے وہاں مدرسہ اسلامیہ قائم کیا۔ اور آخر دم تک اس کے مہتمم و صدر مدرس رہے۔ اور جمعیۃ علمائے سی۔ پی کے صدر بھی رہے۔ اور یہ واقعہ مجھے قاری صاحب موصوف نے خود ہی سنایا تھا۔

مدرسے میں مولانا کا داخلہ شوال ۱۳۲۸ھ میں ہوا۔ اور شرح ملۂ عامل مفید الطالبین وغیرہ اسباق شروع ہوئے مولانا کی سند میں مندرجہ ذیل کتابیں درج ہیں:

تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، صحاح ستہ اور مشکوٰۃ شریف، نخبۃ الفکر، قدوری، کنز الدقائق، شرح وقایہ، ہدایہ اولین، ہدایہ اخیرین، اصول الشاشی، نورالانوار، توضیح تلویح، ایسا غوجی، مرقاۃ، شرح تہذیب، قطبی، ملاحسن، حمد اللہ، مناظرہ رشیدیہ، ہدایہ سعیدیہ، میبذی، مختصر المعانی، مطول، شرح ملۂ عامل، ہدایۃ النحو کافیہ، شرح جامی، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، قلیوبی، سبعہ معلقہ، دیوان متنبی۔

مولانا فرماتے تھے کہ مدرسے کے علاوہ میں نے خارج وقت میں کچھ گھر پر کچھ مدرسے میں حضرت مفتی صاحب سے اور بھی کتابیں پڑھی ہیں۔ راقم الحروف کو ان کتابوں کے نام بھی بتائے تھے۔ ان میں سے صرف فتح الباری کا نام یاد ہے جس کا آخری پارہ ملتان جیل میں پڑھا۔ مولانا کے دیگر اساتذہ حضرت مولانا حافظ محمد ضیاء الحق دیوبندی مرحوم مولانا محمد قاسم دیوبندی مرحوم، مولانا سید انظار حسین سہسپوری مرحوم وغیرہ تھے۔

مدرسے میں باضابطہ داخلہ کے بعد تارکشی کا کام چھوٹ گیا تھا۔ اور وعظ و تبلیغ کے نذرانوں سے ہی گزر بسر ہوتی تھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حضرت مفتی صاحب کے حکم سے وعظ کا نذرانہ لینا بالکل بند کر دیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد کٹرہ ہدو محلہ فراش خانہ کی مسجد میں آپ نے ترجمہ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ روزانہ صبح کو آپ وہاں جاکر ترجمہ بیان کرتے تھے۔ وہاں سے مبلغ ساٹھ روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ شروع میں سواری کے لیے ڈولی کا انتظام تھا۔ آپ ڈولی میں جایا کرتے تھے۔ پہلے زمانے میں مردوں کی سواری کے لیے بغیر پردے کی ڈولی یا یکے ہوتے تھے۔ اور عورتوں کے لیے پردہ دار ڈولی، تانگہ بعد میں ایجاد ہوا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد آپ نے یکہ خرید لیا تھا۔ یہ ایک ترجمہ غالباً چودہ برس میں مکمل ہوا۔

قرآن شروع کا ترجمہ بیان کرنے کا رواج پہلے زمانے میں کچھ زیادہ نہیں تھا۔ غالباً صرف ایک جگہ یعنی مسجد نواب قاسم جان میں مولانا راسخ ترجمہ بیان فرماتے تھے۔ ان سے پہلے نواب قطب الدین خاں مصنف مظاہر حق کا نام سنا جاتا ہے۔

سرکار نظام سے مولانا کو مبلغ ۱۲۵ روپے ماہانہ کا منصب بھی عطا ہوا تھا۔ جو کئی برس تک جاری رہا۔ مگر تحریک خلافت میں کھلم کھلا حصہ

لینے کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ جب آپ پہلی مرتبہ ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہو کر دہلی کے دوسرے سیاسی قیدیوں مثلاً مولانا عبداللہ چوڑی والے وغیرہ کے ساتھ میانوالی جیل میں بھیج دیئے گئے تھے تو شہر دہلی کے بعض متمول حضرات نے آپ کے اہل وعیال کے لیے کچھ وظائف مقرر کردیئے تھے۔ بھائی حاجی نذیر احمد میرٹھی وہ وظائف وصول کر کے گھر پہنچادیا کرتے تھے۔

عربی تعلیم سے فراغت

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مولانا کو حضرت مفتی صاحب نے بطور معین مدرس کے مدرسے میں مقرر کیا۔ اور کچھ ابتدائی کتابیں پڑھانے کے لیے دے دیں۔ اکابر مدرسہ کا معمول تھا کہ جو طلبہ ذی استعداد ہوتے تھے ان کو تعلیمی ٹریننگ دینے کے لیے مدرسے میں ابتدائی درجوں کا مدرس بنادیا جاتا تھا۔ یہ بالعموم بلا تنخواہ ہوتے تھے۔ اور جب کسی مدرس کی جگہ خالی ہوتی تھی تو مدرسے میں ہی ان کو باضابطہ منصب مل جاتا تھا۔ یا ایسا ہوتا تھا کہ ضرورت مدرس کے متعلق کوئی خط کہیں سے آتا تھا تو ٹرینڈ معین مدرس کو وہاں بھیج دیا جاتا تھا۔ اس قسم کے معین مدرس سب سے پہلے مولانا حافظ قاری محمد یاسین سکندر آبادی تھے۔ ان کے بعد مولانا حافظ حکیم محمد ابراہیم راندیری۔ مولانا مفتی حافظ سید مہدی حسن شاہجہانپور مولوی عبدالسنان آروی، مولانا مفتی محمد عبدالغنی صدر مدرس و صدر مفتی مدرسہ امینیہ۔ مولوی مشتاق احمد دہلوی۔ مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ علمائے ہند۔ اور بہت سے حضرات کے نام مدرسے کی رودادوں میں ہیں۔

مولانا کئی سال تک مدرسے کی تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے اور ایک مربی کامل کی نگرانی میں یہ جوہر قابل جلا پاتا رہا۔ وہ علمی خزانہ جو اندر بھرا جا چکا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اب مولانا کی تقریر اُڑائی ہوئی تقریر نہ تھی بلکہ ٹھوس مدلل مربوط ہونے کے ساتھ زبان کی لطافت وشیرینی اور فصاحت و بلاغت کا اُمنڈتا ہوا دریا تھا۔

مناظرے کی تربیت

یہ مناظروں کا دور تھا۔ اس دور میں مولانا نے زبردست اور معرکۃ الآرا مناظرے کیے۔ اس وقت آریوں میں بھی بڑے بڑے فاضل مناظر اور خطیب موجود تھے۔ پنڈت رام چندر دہلوی کا نہ صرف دہلی میں بلکہ ہندوستان بھر میں طوطی بول رہا تھا۔ قرآن مجید عمدہ پڑھتا تھا۔ اور بڑا طرار ولستان تھا۔ مولانا نے اس سے بھی مناظرے کیے۔ اور مولانا کی خطابت سب پر غالب رہی۔

مناظروں کے لیے پنڈال بنائے جاتے تھے۔ تیس چالیس ہزار تک کا مجمع ہوتا تھا۔ دور دور کے شہروں سے لوگ سننے کے لیے آتے تھے۔ آمنے سامنے دو اسٹیج اتنے فاصلے پر بنائے جاتے کہ ایک اسٹیج پر بولنے والے کی آواز دوسرے اسٹیج تک پہنچ جائے۔ لاؤڈ اسپیکر اس زمانے میں نہیں تھا۔ بیچ میں اور چاروں طرف مجمع ہوتا تھا۔ اسٹیج پر دو آدمی بیٹھتے تھے۔ ایک مناظر اور ایک معاون مناظر کی رہنمائی اور امداد کرتا رہتا تھا۔ اس کو ضروری نکات یاد دلاتا تھا۔ کتابوں کے حوالے نکالتا تھا۔ مناظر کھڑا ہو کر بولتا تھا۔ اسی طرح باری باری سے دونوں مناظر تقریر کرتے تھے۔

مولانا احمد سعید جب مناظرہ کرتے تھے تو ان کے معاون حضرت مفتی اعظمؒ ہوتے تھے۔ یاد رہے کہ خود حضرت بھی اپنے ابتدائی عہد میں زبردست مناظر تھے۔ آپ نے ۱۳۲۱ھ میں شاہجہانپور سے ایک ماہانہ رسالہ بھی جاری کیا تھا جس کا نام البرھان تھا۔ اس میں قادیانیت کا رد کیا جاتا تھا۔

مولانا احمد سعید کی شیریں بیانی اور حضرت مفتی صاحب کی اعانت گویا سونے پر سہاگہ تھا۔ اس طرح مولانا نے بڑے بڑے میدان جیتے۔ ان مناظروں نے مولانا کے انداز بیان کو نقطۂ کمال پر پہنچادیا تھا۔ مولانا کی ظرافت مناظرے میں بھی اپنا رنگ دکھاتی اور مجمع کو ہنساتی تھی۔

ایک مرتبہ پنڈت مراری لال سے مناظرہ ہوا۔ آپ نے دوران تقریر میں کہا کہ "پنڈت جی! میں سنسکرت سے واقف نہیں ہوں۔ آپ کے نام میں مجھے غلط فہمی ہو رہی ہے۔ آپ کا نام میم کے پیش سے ہے یا زبر سے؟

ایک مرتبہ پنڈت رام چندر دہلوی سے مناظرہ ہو رہا تھا۔ پنڈت

جی نے کہا "مولوی جی! یہ دلیل ہے دلیل تانبے یا چاندی کا تار نہیں ہے۔ جس کو آپ کھینچ تان کر بڑھالیں اور اپنے مطلب کا بنالیں۔ یہ دلیل ٹس سے مس نہ ہوگی۔" مولانا نے اپنی باری پر فرمایا۔ "پنڈت جی! میری دلیل برہان قطعی ہے۔ یہ سونے کی ڈلی نہیں ہے فولاد ہے۔ یہ آپ کی کھٹ کھٹ سے نہیں پچکے گی۔ (واضح ہو کہ پنڈت جی سنار کا کام کرتے تھے) ایک مناظرہ میں جو چاوڑی بازار دہلی میں ہوا تھا۔ پنڈت رام چندر نے سوال کیا کہ ارادہ کی تعریف کیا ہے؟ مولانا چونکہ معقولات میں بھی اور علم کلام میں بھی کچھ کمزور تھے۔ کھڑے ہونے سے پہلے حضرت مفتی صاحب سے دریافت کیا۔ مفتی صاحب نے اس سوال کی گہرائی بتائی اور جواب تعلیم فرمایا۔ پنڈت جی بولے۔ "ہاں! خوب کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ مولوی جی! بالکل خالی ہو گیا؟ مولوی کفایت اللہ سے پوچھ کر جواب دوگے؟ مولانا نے فوراً جواب دیا۔ انھیں کی جوتیوں کا صدقہ ہی تو ہے کہ میں ڈٹ کر تمھارا مقابلہ کر رہا ہوں اور سامنے کھڑا ہوا بول رہا ہوں۔ ان سے نہیں پوچھوں گا تو اور کس سے پوچھوں گا؟ یہ میرے استاد ہیں۔ استاد سے پوچھنے میں تمھیں شرم آتی ہوگی۔ میرے لیے تو ان سے پوچھنا باعث فخر ہے۔

ایک مناظرے میں مقابل نے کہا کہ "تم کہتے ہو، پیغمبر صاحب پر جبریل کے ذریعے سے وحی آتی تھی۔ تو معلوم ہوا کہ وحی کے لیے واسطے اور ذریعے کی ضرورت تھی۔ مگر ہمارے رشیوں کے ہردے پر بلا واسطہ القا ہوتا تھا۔" حضرت مفتی اعظمؒ نے صرف اتنا فرمایا کہ "ہردے خود ایک واسطہ اور ذریعہ ہے" یہ اشارہ پاکر اس رہنمائی کی بنیاد پر مولانا کھڑے ہو کر جو تقریر کی ہے تو لوگ عش عش کر گئے۔ اور مقابل کو لاجواب ہونا پڑا۔

ایک اور مناظرے میں مقابل نے حضرت مفتی صاحب کی رہنمائی پر تعریض کی تو مولانا نے فرمایا کہ "پنڈت جی! جو کچھ ہے استاد کا فیض ہے۔ میری تقریر میں تو زبان میری ہے۔ دماغ استاد کا ہے۔"

مستند بغیر سند

شوال ۱۳۳۱ھ سے مولانا بطور معین مدرس کے مدرسہ امینیہ میں پڑھا رہے تھے۔ اور خود بھی پڑھ رہے تھے۔ شعبان ۱۳۳۶ھ میں مدرسے سے اپنی تعلیم ختم کر کے فارغ ہوئے۔ مگر چونکہ ملازمت کے لیے کہیں جانا نہیں تھا اس لیے مدرسہ کی مطبوعہ سند حاصل کرنے کا خیال نہیں آیا۔ ۱۹۴۲ء میں جبکہ مسلم لیگ والوں سے نیشنلسٹ مسلمانوں کی کشتی پھنسی ہوئی تھی یہ خبر بڑے زور سے اڑائی گئی کہ مولانا سندیافتہ عالم نہیں ہیں۔ اب مولانا کو سند حاصل کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ سند لینے کی تاریخ ۱۵ر محرم ۱۳۶۱ھ مطابق ۲ر فروری ۱۹۴۲ء ہے۔ سند میں جو کتابیں درج ہوئی ہیں ان میں منیۃ المصلی اور شرح عقائد کا نام نہیں ہے۔ مگر ریکارڈ میں ان دونوں کتابوں کا نام موجود ہے۔

سیاسی وملی خدمات

۱۹۱۹ء میں حضرت مفتی اعظمؒ نے جمعیۃ علمائے ہند کے قیام و تاسیس کے لیے دیگر علمائے ہند سے جو مذاکرت فرمائے ان میں آپ کے دست راست اور رفیق کار مولانا احمد سعید ہی تھے جو ہر ایک کام میں اور ہر ایک مجلس میں شریک رہتے تھے۔ مدرسہ امینیہ میں حضرت مفتی اعظمؒ کا جو خاص کمرہ تھا اسی میں پہلا دفتر قائم ہوا۔ اور وہیں بیٹھ کر یہ دونوں استاد شاگرد اس کے تمام ابتدائی امور انجام دیتے تھے۔ ہندوستان بھر کے تمام علماء کی مکمل فہرست مفتی صاحبؒ نے اپنے دست مبارک سے تحریر فرمائی۔

ان حضرات کی تحقیق و تلاش اور محنت و کاوش قابل ستائش ہے۔ کشمیر سے راس کماری تک اور یاغستان سے برما تک کے نہ صرف شہروں اور قصبوں سے بلکہ ہر ایک چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں سے گوشہ نشین اور گمنام علماء کا کھوج نکالا اور سب کو لا کر ایک پلیٹ فارم پر جمع کردیا۔ یہ کام نہ صرف محنت طلب تھا بلکہ خطرناک بھی تھا۔ برٹش امپائر کے خلاف لب کشائی کرنا اس وقت جان کی بازی لگانا تھا۔ عوام تو عوام بیشتر علماء کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا تھا کہ اب انگریزوں کی حکومت سے کبھی چھٹکارا نہیں ملے گا۔

مدرسہ امینیہ میں ہمارے اساتذہ میں سے ایک عالم باعمل حضرت مولانا حافظ محمد عبدالغفور صاحب عارف دہلوی بھی تھے۔

کوچہ رحمٰن میں رہتے تھے۔ فارسی کے مدرس اور نائب مہتمم تھے۔ عمر میں حضرت مفتی صاحبؒ سے بڑے تھے۔ مفتی صاحبؒ نے جب آزادی کی تحریکات میں حصہ لینا شروع کیا تو اکثر وہ جھگڑتے تھے۔ فرماتے تھے کہ دیکھو مولوی کفایت اللہ! تم بے کار کام کر رہے ہو۔ مسلمانوں کو الجھاؤ میں ڈال رہے ہو۔ یہ سیاسی لیڈر سب پاگل ہیں۔ آزادی وازادی اب نہیں ملے گی۔ ان انگریزوں کو تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی آکر پار لگائیں گے۔ تم خواہ مخواہ مصیبت میں پڑتے ہو۔

ایسی ہی مایوسانہ کیفیت تھی جو ۱۸۵۷ء کی دارو گیر کے بعد علماء پر بھی طاری تھی جس کی وجہ سے علماء گمنامی و گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور حال یہ تھا کہ ایک صوبہ کے علماء کو دوسرے صوبہ کے عوام تو عوام خواص بھی نہیں جانتے تھے۔ ان علماء کا فیض اپنے اپنے شہروں اور خاص خاص حلقوں میں محدود تھا۔ لیکن جمعیۃ علماء کے رشتے میں منسلک ہونے کے بعد تمام ہندوستان و برما کے علماء مثل ایک خاندان کے ہوگئے۔ اور ان کی فیض رسانی نے بہت وسعت اختیار کرلی۔ (اُس زمانے میں ملک برما بھی غیر منقسم ہندوستان کے ساتھ شامل تھا)

آفریں ہے اُن اولوالعزم لوگوں کی ہمت پر جو اپنی ان تھک کوشش اور محنت وجاں فشانی سے اتنے عظیم انشان ادارے تخلیق کر گئے۔ رسل ورسائل کی وسعت آج جتنی ہے پہلے اتنی نہ تھی۔ اس زمانے میں گوشہ نشین علماء کو چھپے چھپے سے تلاش کر کے لانا۔ روشناس کرانا۔ مختلف الخیال اور متفرق المسلک علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دینا بہت بڑا کام تھا۔ جس کا سہرا کارکنان قضاؤ قدر نے حضرت مفتی اعظمؒ اور ان کے دست راست و رفیق کار مولانا احمد سعید اور مولانا ابوالحسنات عبد الباریؒ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ، مولانا آزاد سبحانی وغیرہ ہم کے لیے مخصوص کرر کھا تھا۔ پھر تمام علماء نے جمعیۃ کو چلانے اور آگے بڑھانے کا عملی کام باتفاق رائے اول الذکر حضرات کے سپرد کیا۔ یہی کام سب سے زیادہ مشکل اور اہم تھا۔ ان حضرات نے کس طرح اس کو چلایا؟ آج اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ چہ جائے کہ کوئی عملی نمونہ پیش کرنا۔

سرمد غم عشق بوالہوس راند ہند
سوز دل پروانہ مگس راند ہند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار
ایں دولت سرمد ہمہ کس راند ہند

بے لوث خدمت اور اَن تھک محنت

ملک میں دورے کر کے جماعت کو روشناس کرانا۔ اس کی سیاسی ضرورت و اہمیت کو عوام کے ذہنوں میں جاگزیں کرانا۔ اس کے چلانے کے لیے مالی اعانت پر مسلمانوں کو تیار کرنا۔ لیڈروں سے سیاسی مذاکرے اور اشتراک عمل کرنا۔ ان ذمہ دارانہ کاموں کے ساتھ خود ہی دفتر کے کاروبار کو بھی چلانا۔ آمد و خرچ کا حساب کتاب رکھنا۔ لکھنا مرتب کرنا۔ تمام ہند اور بیرون ہند کے علماء واکابر سے خط و کتابت اور ربط قائم رکھنا۔ ڈاک تیار کرنا۔ رجسٹر پر چڑھانا، ڈاکخانہ کا کام انجام دینا وغیرہ۔ یہ تمام کام اوران کے ملحقات۔ اور بس صرف دو آدمی، نہ کوئی محرر نہ چپڑاسی، مولانا احمد سعید نے ایک مرتبہ فرمایا کہ "میاں مفتی صاحب! دفتر جمعیۃ کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے اس طرح چلایا ہے کہ حضرت تو حساب کتاب لکھتے تھے اور میں ڈاک تیار کر کے خود ڈاکخانہ لے جاتا تھا۔"

میاں حفیظ الرحمان!

واضح ہو کہ مولانا جب حضرت مفتی اعظمؒ کے مکان پر تشریف لاتے تھے تو ہمیشہ میاں حفیظ الرحمان کہہ کر پکارتے تھے۔ اب آخر میں ان کے مکان پر جب میں حاضر ہوتا تھا تو میاں مفتی صاحب کہتے تھے۔ لیکن وہ وضع داری اب بھی قائم تھی۔ یعنی حضرت موتی اعظمؒ کی وفات کے بعد بھی جب کبھی مکان پر تشریف لے جاتے، میاں حفیظ الرحمٰن کہہ کر ہی آواز دی۔ اور خدا گواہ ہے کہ اس انداز خطاب اور طرز ندائے روح کو جو مسرت ہوتی تھی وہ کسی بڑے سے بڑے خطاب سے نہ ہوتی تھی۔ آج میاں حفیظ الرحمان کہہ کر پکارنے والا خاموش ہے اور کان اس کی آواز کے منتظر ہیں۔

حضرت کے مکان پر آنے والے اور میاں حفیظ الرحمان کہہ کر

پکارنے والے ایک تو مولانا مرحوم تھے۔ دوسرے بھائی اکرام ہیں (اللہ ان کو سلامت رکھے) اول الذکر اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مؤخرالذکر کی آمد و رفت ۱۹۳۹ء میں صدارت عظمٰی کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ یعنی حضرت مفتی اعظمؒ جمعیۃ کی صدارت سے ہٹ گئے تو قاضی اکرام الحق صاحب کا آنا جانا بھی بند ہوگیا۔ اور شاید کبھی آئے بھی ہوں تو میاں حفیظ الرحمان کہہ کر نہیں پکارتے۔

اے دل کی واردات لکھنے والے قلم! ذرا تھم تو سہی! یہ صریر خامہ ہے یا کسی کی پکار ہے؟ سُن! یہ روح کو جگانے والی آواز کس کی ہے؟ میں لکھتے لکھتے تصور کی دنیا میں جا پہنچا۔

اُڑا جاتا ہے دل بھی روح کے ساتھ
تری آواز آتی ہے کہیں سے

(واصف)

مولانا نے میاں حفیظ الرحمان! کہہ کر آواز دی ہے۔ والد مرحوم نے حفیظ الرحمان کہہ کر پکارا ہے فرماتے ہیں مولوی صاحب کو بیٹھک میں بٹھاؤ! میں نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا ہے۔ داخل ہو رہے ہیں اور فرماتے ہیں میاں! تمھارے باوا کیا کر رہے ہیں؟ میں نے کہا چائے بنا رہے ہیں فرماتے ہیں میاں! تو ہم کو چائے نہیں پلاؤ گے؟ اتنے میں حضرت خود چائے لے کر آگئے ہیں۔ اور پھر دونوں ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہے ہیں اور مجھ کو بھی مولانا نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا ہے۔

اب ہم حضرت مفتی اعظمؒ کے متین اور باوقار چہرے کو اور مولانا کے ہنستے ہوئے چہرے کو یاد کیا کریں گے۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکے یا نہ ٹپکے دل کی آنکھیں خون کے آنسو برساتی رہیں گی۔

سیاسی تحریکات

غرضکہ جمعیۃ علماء کے قیام کے بعد ملک میں سیاسی تحریکات نے زور پکڑا۔ رولٹ بل کے خلاف برہمی جو خلافت کی تحریک کے نام سے مشہور ہے اس میں جمعیۃ علمائے ہند کی زیر قیادت بھی مسلمانوں نے نمایاں حصہ لیا۔ اس وقت ہندو مسلمانوں کا اتحاد نقطہ کمال تک پہنچا ہوا تھا۔ جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے بھی علماء اور عوام بے دھڑک جیلوں کو بھر رہے تھے۔ مولانا احمد سعید ان تحریکات کے سلسلے میں سب سے پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہو کر میانوالی جیل میں رہے۔ ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۲ء کو رہائی ہوئی۔ ان تمام تحریکات آزادی میں مولانا کو آٹھ مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ ۱۹۳۰ء کی تحریک میں اور پھر ۳۲ء کی تحریک میں حضرت مفتی اعظمؒ کے ساتھ گجرات جیل میں اور پھر ملتان جیل میں بھی رہے۔

۱۲ فروری ۱۹۲۲ء کو جبکہ گاندھی جی نے بمقام باردولی سول نافرمانی کی تحریک کو معطل کردیا، انگریزوں کو بڑی حد تک سکون نصیب ہوا۔ مگر ہندو مسلم اتحاد کی فضا قائم تھی اور انگریزوں کے دل میں یہ ڈگدا رہتا تھا کہ اگر یہ دونوں متحد ہو کر پھر کوئی تحریک شروع کردیں گے تو اب کے حکومت برطانیہ کی چولیں ہی ہل جائیں گی۔ اور عزت سنبھالنی مشکل ہوجائے گی۔

شدھی کا زمانہ

"چنانچہ جب گورنمنٹ نے ہندو مسلمانوں کے مشترک جلوسوں اور جلسوں کو دبانا چاہا تو اس کے خلاف بلوے ہوئے۔ اور ہندو مسلمان اور زیادہ متحد ہوگئے۔ اور یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ چورا چوری کے واقعہ کے بعد ۱۹۲۲ء میں وائسرائے نے ترک موالات کے ایک بڑے ہندو لیڈر سوامی شردھانند کو جو اس وقت جیل میں تھے بُلا کر گفتگو کی۔ اور اس گفتگو کے بعد جو صیغۂ راز میں رہی ان کو رہا کردیا گیا۔ اس کے بعد ہی شردھانند نے شدھی کا کام شروع کردیا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر مونجے نے سنگھٹن قائم کی جو خالص ہندوؤں کی جماعت تھی۔ شدھی اور سنگھٹن چونکہ کانگریسی لیڈروں کے ہاتھوں شروع ہوئیں۔ اس لیے ملک میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں اور بدگمانیاں ہونے لگیں۔ اسی زمانے میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس علی گڈھ میں میاں سر فضل حسین وزیر تعلیم پنجاب نے اپنے خطبہ صدارت میں مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ اچھوتوں میں اسلام کی تبلیغ کریں۔ اس پر اخبار البشیر اٹاوہ نے اعتراض کیا کہ اس تعلیمی جلسے کے مقاصد و قواعد کے خلاف ایک سرکاری عہدہ دار

نے ایک مذہبی مسئلہ کیوں چھیڑا۔ اور اس پر اپنے شبہ کا اظہار کیا۔ بالآخر یہ شبہ صحیح نکلا۔ کیونکہ فوراً ہی ہندو مسلمانوں کی طرف سے ملک میں شدھی اور تبلیغ کا دور دورہ ہو گیا۔ اور پھر جو ہندو مسلم بلوے شروع ہوئے تو انھیں کوئی قوت روکنے والی نہ تھی۔" (روشن مستقبل)

جمعیۃ علمائے ہند کی تاریخ میں یہ عہد بے انتہا نازک اور آزمائشی عہد تھا۔ ادھر تو ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد جس کے لیے ہندوستان کی تمام قوموں کا متحد ہونا ضروری تھا۔ دوسری طرف مسلمانوں کو ارتداد سے بچانا۔ غرض کہ انگریز کا یہ ایک ایسا بھرپور وار تھا جس نے پورا کام کیا اور ملک کی آزادی پچیس برس کے لیے مؤخر ہو گئی۔ اس وقت اکابر جمعیۃ کا فہم و تدبر سخت آزمائش میں تھا۔ ملک کے چپّے چپّے پر ہندو مسلمانوں میں فساد اور خوں ریزی ہو رہی تھی۔ اللہ رب العزت ان اکابر کی روحوں پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے جنھوں نے ارتداد اور رشدھی کا مقابلہ بھی پوری جواں مردی عالی ہمتی اور عزم راسخ کے ساتھ کیا اور وطن کی آزادی کے لیے بھی لڑتے رہے۔ خدا رحمت کند آں عاشقانِ پاک طینت را۔

تبلیغی وفود

سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک ملکانوں کے علاقے سے شروع کی تھی۔ اور ہزارہا ملکانوں کو مرتد کر دیا تھا۔ اس زمانے میں حضرت مفتی اعظمؒ جمعیۃ علماء ہند کے صدر اور مولانا احمد سعید ناظم تھے۔ حضرت نے جمعیۃ علماء کی طرف سے بھی اور مدرسہ امینیہ کی طرف سے بھی بے شمار تبلیغی وفود مرتدین کے علاقوں میں بھیجے۔ اور سب سے پہلا وفد تو غالباً خود ہی اچھنیرے کے مقام پر لے کر گئے تھے۔ مولانا محمد حسن واحدی جو اس وقت معین مدرس تھے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب وفد لے کر گئے گاؤں میں پہنچ کر ایک جگہ زمین پر رومال بچھا کر بیٹھ گئے۔ وفد میں مولانا وحدی کے علاوہ دو تین طالب علم تھے۔ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت یہ جگہ تو مناسب نہیں ہے۔ فرمایا کہ چپکے رہو۔ اسی میں عافیت ہے۔ گاؤں والے چند طلبہ کو دیکھ کر جمع ہو گئے۔ پھر آپ نے تقریر فرمائی۔

ان وفود کے صدر کبھی حضرت مولانا حید حسن خاں ٹونکی مرحوم مدرس مدرسہ امینیہ اور کبھی مولانا محمد عرفان مرحوم نائب ناظم جمعیۃ علمائے ہند و مدیر اخبار الجمعیۃ اور کبھی مولانا احمد سعید اور کبھی دیگر حضرات ہوتے تھے۔ مرتد ملکانوں کے علاقوں میں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ قدم قدم پر فتنہ و فساد کا اندیشہ اور جان کا خطرہ لگا رہتا تھا۔

مولانا کا انداز خطابت

ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب کے پاس خبر پہنچی کہ فلاں گاؤں پورا کا پورا مرتد ہو گیا ہے۔ حضرت نے مولانا احمد سعید کو حکم دیا کہ فوراً روانہ ہو جاؤ۔ مولانا دل کے کمزور تھے۔ ہچکچا رہے تھے۔ بہت کچھ حیلے بہانے کیے مگر حضرت کا حکم تھا۔ مجبوراً روانہ ہوئے۔ گاؤں میں پہنچ کر حالات معلوم کیے اور خاص کر یہ بات دریافت کی کہ آریہ لوگ آکر ان گاؤں والوں سے کیا کہتے ہیں؟ اور کیونکر بہکاتے ہیں؟ بتایا گیا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ "تمھارے باپ دادا سب ہندو تھے۔ مسلمانوں نے آکر تم کو زبردستی مسلمان بنایا۔ اور تمھاری چوٹیاں کاٹیں۔" اب مولانا کا طرزِ استدلال اور شانِ خطابت ملاحظہ فرمایئے۔ آپ نے جلسے کا اعلان کرایا۔ اور کھڑے ہو کر فرمایا:

"آج اس گاؤں میں آکر اور ایک بہادر قوم کے سپوتوں سے مل کر میں بے انتہا خوش ہوا ہوں۔ ملکانہ قوم دنیا کی چند بہادر قوموں میں سے ایک ممتاز قوم ہے۔ یہ قوم ہندوستان کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ تمھارے باپ دادا نے ہمیشہ ہندوستان کی حفاظت کی ہے۔ دشمنوں سے کبھی ہار نہیں مانی ہے۔ اور بھئی! مجھے ان لوگوں پر بڑی حیرت ہوتی ہے جو تمھارے باپ دادوں کو تمھارے منہ پر بزدل اور ڈرپوک کہتے ہیں اور تم جو اُن سورماؤں کی اولاد ہو سنتے ہو اور بُرا نہیں مانتے۔ لوگ تمھیں آکر بہکاتے ہیں کہ تمھارے باپ دادوں کو مسلمانوں نے مار مار کر زبردستی مسلمان بنایا تھا۔ اور ان کی گردنیں پکڑ پکڑ کر چوٹیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ کیا واقعی تمھارے باپ دادا ایسے ہی کمزور اور ڈرپوک تھے؟ مجھے یقین نہیں آتا! دیکھو بھئی! یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ دھوکا دیتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تمھارے باپ دادوں سے کوئی آنکھ بھی نہیں ملا سکتا تھا۔ وہ اسلام کو ایک اچھا اور سچا دین سمجھ کر اپنی خوشی سے مسلمان ہوئے تھے۔ کیا اب تم اپنے

سچے دین کو چھوڑ کر اپنے باپ دادوں کی روحوں کو صدمہ نہیں پہنچا رہے ہو؟

تقریر ختم ہونے کے بعد گاؤں کے لوگ از سر نو مسلمان ہو گئے۔

اکابر بھی مان گئے

آپ کی طرز خطابت کے ایسے ہی سینکڑوں کرشمے اکثر ظہور پذیر ہوتے رہتے تھے۔ جن سے ذہنیت اور خیال بدل جاتے تھے۔ فتنہ و فساد کے عزائم سست پڑ جاتے تھے۔

بریلی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں کوئی کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس کو خراب کرنے کے لیے کئی سو آدمی اپنی بغلوں میں چھرے چاقو چھپا کر آئے تھے۔ مولانا احمد سعید صاحبؒ نے کھڑے ہو کر تین گھنٹے تقریر کی۔ فسادیوں کے مفسدانہ عزائم پر اوس پڑ گئی۔ کوئی چوں بھی تو نہ کر سکا۔ کانفرنس امن و عافیت کے ساتھ جاری رہی۔ تقریر کے ختم ہونے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد جیسے آتش بیان خطیب نے اُٹھ کر مولانا کو گلے لگایا اور فرمایا کہ "مولانا اگر آپ ہمیشہ ایسی ہی تقریر کیا کرتے ہیں تو دنیائے اسلام میں آپ کا جواب نہیں ہے۔"

پھر ایک نیا گل کھلا

ابھی اکابر جمعیۃ آریوں کی مدافعت میں مصروف تھے کہ بیچ میں ایک اور مصیبت پیش آگئی۔ بریلوی حضرات بھی تبلیغ کے میدان میں دوڑنے لگے۔ اور گانوؤں میں جا کر یہ کہنا شروع کیا کہ دیکھنا یہ دیوبندی لوگ کافر ہیں۔ بہت کچھ کافر کافر کہتے رہے مگر دیہاتیوں پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا۔ اور انھوں نے دیوبندیوں کے تبلیغی اجتماعات میں حاضر ہونا بند نہ کیا تو دوسری ترکیب سوجھی۔ یعنی وہابی کہنا شروع کیا۔ یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ دیہاتیوں نے جہاں یہ لفظ سنا اور بھڑکے۔

اس لفظ کی تاثیر پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ بطور معترضہ کے اس کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک گاؤں کی مسجد کے امام صاحب ایک ہندو بنئے سے اُدھار سودا لیا کرتے تھے۔ تھوڑا بہت قرضہ ادا بھی کر دیتے تھے۔ جب بقایا زیادہ ہو گئی تو بنیے نے سودا دینا موقوف کر دیا۔ امام جی نے پہلے تو خوشامد کی۔ جب نہیں مانا تو کہا۔ دیکھو لالہ جی! تمھاری دوکان کو نقصان پہنچے گا! مسلم اکثریت کا گاؤں تھا۔ اور لالہ جی کے خریدار سب مسلمان ہی تھے۔ امام جی نے نماز کے بعد نمازیوں سے خطاب کیا اور کہا۔ "دیکھو بھائیو! فلاں لالہ سے سودا ہرگز نہ خریدنا۔ یہ وہابی ہو گیا ہے۔" بس پھر کیا تھا۔ یہ خبر آناً فاناً بجلی کی طرح دوڑ گئی۔ لالہ جی کی دوکان پر اُلّو بولنے لگا۔ صبح سے شام تک بیٹھے کھیاں مارتے رہتے۔ جب کئی دن ہو گئے۔ اس کو بڑا فکر لاحق ہوا۔ تحقیق و جستجو کے بعد اصل بات معلوم ہوئی تو ضروری سامان (آٹا دال وغیرہ) لے کر ملاجی کے پاس آیا اور کہا کہ ملاجی تم جتنا چاہو سامان لے لیا کرو۔ جب ملاجی راضی ہو گئے تو ایک روز نمازیوں سے خطاب کر کے کہا کہ "دیکھنا بھائیو! وہ لالہ میرے پاس آیا تھا اس نے توبہ کر لی ہے اب اس سے سودا لے لیا کرو۔ لوگ مطمئن ہو گئے اور اس کی دوکان پھر چل پڑی۔

غرض کہ علماء کے راستے میں یہ ایک اور پہاڑ حائل ہو گیا۔ ایک موقعہ پر ایک گاؤں میں تبلیغی جلسہ ہونے والا تھا۔ گاؤں والوں سے کہا گیا کہ یہ لوگ وہابی ہیں۔ ان کی تقریر نہ سنا کرو۔ اور دیکھو اپنے جلسے میں بھی نہ بلانا۔ ان کے وہابی ہونے کی پہچان یہ ہے کہ یہ لوگ قیام نہیں کرتے سلام نہیں پڑھتے۔ جلسے کے منتظمین معتدل المزاج تھے۔ انھوں نے سب کو بلاوا دے دیا۔ بریلوی علماء کے ساتھ ہی دیوبندی علماء بھی پہنچے۔ مگر بریلوی حضرات نے جلسے کے شروع میں میلاد شریف شروع کر دی۔ قیام کے وقت مولانا مرتضی احسن چاند پوری مرحوم اور ان کے رفقاء نے جو دیوبند سے آئے تھے قیام نہیں کیا۔ حضرت مفتی اعظمؒ نے قیام کیا۔ ان کو دیکھ کر مولانا احمد سعید وغیرہ بھی کھڑے ہو گئے۔ مگر دل میں سوچ رہے تھے کہ حضرت نے اپنے مسلک کے خلاف ایسا کیوں کیا۔ جلسے میں بریلوی حضرات نے اپنی تقریروں میں سارا زور وہابیت کی تردید و تنقیص میں خرچ کر ڈالا۔ دیوبندی حضرات نے اپنی تقریروں میں ان اختلافی مسائل کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ خالص تبلیغی تقریریں کیں۔

اس جلسے کا عوام پر اچھا اثر ہوا۔ دوسرے دن صبح کو ہر جگہ یہ

تذکرے ہورہے تھے کہ بھئی یہ حنفی مولوی جو آئے تھے انھوں نے تو اپنی تقریروں میں اسلام کی کوئی بات نہیں کہی۔ بس یہی کہتے رہے کہ فلاں کافر ہے فلاں وہابی ہے۔ ایک بولا یہ گلابی وہابی کونسی قوم ہے جس کا وہ نام لے رہے تھے؟ ایک بولا۔ ارے چودھری! دیکھو! تقریریں تو دلی کے مولویوں کی بڑی چوکھی تھیں۔ بس اسلام کی باتیں کہیں۔ اور اللہ رسول کی باتیں سنائیں۔ بھئی ہم تو اب انھیں کو بلایا کریں گے۔ یہ حنفی مولوی تو ہم کو لڑواتے رہتے ہیں۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد مولانا نے حضرت مفتی صاحب سے قیام میں شریک ہونے کی وجہ دریافت کی۔ فرمایا کہ یہ اختلافی مسائل ہیں۔ ان میں شدت اختیار کرنا مناسب نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان نو مسلموں کو اپنی طرف مائل کرنا اور محبت کا برتاؤ کرنا اس وقت ہمارا سب سے اہم فریضہ ہے۔ اگر علماء کی طرف سے ان کے دلوں میں نفرت پیدا ہوگی تو ان کو خدا کا پیغام پہنچانا مشکل ہو جائے گا اور ایک اہم مقصد فوت ہو جائے گا:

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

حضرت مفتی اعظمؒ نور اللہ مرقدہٗ کے فہم و تدبر کی یہ ادنیٰ مثال ہے۔ اپنے مسلک پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے فراخدلی اور رواداری برتتے تھے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر طبقے کے مسلمانوں کے سر ان کے ادب و احترام میں جھک جاتے ہیں۔ اور ہر مسلک کے مسلمان آج ان کی کمی محسوس کر کے آبدیدہ ہوتے ہیں۔

واضح ہو کہ یہ رواداری تھی۔ مداہنت یا تسامح نہیں تھا۔ آپ نے کبھی اپنے مسلک میں تبدیلی نہیں کی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ۔ کے مسلک پر سختی سے قائم رہے۔ نیز اسلامی شعائر کے معاملے میں کبھی نرمی نہیں برتی۔ غیر مسلموں کی خالص مذہبی تقاریب میں شرکت کی اجازت نہیں دی۔ دعوتوں اور ٹی پارٹیوں میں اسلامی آداب اور مشرقی معاشرۃ کو ترک نہیں کیا۔ اپنے بیس برس کے دور صدارت میں اخبار الجمعیۃ کے صفحات پر تصویر شائع کرنے کی کبھی اجازت نہیں دی۔ فاعتبروا یااولی الابصار۔

جمعیۃ علمائے ہند کے اندر انقلاب

نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علمائے ہند قائم ہوئی تھی۔ اس کی صدارت کے لیے حضرت مفتی اعظمؒ کو اور نظامت کے لیے حضرت مولانا احمد سعید کو منتخب کیا گیا تھا۔ جب ان حضرات کی محنت شاقہ سے جمعیۃ نہ صرف ہندوستان و برما میں بلکہ تمام دنیائے اسلام میں روشناس ہو گئی۔ اور اس پودے کی پھلنگ آسمان سے باتیں کرنے لگی اور اس کی جڑیں مضبوط ہو گئیں۔ تو بعض حضرات کے دلوں میں یہ خلش پیدا ہوئی کہ تمام ہندوستان کے مختلف الخیال اور مختلف المسلک علماء کی باگ ڈور دیوبندی حضرات کے ہاتھ میں کیوں ہے؟ ۱۹۲۲ء-۱۳۴۱ھ میں جبکہ جمعیۃ علماء کی سالانہ کانفرنس شہر گیا میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی زیر صدارت منعقد ہوئی تھی۔ اس وقت سے اس قلبی خلش کا اظہار ہونے لگا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد جمعیۃ کی صدارت کے خلاف بھی کھچڑی پکنے لگی۔ مگر جن ایثار پیشہ اور مخلص علماء نے مل کر جمعیۃ کی بنیاد ڈالی تھی وہ اس کے اندر اختلاف کو گوارا نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ اپنے روزنامچہ (قلمی) میں تحریر فرماتے ہیں:

"مولوی سبحان اللہ صاحب اور ان کے ہمراہی مولوی عبدالعزیز وغیرہ نے آخر ماہ میں آکر ملاقات کی۔ مولوی سبحان اللہ نے زیادہ زور اس امر پر دیا کہ دیوبند کے علماء کا اثر جمعیۃ علماء میں زیادہ ہوتا جاتا ہے اس کا تدارک کرنا چاہیے۔ میں نے اس کا جواب دیا کہ جمعیۃ علماء کے مقاصد ایسے ہیں کہ جن میں ان کا زور ہونا ہمارے مقاصد کے خلاف نہیں ہے۔ اور اس کو ہم نے سمجھ کے کیا ہے۔ ہماری اور ان کی کوئی دنیاوی مغایرت نہیں ہے۔ نہ ان کو غیر کرنے سے فائدہ ہے۔ بلکہ ہمارے اثر کا نقصان ہے۔ علاوہ ازیں اگر ان کا اثر جمعیۃ علماء پر نہ ہو تو پھر وہ جماعت علماء کہاں سے آئے گی جس کا اثر ہو۔ ان کے مدارس اور تلامذہ اطراف و اکناف ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سے ہم کو استغنا نہیں ہے۔ نہ ان کے اثر کے کم کرنے سے ہمارا کوئی

مقصد حاصل ہوتا ہے۔

پھر انھوں نے مسئلہ امیر شریعت چھیڑا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ دیوبند کی عصبیت کا باعث میں ہوں۔ شاید امیر شریعت کو اپنے ہم خیال علماء سے بنانے کی تجویز کروں۔ میں نے اس سے اختلاف کیا۔ اور صاف کہہ دیا کہ میرے نزدیک یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ جمعیۃ علماء کے حال کے طرز عمل نے مجھے اور بھی اس کے نقائص کی طرف زائد توجہ دلادی ہے۔ میں اس کی موافقت ہی نہیں کرتا۔ مگر آپ لوگوں کی رائے کی وجہ سے سکوت کروں گا۔ مخالفت نہ کروں گا۔ میں شریعت اسلامیہ میں سوائے خدا اور رسول کے کسی کے احکام کو بے چون وچرا نہیں مان سکتا ہوں۔ اگر جمعیۃ علماء ایک عبد حبشی کو امیر شریعت مقرر کردے گی میں اس کی مخالفت نہ کروں گا۔ خود احکام خدا اور رسول کا پابند رہوں گا۔ دیوبند کے علماء سے قوی امید ہے کہ مسائل اختلافیہ کسی قسم کے پیش نہ کریں گے۔ نہ اپنے مخصوص مسائل میں مجھے مجبور کریں گے۔ ان کے انتخاب سے فائدہ کی امید زیادہ ہے بہ نسبت نقصان کے۔ میں نے کہا کہ اگر مولوی حبیب الرحمٰن صاحب اور مولوی آزاد سبحانی صاحب اور مولوی عبد القدیر صاحب کے متعلق رائے لی جائے تو کون شخص اول الذکر کو مقدم نہ کرے گا۔ خدا نے ان کو تقدم دیا ہے۔ میں خود اس تفریق کو کہ یہ دیوبند کے ہیں اور وہ نہیں کبھی نہ خیال میں رکھتا تھا نہ اب اس کا لحاظ کروں گا۔" الخ......

باوجود اس روک تھام کے جمعیۃ علماء کی لیڈر شپ کو بدلنے کے منصوبے بنتے رہتے تھے۔ حضرت مفتی اعظمؒ نے جب محسوس کیا کہ مختلف اسباب (مثلاً خاندانی مفاخر اور نسلی امتیازات کا فقدان نیز دیوبندیت وغیرہ) کی وجہ سے علمائے کرام صدارت سے گرانی محسوس کررہے ہیں تو ایک میٹنگ میں صدارت سے استعفا پیش کردیا۔ لیکن جب استعفیٰ پیش ہوا تو متفقہ طور پر سب نے اس کی منظوری سے صراحتاً انکار کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مرکزی مقام میں صدر دفتر رہنے کی صورت میں حضرت مفتی اعظمؒ کی صدارت ناگزیر تھی۔ جب کبھی آپ نے صدارت سے علیحدگی کا ارادہ کیا ہمیشہ اس کی مخالفت کی گئی۔ آخر ایک نئی صورت حال سامنے آئی۔

دیوبند کی انقلابی جماعت

دار العلوم دیوبند میں جو حضرات صاحب اختیار تھے ان کی بے احتیاطیوں کی وجہ سے ان کے خلاف ایک کوہ آتش فشاں اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ یہ فتنہ ستمبر ۱۹۲۷ء میں پوری قوت سے طلبہ کی اسٹرائک کی صورت میں ابھرا۔ اگرچہ یہ انقلابی تحریک مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم کی اولوالعزمی اور تدبر کی وجہ سے پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن دار العلوم کی انتظامی باڈی میں کچھ اصلاحات کا سلسلہ ضرور شروع ہوگیا۔ انقلابی جماعت نے یہاں کی ناکامی کے بعد ڈابھیل کا رُخ کیا۔ اور وہاں ایک جامعہ عربیہ قائم کیا۔ مگر فضا سازگار نہ ہوئی۔ جماعت کے افراد منتشر ہونے شروع ہوگئے۔ کچھ افراد نے کلکتہ کا رُخ کیا۔ مگر وہاں جاکر امنگیں اور بھی سرد پڑھنے لگیں۔ آخر دہلی کا رُخ کیا۔ انقلابی ذہنیت کے لیے بھی میدان مل گیا۔ دہلی کی آب وہوا ہی ایسی ہے کہ ہر ابھرنے والی اُمنگ کو اُبھرنے کا موقع دیتی ہے اور ہر زنگ آلود جوہر کو جلا دے کر اُبھارتی ہے۔

مولانا بشیر احمد بھٹہ جو مرکزی جمعیۃ علمائے ہند کی ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے ان کا مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ علمائے ہند سے کچھ اختلاف ہوا۔ اور بڑھتا رہا۔ ادھر اُس انقلابی جماعت کے سرکردہ حضرات کی نظر دہلی پر پڑ ہی چکی تھی۔ ہم سفر مل گئے۔ منزل مقصود متعین ہوگئی۔ "مولانا احمد سعید کے اقتدار کو ختم کرنا۔ اور جمعیۃ علمائے ہند کی باگ ڈور کو اپنے ہاتھ میں لینا۔" رہنمائی کے لیے مولانا بشیر احمد مرحوم مدبر۔ نتیجہ میں مولانا احمد سعید کے لیے ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ ترک نظامت کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں صدر و ناظم دونوں کا استعفا جمعیۃ کے سامنے آگیا۔

اسی زمانے میں مولانا بشیر احمد صاحب نے راقم الحروف سے فرمایا کہ "دراصل ہمارا اختلاف ناظم صاحب سے ہے۔ حضرت مفتی صاحب قبلہ کو ہم کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ناظم صاحب کے بغیر صاحب صدارت پر رہنے کے لیے

کسی صورت سے تیار نہیں ہیں۔"

یہ واقعہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم کو جو تعلق مولانا سے تھا۔ اور رفاقت و تعاون کا جو جذبہ وہ مولانا کے اندر پاتے تھے اس کی اُمید ان کو اور کسی سے نہ تھی۔ اس وجہ سے بھی وہ بغیر مولانا کے اپنی صدارت گوارا نہ کر سکتے تھے۔

بہرحال ۱۹۳۹ء میں جمعیۃ کی صدارت حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اور نظامت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی طرف منتقل ہو گئی۔ حضرت شیخؒ کی وفات کے بعد مولانا کو صدر چنا گیا اور دم واپسیں تک آپ جمعیۃ علمائے ہند کے صدر رہے۔

۴۷ء میں اور اس کے بعد

انقلاب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے اور خاص کر دہلی و پنجاب کے مسلمانوں پر جو کچھ گزری اور اس میں مولانا نے (جو ڈیڑھ دو برس سے اختلاج وغیرہ مہلک امراض میں گرفتار تھے) اور ان کے ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن ناظم عمومی جمعیۃ علماء نے جو خدمات انجام دیں وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھی جائیں گی۔ بشرطیکہ مؤرخ فن تاریخ کے آداب اور اس کی ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھ کر تاریخ لکھے۔ لیکن اس سیاسی عہد میں یہ اُمید نہیں۔ آج کے دور میں اسلاف کی قربانیوں اور مخلصانہ خدمات کو فراموش کر دینا اور ان کی یاد کو صفحات تاریخ سے محو کر دینا ہی انسانیت کا سب سے بڑا فریضہ ہے:

رائگاں رندوں کے اوصاف حمیدہ ہو گئے
بوالہوس ان کی نظر میں برگزیدہ ہو گئے
میرے افسانوں سے دنیا نے لیا درس جنوں
میرے افسانے بھی اب تو ناشنیدہ ہو گئے
بتکدے کی راہ لی تھی چھوڑ کر باب حرم
میری قسمت سے یہ آہو بھی رمیدہ ہو گئے
گرم ہو جاتا تھا جن سے نوجوانوں کا لہو
آج وہ افکار مرہونِ قصیدہ ہو گئے
قطرہائے خونِ دل کا کیا کہوں واصفؔ مآل
دفن وہ بھی صورت اشک چکیدہ ہو گئے

اس دور ابتلا کا حال اور اس نامسعود انقلاب کی خوں ریزی کا تذکرہ چند صفحات میں نہیں سما سکتا۔ اور اُس وقت اکابر جمعیۃ نے جان کی بازی لگا کر اور سر ہتھیلی پر رکھ کر جو خدمات انجام دیں ان کے لیے بھی بڑے بڑے دفتر درکار ہیں۔ کتاب "مختصر تذکرۂ خدمات جمعیۃ" سے آپ کو کچھ مختصر سا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

اُس زمانے میں ایک دن یہ افواہ سُنی گئی کہ کوچہ چیلاں سے جامع مسجد تک کے علاقے کو مسلمانوں سے خالی کرا لینے کی تیاری مکمل ہو گئی ہے۔ وہ رات سر پر کھڑی تھی جبکہ بلوائی اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے والے تھے۔ مولانا احمد سعید کو یہ پیغام دیا گیا کہ آپ اپنے نیشنلسٹ مسلمانوں کو ساتھ لے کر ہماری حفاظت میں آ جایئے۔ اس کا جو کچھ جواب مریض اختلاج مولانا سعید نے دیا وہ ملا واحدی کے الفاظ میں سنیے لکھتے ہیں:

ایک واقعہ تو ایسا ہے کہ شاید وہی نجات کا ذریعہ ہو جائے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء کی ایک بھیانک رات تھی۔ کرفیو کے باوجود کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ اور پکارا واحدی صاحب! میں مکان کی دوسری چھت میں تھا جہاں مردانہ تھا۔ میرے بڑے لڑکے مجتبیٰ واحدی نیچے اُترے اور انھوں نے اطلاع دی کہ لالہ دیس راج ہیں۔ دیس راج میونسپل کمیٹی کے ساتھ تھے۔ علاقہ کا مسلمان ممبر میں تھا اور ہندو ممبر وہ۔ میں نے مجتبیٰ سے کہا بلالو۔ دیس راج صاحب بولے آپ ہی آیئے۔ خیر! میں گیا تو متعدد موٹریں کھڑی تھیں۔ لالہ دیس راج نے کہا کہ یہ مسز کرپلانی ہیں صدر انڈین نیشنل کانگریس کی دھرم پتنی۔ یہ مسٹر شانتی سروپ آہوجہ ہیں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ مسز کرپلانی نے سوال کیا۔ "اس محلے میں تو امن ہے؟" میں نے کہا "ہاں اس محلے میں تو ابھی امن ہے۔ مگر امن ٹوٹنے کا ہر آن امکان ہے۔" مسٹر آہوجہ بولے۔ "مہاتما گاندھی کو اطلاع ملی ہے کہ یہاں خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ آپ صاف صاف بتایئے کہ خطرے کا "وہم" کیوں ہے؟ مسز کرپلانی مہاتما جی سے کیا کہیں؟ میں نے کہا "برابر کے محلے زد میں آ چکے ہیں اس وجہ سے اطمینان نہیں ہے۔ مولانا احمد سعید صاحب کا گھر قریب ہے ان سے اور پوچھ لیجیے۔ ممکن

ہے کہ وہ کچھ اور زیادہ بتا سکیں۔" چنانچہ مولانا سے پوچھا گیا۔ انھوں نے بھی وہی فرمایا جو میں نے کہا تھا۔ صرف اتنا اضافہ کر دیا کہ "مسٹر آصف علی اور مفتی کفایت اللہ کا محلہ آپ کے انتظامات کا منتظر ہے۔" آہوجہ صاحب نے کہا۔ "آپ اور آپ کے ساتھی ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں چلے جائیں۔ وہ خالی ہے۔ وہاں مطلق خطرہ نہ رہے گا۔ کوٹھی کی حفاظت محلے کی حفاظت کی نسبت آسان ہے۔" مولانا نے فرمایا۔ "محض اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان بچانی کونسی اچھی بات ہے۔ آپ بچا سکتے ہیں تو محلے کے نہیں شہر بھر کے مسلمانوں کو بچائیں آج کل ساتھی اور غیر ساتھی کا فرق محال ہے۔"

اپریل میں بیمار نہیں تھے۔ بیمار کئی سال سے جاڑے میں پڑتے تھے۔ جاڑا آیا اور دل کا حال بگڑا لیکن اپریل (۱۹۵۹ء) کا اضمحلال کسی بیماری کی وجہ سے نہیں تھا۔ دلی کی کایا پلٹ نے مضمحل کر رکھا تھا۔ زبان سے ایک لفظ نہیں کہا مگر لکھتے برابر رہتے تھے کہ دیرینہ صحبتوں کے تصور سے بے چین ہوں۔ دیرینہ صحبتوں کی یاد بجلیاں گراتی ہے۔ دلی کی کایا پلٹ مولانا کی آنکھوں کے سامنے ہوئی تھی۔ ہم اس کی رُوداد سن کر متاثر ہیں۔ مولانا پتھر تھوڑا ہی تھے جو متاثر نہ ہوتے۔

۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن، حافظ عزیز حسن بقائی، اور جعفری صاحب کا وفد روزانہ مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت نہرو، مہاتما گاندھی کے پاس جایا کرتا تھا۔ جو تینوں کو بتایا کرتا تھا کہ مسلمانوں پر کل کیا گزری۔ ایک دن گاندھی جی مسلمانوں کے پاس تشریف لے آئے۔ کونے کونے کے مسلمان سمٹ کر مولانا احمد سعید کے علاقے میں جمع ہو چکے تھے۔ دلی کے اور محلے مسلمانوں سے تقریباً خالی تھے۔ مہاتما جی کا جلسہ مسٹر آصف علی والی مکان کوچہ چیلاں میں منعقد کیا گیا۔ مولانا احمد سعید نے تقریر شروع فرمائی۔ دو چار لفظ بولے ہوں گے کہ لفظوں کی جگہ آنسو بہنے لگے۔ اور مولانا کی جگہ مولانا محمد حفظ الرحمٰن نے تقریر کی تکمیل فرمائی۔

"میرا خیال ہے کہ انقلاب ۱۹۴۷ء سے جس قدر مولانا متاثر ہوئے۔ اس قدر شاید کوئی متاثر نہیں ہوا۔ گاندھی جی کی قیام گاہوں تک کا بلا ناغہ سفر کتنا خطرناک تھا۔ پھر گاندھی جی سے شکایت کرنا معمولی حکام کو ہی نہیں۔ سردار پٹیل وزیر داخلہ بھارت کو دشمن بنانا تھا۔ پٹیل صاحب گاندھی جی سے خفا ہونے کی طاقت اور ہمت نہ رکھتے تھے۔" (الجمعیۃ مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۵۹ء)

۱۹۴۷ء سے زندگی کے آخری لمحات تک عوام کے کاموں اور سفارشوں کے لیے دوڑ دوڑ کر حکام اور وزراء کے پاس جانا اور اپنے امراض کی پروانہ کرنا۔ ان خدمات کے ساتھ علمی مشاغل مثلاً تصنیف و ترجمہ کا جاری رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ اس سراسیمگی اور بدحواسی کے دورِ نامسعود میں خداوند عالم نے جن کو استقامت کی توفیق بخشی وہ جمعیۃ علمائے ہند کے حضرات تھے۔ خداوند ذوالجلال نے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علمائے ہند کو وہ جرأت و ہمت اور وہ استقلال عطا فرمایا جو ایسے موقعوں پر تاریخ کی ممتاز شخصیتوں کا قدرتی حصہ ہوتا ہے۔ ان کی رفاقت میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب جو پانچ چھ سال سے اختلاج قلب وغیرہ میں مبتلا تھے اور ضعف و نقاہت نے ایک حد تک گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا تھا۔ ہمت مردانہ کے ساتھ اٹھے اور کوہ استقلال بن کر کارکنان جمعیۃ کی بزرگانہ سرپرستی فرمائی۔ اب یا تو مرض ہی نہ رہا تھا یا احساسِ مرض مفقود ہو گیا تھا۔ ان حضرات کے استقلال و استقامت نے جماعت کے کارکنوں میں نئی زندگی پیدا کر دی۔ ان کے حوصلے بلند ہو گئے۔ اور انھوں نے سر ہتھیلی پر رکھ کر وہ خدمات انجام دیں جو مسلمانان دہلی کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ خاص کر اس زمانے میں کہ حکومت بلوائیوں کے نرغے میں تھی اور پیس کمیٹی کی تمام کوششیں ناکام ہو رہی تھیں۔ حتیٰ کہ ٹاؤن ہال جو امن کمیٹی کا مرکز تھا اس کے گرد لاوارث نعشیں جگہ جگہ پڑی ہوئی تھیں۔ ہندو دوستوں نے پریشان ہو کر حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، سید محمد جعفری صاحب، حافظ محمد نسیم صاحب وغیرہ ارکان پیس کمیٹی سے التجا کی کہ وہ مسلمانوں کو لے کر اوکھلا تشریف لے چلیں جہاں ان کی حفاظت اور آسائش کا پورا انتظام کر دیا جائے گا۔ ورنہ خطرہ ہے کہ اس بحرانی دور میں وہ اپنے قوم پرور مسلم دوستوں کی حفاظت نہ کر سکیں گے۔ اور شرمساری کا یہ داغ ہمیشہ ان کی پیشانی

پر رہے گا۔ اُس وقت جماعت کی ترجمانی کرتے ہوئے شیر دل حفظ الرحمٰن نے کہا: "وطن عزیز کی آزادی کی کوشش اس لیے نہیں کی تھی کہ ہم کسی کیمپ میں جاکر پناہ لیں۔ ہم اپنے مکانات اور اپنے محلوں میں رہیں گے۔ اور صبر و استقامت سے اس بغاوت کا مقابلہ کرتے ہوئے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ شہید ہو جائیں گے۔"

(علمائے حق جلد دوم مصنفہ مولانا سید محمد میاں صاحب ۵۷۵)

تصانیف اور ترجمہ قرآن

بہت عرصے کی بات ہے۔ ایک مرتبہ راقم الحروف مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری تھا۔ اور غالباً اس زمانے میں احادیث قدسیہ کا ترجمہ لکھ رہے تھے۔ اس کے کچھ اقتباسات سنا کر فرمایا۔ کہو میاں مفتی صاحب! کیا خیال ہے تمھارا؟ یہ کتاب چلے گی یا نہیں؟ عرض کیا کہ آپ کی کتاب اور مقبول نہ ہو۔ ضرور ہو گی۔ ماشاء اللہ بہت اہم خدمت ہے۔ مگر...... یہ کہہ کر میں کچھ متامل ہوا۔ فرمایا۔ ہاں ہاں کہو۔ کیا بات ہے؟ عرض کیا کہ اگر چہ آپ کے سامنے لب کشائی کرنا گستاخی ہے مگر دلی جذبات کی ترجمانی بھی ضروری ہے۔ آپ نے اپنی تصانیف سے دین کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ مگر اپنے اصلی فن کی طرف اب تک توجہ نہیں فرمائی۔ قرآن کا ترجمہ لکھیے۔ آپ کو قرآن پر جتنا عبور ہے اس عہد میں اور کوئی ایسا نظر نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس نعمت سے نوازا ہے اور زور قلم بھی دیا ہے۔ یہ بہت بڑی خدمت ہو گی۔ سُن کر متفکر ہو گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد فرمایا۔ میاں مفتی صاحب تم نے بات تو بڑی اہم کہی ہے۔ مگر یہ کام اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ میں نے پھر اصرار کیا۔ فرمایا۔ اچھا بھئی سوچوں گا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کا ارادہ مولانا کے دل میں پہلے سے تھا یا بعد میں پیدا ہوا۔ لیکن الحمد للہ کہ وفات سے پہلے ترجمہ کا کام مکمل فرما چکے تھے۔ مولانا کی دیگر تصانیف کی فہرست خاصی طویل ہے۔ جو آپ دینی بکڈپو اردو بازار دہلی سے منگا سکتے ہیں۔

اعتماد و رفاقت

واقعات مذکورۂ بالا سے آپ نے اندازہ کیا ہو گا کہ حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا کو خاص توجہ اور خلوص سے تربیت دی۔ اور انھوں نے بھی ابتدائی دور میں پوری سعادت مندی کا ثبوت دیا۔ اکابر مدرسہ کا دستور تھا کہ مستعد اور ہونہار طلبہ کو اپنی نگرانی میں ٹریننگ دیتے تھے اور جہاں ضرورت ہوتی تھی وہاں بھیج دیتے تھے۔ مولانا مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کو راندیر بھیجا۔ مولانا قاری محمد یاسین صاحب کو رائے پور بھیجا۔ اسی طرح دیگر حضرات کو مختلف مقامات پر بھیج دیا گیا۔ مگر مولانا احمد سعید کی یہ خصوصیت ہے کہ حضرت نے ان کو کبھی اپنے سے جدا نہیں کیا۔ اور اس رفاقت کو اس طرح نباہتے رہے کہ جب کوئی لیڈر یا عالم ملنے کے لیے آتا تھا یا کسی مہمان کی دعوت ہوتی تھی تو مولانا احمد سعید کو ضرور بلایا جاتا تھا۔ حاشا و کلا مجھے ایسی کوئی دعوت یاد نہیں کہ مولانا دہلی میں ہوں اور حضرت نے ان کو یاد نہ فرمایا ہو اور بغیر ان کے نوالہ توڑا ہو۔ اور راقم الحروف کی محرومی بھی قابل داد ہے کہ مولانا کی طرف سے دعوت کا تو کیا ذکر ایک چائے کی پیالی سے بھی ہمیشہ محروم ہی رہا۔ البتہ والد ماجد کی کبھی کبھی اپنے مہمانوں کے ساتھ مولانا کی دعوت کرتے تھے۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ گھر کے نجی معاملات میں بھی مولانا احمد سعید ہمیشہ دخیل رہے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہمارے گھر کا ایک بالکل نجی (یعنی ہم بہن بھائیوں میں سے کسی کی تقریب نکاح کا) معاملہ تھا۔ حضرت نے حکم دیا جاؤ مولوی احمد سعید کو بھی بلا لاؤ۔ میں نے ہمت کر کے عرض کیا کہ ابتدائی مرحلے تو ان کی موجودگی میں طے ہو چکے ہیں۔ اب ان کی کیا ضرورت ہے؟ فرمایا کہ ان کو بلا کر لاؤ ورنہ میں بھی گفتگو میں شریک نہیں ہوں گا۔ کس قدر لگاؤ تھا ان بزرگوں کو اپنے چھوٹوں سے اور کیا مقام تھا اور چھوٹوں کا بڑوں کے دلوں میں! اللہ اکبر!

اکثر مسلم لیگی مسلمان کہا کرتے تھے کہ مولانا کفایت اللہ تو بچارے سیدھے سادے اور نیک آدمی ہیں۔ ان کو تو مولوی احمد سعید نے بہکا رکھا ہے۔ یہ غلط فہمی ان کو اس لیے ہوتی تھی کہ حضرت مفتی صاحب کم گو اور سنجیدہ تھے۔ عام آدمی کو ان سے کھل کر اور بے باب ہو کر بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ان کی اصابت رائے اور فہم و

تدبر کو انھیں کے مرتبے کے لوگ مانتے تھے یا ان کے اکابر جانتے تھے۔ مولانا احمد سعید ہنسوڑ تھے ہنسی مذاق کے عادی تھے۔ الیکشن بھی لڑاتے تھے اور عمدہ لڑاتے تھے۔ یہ پرہیز گار لوگوں کا کام نہیں ہے۔
حضرت مفتی صاحب نے کبھی یہ کام نہیں کیا۔ عمر بھر میں انھوں نے صرف ایک الیکشن میں دلچسپی کا اظہار ضرور فرمایا مگر محض زبانی تائید و حمایت تک۔ اس سے زیادہ نہیں۔ یہ ملاواحدی کا الیکشن تھا۔ واحدی صاحب پہلی مرتبہ میونسپل الیکشن میں کھڑے ہوئے تھے۔ حق یہ ہے کہ واحدی صاحب کا کردار بھی اس پایہ کا کردار تھا کہ حضرت مفتی صاحب جیسے محتاط اور عالی نظر انسان کی توجہات کو اپنی طرف کھینچ سکتا تھا۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔ اور اہل شہر نے ان کی کامیابی پر جیسی خوشی منائی تھی شاید ہی کبھی منائی ہو۔ بڑا لمبا جلوس تھا جو ٹاؤن ہال سے چلا تھا۔ جلوس جب کوچہ چیلاں میں داخل ہوا تھا تو واحدی صاحب پہلے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ان سے گلے مل رہے تھے۔ اور ان کی توجہات پر ممنونیت کا اظہار کر رہے تھے۔

غرض کہ عوام یا تو حضرت مفتی صاحب کے اور مولانا کے تعلقات کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگے تھے کہ یہ ان کے بہکائے ہوئے ہیں۔ اور یا یہ بات تھی کہ حضرت مفتی صاحب کی عظمت اور تقدس ان کے دلوں پر اس قدر غالب تھا کہ ان کی کانگریسیت کو بھی مولانا احمد سعید کے سر تھوپ دیتے تھے۔ یعنی کانگریسیت ایک ایسی بدنما چیز تھی کہ مفتی صاحب کے احترام کی وجہ سے ان کی طرف اس لفظ کو منسوب کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جو کچھ بھی ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے اپنی طرف سے اپنی وضع داری کو آخر تک نباہ دیا۔ اور مولانا کی طرف سے شاید کبھی ان کو کوئی رنجش یا کدورت نہ ہوگی۔ ورنہ کبھی نہ کبھی اس کا اظہار ضرور ہوتا۔ ایک بحر ذخار میں بڑے بڑے دریا گر کر گم ہو جاتے ہیں۔

مدرسہ امینیہ کا اہتمام

حضرت مفتی اعظمؒ کے مرض وفات میں مدرسہ امینیہ کی ضروری میٹنگ مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو مکان پر منعقد ہوئی۔ آئندہ کے انتظامات کے سلسلے میں اہم غور و خوض کرنا تھا۔ حضرت مفتی اعظمؒ نے صراحۃً کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا تھا۔ یہ معاملہ مجلس کے زیر غور تھا کہ مدرسے کا انتظام کس کے سپرد کیا جائے۔

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ "بھئی میں نے کبھی کسی بات پر فخر نہیں کیا۔ لیکن اس بات پر مجھے فخر ہے اور ہمیشہ اس کی مسرت رہے گی کہ حضرت مفتی صاحب نے اپنے آخری لمحات تک مجھ پر اعتماد فرمایا۔ یعنی جب مجلس کے ارکان نے حضرت سے اس بارے میں کچھ ارشاد فرمانے کی اور اپنا خیال ظاہر فرمانے کی خواہش کی تو حضرت نے زبان سے کچھ نہیں فرمایا اور میری طرف اشارہ کر دیا۔"

چونکہ بطور دُور اندیشی کے یہ امر زیر غور لایا گیا تھا اس لیے عارضی طور پر چیکوں کے اوپر دستخط کرنے کا اختیار حکیم شریف الدین صاحب بقائی کو دے کر جلسے کو ملتوی کر دیا گیا۔ اور حضرت کی وفات کے بعد مورخہ ۱۳ر جنوری ۱۹۵۳ء کے جلسے میں مولانا کو مدرسے کا مہتمم اور راقم الحروف کو نائب مہتمم بنایا گیا۔ آپ نے انکار فرمایا لیکن حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد نور اللہ مرقدہٗ کے شدید اصرار پر کچھ عرصے کے لیے آپ نے اعزازی عہدۂ اہتمام قبول کیا۔ اور تقریباً دو ڈھائی سال کے بعد راقم الحروف کی عزت افزائی فرما کر خود مستعفی ہو گئے۔ مگر مدرسے کی سرپرستی اپنی زندگی کے آخری لمحات تک فرماتے رہے اور ہر امر میں مشورہ دیتے رہے۔

اعلیٰ حضرت اور سحبان الھند

خلافت بنی امیہ کے زمانے میں عرب میں باہلی قبیلے کا ایک شخص سحبان وائل تھا۔ یہ شخص اعلیٰ درجے کا فصیح و بلیغ اور لسان خطیب تھا۔ ادب و لغت پر اتنا حاوی تھا کہ اپنی تقریر میں کوئی لفظ مکرر نہیں لاتا تھا۔ ایک مضمون کو جب دوسرے وقت بیان کرتا تھا تو نئے الفاظ میں نئے اسلوب سے بیان کرتا تھا۔ جس طرح حاتم طائی کی سخاوت و جوانمردی اور رستم کی طاقت ضرب المثل ہے اسی طرح سحبان کی فصاحت و بلاغت نہ صرف عرب میں بلکہ دنیائے اسلام ضرب المثل ہے۔

ہندوستان کے اہل علم نے جب مولانا کے اندر اعلیٰ درجے کی

بلاغت اور شیریں بیانی پائی تو سحبان الہند کا خطاب دیا۔ اور واقعی یہ خطاب آپ کی شان کے لائق تھا۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ آپ کو ہمیشہ اعلیٰ حضرت کہہ کر خطاب فرمایا کرتے تھے ایں سعادت بزور بازو نیست۔ تانہ بخشد خدائے بخشندہ۔

مولانا کے سفر

ہندوستان کا تو شاید ہی کوئی ایسا شہر ہو جہاں مولانا تشریف نہ لے گئے ہوں۔ ان سفروں کی تفصیل لکھنا دشوار ہے۔ البتہ بیرون ہند کے دو تین سفر لکھے جاتے ہیں۔

آپ نے پہلا حج ۱۳۳۲ھ - ۱۹۱۴ء میں کیا تھا۔ دہلی کے ایک متمول تاجر جن کا نام غالباً حاجی احمد جان تھا۔ آپ کو اپنے خرچ پر لے گئے تھے۔ اس سفر میں آپ نے جو خطوط مولانا امین الدین مہتمم مدرسہ کے نام بھیجے وہ بجنسہ نقل کرتا ہوں:

پہلا خط:

مکرمی و معظمی سیدی و مولائی

جناب مہتمم صاحب قبلہ زید مجدکم۔

السلام علیکم۔ الحمد للہ بندہ بخیریت تمام مکہ مکرمہ پہنچ گیا۔ تادمِ تحریر بخیریت ہے۔ آپ کی خیریت و میاں سعید الدین کی سعادت اور مدرسہ امینیہ کی مقبولیت کے لیے وقتاً فوقتاً دعا کرتا رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

مصر، بیت المقدس، دمشق، مدینہ منورہ سے مختصر کیفیت اپنے سفر کی لکھتا رہا ہوں۔ غالباً نظر سے گزری ہوگی۔ البتہ تادم تحریر آپ کی خیریت کو آنکھیں ترس رہی ہیں۔ اگر آپ کو میری حالت زار پر ترس آجائے تو براہ کرم اپنی خیریت کا خط ممبئی کٹلری بازار حاجی محبوب بخش سراج الدین کی دوکان پر روانہ فرما دیجئے۔ غالباً بشرط زندگی کیم محرم تک ممبئی پہنچنا ہوگا۔ جی تو یہ چاہتا تھا کہ جہاز سے اترتے ہی آپ حضرات کی صورت دیکھتا۔ لیکن اگر یہ ممکن نہیں تو کم ازکم آپ صاحبان کی خیریت کے خطوط تو نظر سے دیکھ لوں۔ قدرے کیفیت مولائی و آقائی جناب مولوی کفایت اللہ صاحب کے خط میں ملاحظہ فرمالیں۔ جملہ معلمین و متعلمین کی خدمت میں سلام علیک۔ ایچ اے مرزا اور ان کے بھائیوں کو سلام علیک۔

آپ کا ادنیٰ خادم

بندہ احمد سعید دہلوی

از مکہ مکرمہ۔ ۱۶/ ذیقعدہ ۳۲ھ

دوسرا خط

سیدی و مولائی مکرمی و محترمی و مخدومی جناب قبلہ مہتمم صاحب زید مجدکم السلام علیکم۔ الحمد للہ بندہ مع العافیہ دو شنبہ کے روز ۴/ محرم کو ۳ بجے ممبئی پہنچا۔ جناب کا عنایت نامہ مطالعہ کیا۔ دل کو نہایت مسرت و سرور حاصل ہوا۔ خدا تعالیٰ آپ کو ہمیشہ زندہ و تندرست رکھے۔ مولانا باللہ العظیم آپ کے خلوص و محبت نے مجھے میرے والدین کو بھلا دیا۔ میں جناب کو اپنے والد کے قائم مقام سمجھتا ہوں۔ اور یقین ہے کہ آپ بھی مجھے اپنا بیٹا ہی خیال کرتے ہوں گے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ نالائق اولاد ہوں کوئی خدمت جناب کے احسانات کے صلے میں نہیں کر سکتا۔ جناب والدہ صاحبہ کی علالت سے دل نہایت رنجیدہ ہے۔ خد[illegible]ن کو صحت کلی عنایت کرے۔ اور ہمارے سر پر عرصہ دراز تک قائم رکھے۔ تمام سفر میں آپ حضرات کی یاد سے دل بے چین رہتا تھا۔ خداوند کریم کی رحمت سے امید ہے کہ عنقریب خدمت عالی میں حاضر ہو کر قدم بوسی سے مشرف ہوں گا انشاء اللہ جمعرات کی صبح کو فرنٹیر میل سے روانہ ہو کر جمعہ کی شام کو ۷ بجے دہلی جنکشن پر پہنچوں گا۔ جملہ طلبائے مدرسہ و حضرات مدرسین کی خدمت میں سلام علیک۔ بھائی حافظ سعید الدین کو سلام علیک۔ ایچ اے مرزا منشی یامین، عبد الٰہی، بابو صاحب، فضل الرحمٰن، خلیل الرحمٰن کو سلام علیک۔ والسلام

بندۂ نیاز احمد سعید دہلوی

۵/ محرم الحرام ۱۳۳۳ھ بروز سہ شنبہ

اس کے بعد ۱۳۴۴ھ - ۱۹۲۶ء میں دوسرا حج کیا۔ اور تمام عالم اسلام کی مؤتمر مکہ میں شرکت کر کے مسلمانان ہند کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔ جمعیۃ علمائے ہند کی طرف سے مؤتمر کی شرکت کے لیے جو

وفد بھیجا گیا تھا۔ آپ بھی اس کے رکن تھے جمعیۃ کے وفد کے ارکان مندرجہ ذیل تھے:

حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ صدر وفد، مولانا عبدالحلیم صدیقی پرائیویٹ سکریٹری صدر وفد۔ مولانا محمد عرفان سکریٹری وفد مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد سعید۔ مولانا نثار احمد، ارکان وفد۔ مولانا سید سلیمان ندوی صدر وفد، مسٹر شعیب قریشی سکریٹری وفد، مولانا شوکت محمد علی جوہر، ارکان وفد، علاوہ ازیں تقریباً چار سو علماء و زعماء ہندوستان سے اس سفر حج میں ہم سفر تھے۔

۱۳۵۶ھ-۱۹۳۸ء میں حضرت مفتی اعظمؒ کے ساتھ برما کا سفر کیا اور تقریباً ۳ ماہ میں واپسی ہوئی، برما کے مسلمان عرصے سے حضرت مفتی صاحب کی زیارت کے آرزو مند تھے۔ اکثر تقاضا ہوتا رہتا تھا۔ آپ کے تشریف لے جانے سے بہت مسرور ہوئے۔ دارالسلطنت رنگون کے علاوہ برما کے متعدد شہروں میں ہر دو حضرات کی تقریریں ہوئیں۔ حضرت کی کم اور مولانا احمد سعید کی زیادہ۔ اس سفر کی وجہ سے مدرسہ امینیہ کو کافی مالی امداد ملک برما سے حاصل ہوگئی تھی۔

داستان لحد

حضرت مفتی اعظمؒ کے مرض وفات میں تیمارداروں پر مایوسی طاری ہوگئی تو راقم الحروف کے دل میں تدفین کے بارے میں خلجان پیدا ہوا۔ دل میں یہ آرزو تھی کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے قرب وجوار میں جگہ تجویز کی جائے تو مناسب ہے۔ ارادہ تھا کہ موقعہ آنے پر ظاہر کردوں گا اور اسی کی کوشش کروں گا۔ اسی دوران میں خواجہ ہلال قطبی نے مجھ کو بتایا کہ مولانا احمد سعید اور حضرت مفتی صاحب نے اپنے لیے مہرولی میں جگہ تجویز کر رکھی ہے۔ پھر ایک روز مولانا نے بھی مجھ سے ذکر فرمایا اور کہا کہ مفتی صاحب کا عندیہ معلوم کرلو۔ مگر میری آرزو تو کچھ اور تھی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ خود دریافت فرمالیجئے۔ مولانا مفتی صاحب کے سامنے یوں ذکر چھیڑا کہ حضرت آپ کو یاد ہوگا۔ مہرولی میں آپ کے لیے اور میرے لیے دو قبروں کی جگہ محفوظ ہے۔ حضرت نے اشارے سے صرف اتنا فرمایا۔ ہوں! مراد یہ تھی کہ یاد ہے۔ زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اس کے آگے نہ مولانا کی کچھ ہمت پڑی بولنے کی نہ حضرت نے کچھ فرمایا۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۵۲ء کی شام رات کے ساڑھے دس بجے حضرت کی وفات ہوئی۔ غسل میت سے فارغ ہو کر مردانہ بیٹھک میں رات کے ۲ بجے مقام تدفین پر بحث شروع ہوگئی۔ سات آٹھ حضرات موجود تھے۔ شدید اختلاف ہوا۔ مولانا احمد سعید نے جب اپنی تجویز پیش کی تو مولوی سمیع اللہ نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اور اپنی تجویز یعنی جامع مسجد کی باغیچی میں دفن کیے جانے پر زور دیا۔ ان کی زبردست دلیل یہ تھی کہ وہاں فاتحہ پڑھنے کون جائے گا! حکیم حاجی شریف الدین بقائی بھی مہرولی کی تجویز کے خلاف تھے۔ جب اختلاف زیادہ ہوا تو راقم الحروف کو بلایا گیا۔ اور یہ طے کرلیا گیا کہ آخری رائے حفیظ الرحمان کی رائے ہوگی۔ اور اسی پر عمل کیا جائے گا۔ میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری دلی آرزو تو یہ تھی کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے احاطے میں تدفین ہو۔ لیکن فیصلہ کرنے سے پہلے مہرولی کی تجویز کا واقعہ پورے طور پر سننا چاہتا ہوں۔ چنانچہ مولانا نے اور حکیم شریف الدین صاحب نے واقعہ سنایا۔ اس پر میں نے سوالات کیے۔ تنقیحات پیش کیں۔ اور نکھر نکھرا کر مندرجہ ذیل تفصیل سامنے آئی:

”پندرہ سولہ برس پہلے کی بات ہے۔ مولانا احمد سعید نے کوشش کی کہ درگاہ حضرت خواجہ کاکیؒ کے اندر دو قبروں کی جگہ مل جائے۔ مگر بغیر معقول نذرانے کی جگہ ملنی ممکن نہ تھی۔ پہاڑی بھوجلا کے رہنے والے ایک صاحب خلیفہ محمد ولی نام بازار چتلی قبر میں رہتے تھے۔ یہ نیاز علی گوٹہ والے ساکن گلی اڈن محلہ پہاڑی بھوجلا کے فرزند تھے۔ اور ان حضرات سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ جب ان کو یہ بات معلوم ہوئی تو مولانا کے پاس آئے اور کہا کہ درگاہ شریف کے دروازہ کے متصل ظفر محل کے نیچے میری ایک خاندانی زمین ہے اور اس میں صرف دو قبروں کی جگہ باقی ہے۔ میں وہ آپ کو نذر کرتا ہوں۔ اگر آپ پسند فرمالیں۔ اس کے بعد یہ طے ہوا کہ اس

جگہ کو دیکھ لیا جائے۔ دن اور وقت متعین کر لیا گیا۔ تانگہ میں حضرت مفتی صاحب مولانا احمد سعید حکیم شریف الدین صاحب بقائی اور چوتھے خلیفہ محمد ولی صاحب بیٹھ کر مہرولی روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر جگہ کو دیکھا۔ حضرت مفتی صاحب نے جائے وقوع وغیرہ کو ملاحظہ فرما کر کوئی اظہار خیال نہیں فرمایا۔ اس سفر کے تمام وقت میں کوئی ایسا لفظ نہیں فرمایا جس سے اس جگہ کو اپنے لیے منتخب کر لینے یا متعین کر لینے کا مفہوم پیدا ہوتا ہو۔ اس کے بعد زندگی کے آخری لمحات تک کسی سے اس کا تذکرہ نہیں فرمایا۔ حد تو یہ ہے کہ گھر میں اپنی اہلیہ محترمہ سے اور اولاد تک سے ذکر نہیں فرمایا۔ کچھ عرصے کے بعد مولانا احمد سعید نے وہاں دوسر دابے بنوا کر محفوظ کرا دیئے۔"

اس واقعہ کو سننے کے بعد میرے پیش نظر اِدھر تو اپنی دلی خواہش تھی۔ اُدھر مولانا کی آرزو اور اس کے مطابق ان کے گزشتہ انتظامات۔ اگرچہ مولانا سے یا ان کی تجویز سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی مگر ان کے ساتھ حضرت کے نصف صدی کے تعلقات کا خیال کر کے میں نے یوں تقریر کی:

"اگرچہ میری دلی آرزو یہ تھی کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے قرب وجوار میں رکھا جائے۔ مگر اس واقعہ کو سننے کے بعد میں اپنی رائے پر مولانا کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں۔ حضرتؒ کا اس جگہ کو ملاحظہ فرمانے کے لیے تشریف لے جانا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اس جگہ کو پسند کرتے تھے۔ اور وصیت نہ فرمانا حتیٰ کہ کسی سے ذکر نہ فرمانا اس لیے تھا کہ کسی خاص جگہ دفن ہونے کی وصیت کرنے کو آپ منع فرمایا کرتے تھے۔ (فقہا نے ایسی وصیت کو باطل لکھا ہے) وعلیہ الفتوی۔ کذافی رد المحتار شامی۔

فیصلہ ہو گیا۔ اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔ اور سات برس بعد یہ عزیز شاگرد اور معتمد رفیق بھی ان کے پہلو میں جا سویا۔

بعض لوگوں نے مجھ کو سخت سست کہنا شروع کر دیا تھا۔ کافی عرصے تک یہ طعنے سنتا رہا کہ اپنے والد کو اتنی دور لے جا کر ڈال دیا۔ قریب ہوتے تو روزانہ لوگ مزار پر فاتحہ پڑھتے اور زیارت کرتے اور میں نے جو اپنی آرزو کو مولانا کی رائے پر قربان کر دیا تھا اس کی بھی ایک ہلکی سی خلش خود میرے دل میں رہتی تھی۔

ایک رات کو میں نے خواب دیکھا کہ میں حضرت والد مرحوم کی قبر پر زیارت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ وہ احاطہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اندر واقع ہے۔ دل میں سوچ رہا ہوں کہ ان کی قبر تو مہرولی میں تھی۔ شاید میں راستہ بھول کر آ گیا ہوں۔ لیکن دل میں یہ یقین بھی ہے کہ یہ قبر انھیں کی ہے۔ یکایک دیکھا کہ میرے برابر میں خود حضرت بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ اور میں دل میں حیران ہوں کہ کیا یہ خود ہی اپنی قبر کی زیارت کو تشریف لائے ہیں۔ خواب طویل ہے میں نے مختصر کر دیا ہے۔

"میں نے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد نور اللہ مرقدہٗ سے تعبیر چاہی۔ ارشاد ہوا کہ یہ خواب مبشرات میں سے ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ مہرولی میں مدفون ہیں۔ مگر ان کی روح مبارک حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی روح انور کے ساتھ ہے۔"

اس کے بعد سے میرا دل مطمئن ہے اور اس کی ہر دھڑکن سے یا لائی کف الملام کی صدا آ رہی ہے۔ حضرت مفتی صاحب کی تدفین سے پہلے قبر کے آس پاس کے چبوترے کی منڈیر ٹوٹی ہوئی تھی۔ اور جب تدفین کے وقت لوگوں کا بے پناہ ازدحام ہوا تو بالکل شکستہ ہو گئی۔ مولانا اکثر میرے سامنے کہا کرتے تھے کہ ارے بھئی چبوترے کی مرمت کرانی ہے۔ اور میں چپ ہو جاتا تھا۔ ایک روز مستری اسلام الدین ساکن فراش خانہ میرے پاس آئے اور کہا کہ مولانا کے حکم سے میں نے مہرولی میں مدد لگا دی ہے۔ اب اس کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے۔ میرے استفسار پر مستری صاحب نے بتایا کہ منڈیر کی تعمیر میں تقریباً تین سو روپے یا کچھ زائد صرف ہوں گے۔ کیونکہ وہ از سر نو بنیاد کھود کر پختہ بنائی جائے گی۔ پچاس روپیہ تو مولانا نے مجھے دیئے تھے۔ سامان خرید لیا اور کام شروع کرا دیا ہے۔ سر دست پچاس روپیہ اور لینے تھے۔ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ اب جا کر حفیظ الرحمان سے لو۔" میں متفکر اور متعجب ہوا۔ اور پھر گھر سے مبلغ سو روپے لیے۔ مستری صاحب کو

ساتھ لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پچاس روپیہ مولانا کی خدمت میں پیش کیے اور پچاس روپیہ مستری صاحب کو دیئے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھئی یہ تو میں نے اپنی طرف سے مرمت کے لیے دیئے ہیں۔ یہ کیوں مجھے واپس دے رہے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ آپ تکلیف نہ کیجئے میں خود ہی چبوترہ بنوا دوں گا۔ فرمایا ارے بھئی میرا سردابہ بھی تو وہاں ہے اس لیے میری بھی کچھ ذمہ داری ہے عرض کیا کہ حضرت جی! آپ کا بھی سردابہ وہاں ہے اور میرے والد وہاں دفن کیے جاچکے ہیں۔ آپ خادم کو یاد فرما کر چبوترے کی تعمیر کے متعلق مشورہ فرماتے اور کوئی معاملہ طے ہو جاتا تو اس کی نوعیت دوسری ہوتی۔ لیکن آپ نے خادم کی لاعلمی میں مستری کو بلا کر اور پچاس روپے دے کر مدد لگوادی اور اب مستری صاحب کو میرے پاس بھیج دیا۔ اب تو یہ رقم میں منظور نہیں کروں گا۔ غرض کہ مولانا نے چپکے سے رقم واپس لے لی۔ منڈیر کی تعمیر میں مبلغ چار سو روپیہ صرف ہوئے۔ اس کے بعد میں نے مرقد مفتی اعظم تعمیر کرا لیا۔ اُس میں مزید تین سو روپیہ صرف ہوئے۔

دم واپسیں

آپ کو عہد جوانی میں مرض سل لاحق ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے آپ کو تقریر کرنے سے منع کیا تھا۔ اُس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر بھی نہیں آیا تھا۔ بولنے میں قوت بھی زیادہ صرف ہوتی تھی۔ مگر عمر بھر تقریریں کرتے رہے اور خوب تندرست رہے۔ بڑھاپے کا دور شروع ہونے پر غالباً پرانا مرض جاتا رہا تھا۔ مگر دوسرے امراض نے آگھیرا تھا۔ اکثر اختلاج وغیرہ کی شکایت رہتی تھی۔ ۱۹۴۵ء سے آپ بہت زیادہ نحیف ہو گئے تھے۔ وفات سے دو تین برس قبل سے ڈاکٹر کہتے تھے کہ تعجب ہے کہ مولوی جی زندہ کیونکر ہیں۔ ان کا دل تو جواب دے چکا ہے۔ انھیں میں سے بعض یہ کہتے تھے کہ مولوی جی کو تو غریبوں کی دعاؤں نے روک رکھا ہے۔ غرض کہ دو تین برس سے دل کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ مگر خدمت خلق میں کوتاہی نہ ہوتی تھی۔

مورخہ ۴ر دسمبر ۱۹۵۹ء مطابق ۳ر جمادی الثانی ۱۳۷۹ھ بروز جمعہ بعد مغرب حرکت قلب بند ہو گئی۔ اور وہ بلبل ہزار داستان جس کی شیریں بیانی کا نصف صدی تک ڈنکا بجتا رہا سات بج کر دس منٹ پر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ اور کتاب اللہ کا وہ نقیب جس نے عمر بھر اللہ کی مخلوق کو اس کی آیات کا مفہوم سمجھایا دائمی نیند سو گیا۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔

دوسرے دن بروز ہفتہ جنازہ مہرولی لے جایا گیا اور حضرت مفتی اعظم کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ یہ تھا ڈراپ سین اس عظیم الشان رفاقت کا جو ۱۳۳۶ھ سے بھی پہلے سے شروع ہوئی تھی۔ اور زندگی میں بھی نباہی گئی بعد مردن بھی نباہی جارہی ہے۔ اعلی اللہ مقامھما ورفع درجاتھما۔

تاہل اور اولاد

مولانا نے اپنی پہلی اہلیہ کو چھوڑ دیا تھا۔ ان سے دو اولادیں ہوئی تھیں جو صغیر السن ہی فوت ہوئیں۔ موجودہ اہلیہ محترمہ صوفی حکیم ممتاز احمد ہاشمی کی بہن ہیں۔ مولانا نے ایک اہلیہ محترمہ چار صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں چھوڑی ہیں۔ صاحبزادوں میں سب سے بڑے مولانا حافظ محمد سعید صاحب میونسپل کونسلر مالک دینی بکڈپو ہیں۔ آپ بھی مدرسہ امینیہ کے فارغ التحصیل عالم اور حضرت مفتی اعظم کے شاگرد رشید ہیں۔ اللہ تعالیٰ سلامت رکھے۔ دارین میں درجات بلند فرمائے۔ اور اُن آفات سے محفوظ رکھے جو بڑوں کے اُٹھ جانے کے بعد ہر چار طرف سے ہجوم کرتی ہیں۔ آمین! (افسوس کہ مولانا محمد سعید بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ واصف)

مولانا مرحوم نے اپنے ذاتی مکان چھوڑے ہیں۔ پہلا زنانہ مکان تھا جو کوچہ تاہر خاں میں واقع ہے۔ دوسرا بعد میں خریدا اور بنوایا۔ یہ مردانہ مکان کٹرہ مہر پرور میں واقع ہے۔ آپ اسی میں رہتے تھے اور اسی میں وفات ہوئی۔

عام اخلاق و عادات

یہ عنوان بظاہر تو بہت آسان ہے۔ مگر در اصل اس پر کچھ لکھنا بہت مشکل۔ بنی نوع انسان میں ہر فرد کا زاویہ نظر مختلف ہوتا ہے۔ ایک ہی شخص کے متعلق رائے قائم کرنے والے مختلف رائیں قائم کرتے ہیں۔ اور خاص کر مولانا مرحوم کی زندگی تو ایسی عجیب و

غریب زندگی تھی کہ اس کو مجموعہ اضداد کہا جائے تو بجا ہے۔

جن لوگوں کو کسی بزرگ کے ساتھ حد سے زیادہ عقیدت ہوتی ہے وہ اپنے ممدوح کے متعلق معمولی واقعات کو کرامت پر محمول کرتے ہیں۔ایک مرشد کا واقعہ ہے کہ ان کے ہاں تین مہمان آئے ہوئے تھے اور اسی قدر کھانا تیار کرایا گیا تھا۔جب کھانا تناول کرنے کے لیے دستر خوان بچھایا گیا تو اتفاق سے پانچ مہمان اور آگئے۔ان کو بھی دستر خوان پر بٹھالیا گیا۔ کھانا شروع کیا گیا۔ مرشد صاحب نے ایک روٹی تناول فرما کر خادم کو اشارہ کیا۔اس نے فوراً سیلابچی آفتابہ حاضر کر دیا۔ آپ نے ہاتھ دھونے شروع کر دیئے۔ جب مریدوں نے مرشد کو ہاتھ دھوتے دیکھا تو ان سب نے بھی ہاتھ دھونے شروع کر دیئے۔اگرچہ کسی نے ایک کسی نے ڈیڑھ چپاتی سے زیادہ کھانا نہ کھایا تھا۔ مگر ہر جگہ حضرت کی یہ کرامت مشہور ہوگئی کہ تین چار آدمیوں کا کھانا آٹھ نو آدمیوں کے لیے کافی ہوگیا۔غرض کہ عقیدت کی زیادتی عقیدت مندوں کو مبالغہ پر آمادہ کرتی ہے اور بعض مرتبہ گھڑنت پر ابھارتی ہے۔

مولانا احمد سعید کے اندر سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ ان میں جو کمزوریاں تھیں وہ بھی ظاہر تھیں اور جو کمالات قدرت نے ان کو عطا فرمائے تھے وہ بھی واضح اور روشن۔ان کی مجلس میں حاضر ہونے اور ان کی ظرافت سننے کے بعد بعض ناواقف حضرات ان کے چال چلن کی طرف سے بدگمان ہوتے تھے۔ حالانکہ وہ ان کی محض زبانی دل لگی تھی۔

علم وفضل کے ساتھ وجاہت اور ڈیل ڈول بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا۔اپنے اساتذہ اور اکابر کے ساتھ جب وہ کسی مجلس میں بیٹھے ہوتے تھے تو آنے والا اجنبی شخص سب کو چھوڑ کر انھیں کی طرف بڑھ کر مصافحہ کرتا تھا۔

مولانا کی ایک خاص آن یہ تھی کہ تنہا کبھی نہیں رہے۔جب کبھی گھر سے باہر نکلتے تھے تو کوئی نہ کوئی ساتھ ضرور ہوتا تھا۔اور واپسی بھی اسی طرح ہوتی تھی۔ اگر کہیں راستے میں ساتھی جدا ہو جاتا تو اور کسی کو پکڑ لیتے تھے۔جمعیۃ علماء ہند کے قیام کے بعد کام کی زیادتی کی وجہ سے تقریباً روزانہ بعد عشا حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں مکان (واقع گلی مدرسہ شاہ عبدالعزیز) پر آتے تھے۔ واپسی کے وقت رات زیادہ ہو جاتی تھی۔ راقم الحروف کے حقیقی ماموں مولوی قیام الدین نادر کی یہ مستقل ڈیوٹی تھی کہ وہ ان کے ساتھ جاتے تھے اور گھر تک پہنچا کر آتے تھے۔

ہر حال میں خوش رہنے اور دوسروں کو خوش رکھنے کے عادی تھے۔ مزاج معتدل تھا۔ غصہ بہت کم آتا تھا۔ تندرستی کے زمانے میں خوراک اپنے تن و توش کی مناسبت سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ علم مجلسی میں کمال حاصل تھا۔ مشتعل آدمی کو چند باتوں میں ٹھنڈا کر دینا ان کے لیے ایک معمولی بات تھی۔

فربہی کی وجہ سے بظاہر کاہل الوجود تھے اور بغیر سواری کے آنا جانا مشکل تھا۔ مگر بارہا یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ ضرورت کے وقت میلوں کا پیدل سفر کر لیتے تھے۔

بیس پچیس برس سے مردانہ مکان میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔اس مکان میں پہلوان محمد اسماعیل غوری، عبدالحمید تیل والے اور چند آدمی آپ کی خدمت میں مستقل طور پر رہتے اور رات کو بھی سوتے تھے۔

ہر جگہ آپ اپنا ایک خاص مجلسی ماحول پیدا کر لیتے تھے۔مفتی صاحب کے ساتھ جب سفر کا اتفاق ہوتا تھا تو قیام گاہ سے علیحدہ بے تکلف دوستوں کی ایک مجلس جما کرتی تھی۔ مولانا میر مجلس ہوتے تھے کیونکہ اکابر کی معیت میں کھل کر خوش طبعی نہ ہو سکتی تھی، تمام کاموں سے فارغ ہو کر اکابر کے آرام و راحت کے انتظامات کر کے دوستوں میں جا بیٹھتے تھے۔ ہر شہر میں ان کے اس قسم کے یاران محفل موجود تھے اور اگر نہیں ہوتے تھے تو پیدا کر لیتے تھے۔

سفارش کے معاملے میں بہت فیاض واقع ہوئے تھے۔اس کے مؤثر اور غیر مؤثر ہونے سے کچھ سروکار نہ تھا۔ بس سفارش تحریر فرمانے سے کام تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بہ تقاضائے بشریت مولانا کے اندر کچھ کمزوریاں بھی تھیں جن کی وجہ سے بعض لوگ ان سے ناخوش اور بدگمان ہو جاتے تھے۔اور کبھی کوئی زاہد خشک پہلی

مرتبہ ان کی خاص بے تکلفی کی محفل میں پھنستا تھا تو بہت ہی دحشت زدہ ہو جاتا تھا۔ لیکن باوجود اس کے جب ہم ان کی پچاس برس کی مسلسل خدمات پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک معمولی سی دینی و قومی خدمت دوستوں کے سالہاسال کے مجاہدہ و ریاضت سے بدرجہا بلند و برتر ہے۔ سیاسی مسلک میں بھی وہ ہمیشہ اپنے اکابر کے راستے پر قائم رہے۔ آزادیٔ وطن کی تحریک میں جبکہ بڑے بڑے مجاہد لیڈروں کے قدم ڈگمگا گئے تھے مولانا کے قدموں میں لغزش نہ آئی۔

ان کی عظیم الشان خدمات کو یاد کر کے آج ہم ان کے اُٹھ جانے کے بعد ان کی کمی محسوس کر رہے ہیں۔ اور ان کی جگہ کو خالی دیکھ کر ایسا محسوس کر رہے ہیں کہ ہم نے ایک بہت بڑا مربی اور سرپرست کھو دیا ہے۔ خوش نصیب تھے وہ لوگ جو اس عبرت آباد حوادث میں ہنستے ہنساتے زندگی گزار گئے اور اپنی یاد دلوں میں چھوڑ گئے۔ کاش کہ ہمارے لیے یہ عبرتیں اپنے سفر کی تیاری کا سامان بن جائیں۔ واللہ ولی التوفیق والیہ المرجع والمآب۔

ایک مغتنم ہستی

مقالہ ہذا میں حاجی نذیر احمد صاحب میرٹھی کا ذکر آیا ہے۔ ان کا تعارف بھی اس جگہ ضروری ہے۔ مدرسہ امینیہ کی ابتداء سنہری مسجد چاندنی چوک میں ۱۳۱۵ھ میں ہوئی تھی۔ موصوف ۱۳۱۹ھ میں مدرسے میں بطور چپراسی مقرر ہوئے تھے۔ ۱۳۳۶ھ میں جب مدرسہ کشمیری گیٹ منتقل ہو گیا تو حاجی صاحب موصوف سنہری مسجد میں بطور مؤذن کے تقریباً ۱۳۴۶ھ تک رہے۔ مولانا امین الدین اور حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہما کے مکانوں سے ان کا کھانا مدرسے لے جایا کرتے تھے۔ مدرسے کے مہمانوں کے لیے کھانا پکایا کرتے تھے اور عمدہ پکاتے تھے۔ تقریبات کے انتظامات کرتے تھے۔

۱۹۱۳ء میں جنگ بلقان کے ترک مظلومین و مجروحین کے واسطے چندہ جمع کرنے کے لیے مدرسہ امینیہ میں پندرہ روز کی تعطیل کر دی گئی تھی اور وفود بھیجے گئے تھے۔ مولانا احمد سعید اور مولوی مشتاق احمد دہلوی کو گوڑگاؤں اور میوات کے علاقے میں اور حاجی صاحب موصوف اور مولانا قاری محمد یاسین سکندر آبادی کو دنکور بلاسپور سکندرہ کی طرف۔ مولوی محمد قاسم دیوبندی اور مولوی محمد حسین راندیری کو ضلع مظفر نگر میں بھیجا گیا تھا۔

چونکہ حاجی صاحب موصوف نے طویل زمانہ ان حضرات کی خدمت میں گزارا ہے اس لیے راقم الحروف نے مقالہ ہذا کی تسوید کے وقت ان سے بھی مدد چاہی اور میں ممنون ہوں کہ میری درخواست پر سخت سردی کے باوجود سفر کی زحمت اُٹھا کر تشریف لائے اور میری رہنمائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ حاجی صاحب موصوف کو سلامت رکھے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ □□

قطعۂ تاریخ

از جناب ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب خوشتر میونسپل کمشنر، کھنڈوہ، ایم پی

رہبر وہ قوم کے تھے سیاست میں لاجواب — اس دَور میں تو اُن کی ضرورت تھی بے حساب

سچ پوچھئے تو رونقِ بزمِ وطن تھے وہ — اِک یادگارِ عظمتِ دورِ کہن تھے وہ

خوشتر نکلنے پائے نہ تھے دل کے حوصلے

محفل سے اپنی مفتیٔ اعظم ہی چل بسے

۱۹۵۲ء

حضرت مفتی اعظم کا سانحۂ ارتحال

اردو صحافت کا خراجِ عقیدت

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ کے سانحہ ارتحال پر ملک بھر کے اخبارات نے اپنے ادارتی کالموں میں جس بڑے پیمانے پر اظہارِ رنج و الم کیا ہے، وہ حضرت مفتی صاحبؒ کی ذاتِ والا صفات اور آپ کے قومی و ملّی خدمات کے لیے خراجِ عقیدت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذیل میں ہم "مفتی اعظم کی یاد" اور الجمعیة دھلی کے "مفتی اعظم نمبر" کے شکریہ کے ساتھ انہیں نئی ترتیب و اضافہ کے

آہ! مفتی اعظمؒ

مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیطؔ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

آہ! مفتی اعظم حضرت علامہ محمد کفایت اللہ صاحب سابق صدر جمعیۃ علماء ہند کئی ماہ کی طویل علالت کے بعد آج ۱۳؍دسمبر ۱۹۵۲ء کی شب میں دس بج کر ۲۵ منٹ پر اس جہان فانی سے دار البقاء کی طرف رحلت فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس حادثۂ جانکاہ پر ہم اپنے کن تاثرات کا اظہار کریں۔ مسلمانانِ ہند کو اتنا بڑا حادثہ ایک صدی کے بعد پیش آیا ہے، آہ وہ مفکر اسلام، وہ عالم بے بدل، وہ مفتی بے نظیر جس کے دم قدم سے اسلام اور علوم اسلامیہ کا گلشن ہرا ابھرا تھا اور جس کا چراغ ہستی پورے ہندوستان کو پچاس سال تک منوّر کرتا رہا وہ آج ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوا۔ قلم کو یارا نہیں کہ اس جانشین پیغمبر کی جدائی پر ماتم سرا ہو، دل مغموم ہے، روح بے چین ہے، آنکھیں اشکبار ہیں اور جذبات کی کل کائنات درہم برہم ہے، جگر کی بیماری کیا لاحق ہوئی کہ جان لے کر چھوڑی اور آپ چند ماہ کی علالت کے بعد ہم حرماں نصیبوں کو چھوڑ کر رخصت ہوئے۔ اے خدا تو دلوں کو تمام لے، اے پروردگار تو قلب پر صبر کا القا فرما، یہ غم آنے والی نسلوں میں بھی تازہ رہے گا۔ اور یہ زخم جلدی بھلایا نہ جاسکے گا! حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ملک کی آزادی کے لیے جو قربانیاں دیں اور قوم کی خاطر جس طرح جیلوں کو لبیک کہا اور کانگریس کے مقاصد واصول کے لیے جو شاندار خدمات انجام دیں انہیں انصاف کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی، جمعیۃ علماء ہند کی قیادت میں اگر آپ کا ہاتھ نہ ہوتا تو وہ یقیناً معنویت سے خالی رہتی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ راست، قائدینِ ملّت کے بے خطا مشیر ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ کے رکن اعظم، اسلامی علوم کے آفتابِ منوّر، خلوص، ہمت، عزم، استقلال اور گہری بصیرت کے پیکرِ نورانی!!

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی رحمت پر امت مدتوں آنسو بہاتی رہے گی۔ اے خدا، مرحوم پر اپنے رحمتوں کی بارش فرما اور اُمت کو ان کا کوئی جانشین عطا کر اور اعزہ متوسلین کے ساتھ تمام مسلمانوں کو صبر و شکر کی توفیق دے اور ان کے مشن کی بقاء کے لیے اپنی جناب سے کوئی سامان کر!

عجلت میں دل دردمند اور قلم ماتم سرا سے یہ چند الفاظ نکل گئے ہیں اور اس وقت قلم کا یارا بھی نہیں ہے کہ وہ داستانِ حیات کا کوئی باب مرتب کر سکے، ہم اس وقت مسلمانانِ عالم کو اس آیہ کریمہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر

مجمع صحابہ میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تلاوت فرمائی تھی۔
وما محمد الارسول قدخلت من قبله الرسل فان مات اوقتل انقلبتم علی اعقابکم؟

(روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی۔ ۲ر جنوری ۵۳ء)

حضرت مفتی اعظم

۵۳ء کی پہلی صبح ہوئی تو ہندوستان کے مسلمانوں نے یہ خبر وحشت اثر سنی کہ دنیائے اسلام کو منور کرنے والا منارۂ عرفان و ہدایت بے نور ہو گیا۔ ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں کے مذہبی پیشوا مفتی اعظم ہند حضرت حاج مولانا مفتی محمد کفایت اللہ اس دنیا سے کوچ کر گئے اور جو شخصیت ستر سال تک مسلمانوں کے لیے مرکز رشد و ہدایت بنی رہی تھی وہ ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی۔

حضرت مفتی اعظم شاہجہاں پور کے رہنے والے تھے۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ آپ کا شمار حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم کے مخصوص شاگردوں میں ہوتا تھا۔ ۱۸ سال کی عمر ہی میں آپ نے تعلیم سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ دیوبند سے تعلیم سے فارغ ہو کر ۱۸۹۲ء میں آپ شاہجہاں پور تشریف لے گئے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ وہاں سے مولانا امین الدین صاحب آپ کو مدرسہ امینیہ میں لے آئے جس سے آپ زندگی کے آخری سانس تک وابستہ رہے اور دہلی کے ۵۰ سالہ قیام میں ہزاروں بندگان خدا نے آپ سے علوم دینی کا درس حاصل کیا۔ اگرچہ آپ مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش اور صف اول کے رہنماؤں میں شامل رہے مگر نام و نمود اور شہرت سے ہمیشہ دور رہے۔ آپ انتہائی وضع دار قسم کے انسان تھے دہلی اور یو۔پی کی اعلیٰ روایات آپ کے اندر اس درجہ موجود تھیں کہ اس دور کے انسانوں کے لیئے آپ کی سیرت و کردار ایک قابل تقلید مثال اور ایک یادگار سرمایہ تھا۔

جب آپ دہلی تشریف لائے تو دہلی کے لوگ آپ کے علم و فضل کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم ہمیشہ کھڑے ہو کر آپ کی تعظیم کیا کرتے تھے۔

مختلف الخیال علماء کرام آپ کے فتوؤں کو تسلیم کرتے اور اہمیت دیا کرتے تھے۔ سیاسی دنیا میں آپ کا نام ۱۹۱۶ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے موقع پر سامنے آیا لیکن ۱۹۱۹ء میں آپ کے مشورے سے جب جمعیۃ علماء کا قیام عمل میں آیا تو پھر اس کے بعد سے آپ کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سیاسی دنیا میں آ گیا۔ آپ ہی جمعیۃ علماء ہند کے سب سے پہلے صدر منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۳۸ء تک مستقل صدر رہے۔ حضرت مولانا احمد سعید آپ کے ہمراہ جمعیۃ علماء کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

(روزنامہ "نئی دُنیا" دہلی، ۲ر جنوری ۱۹۵۳ء)

آہ شمع گل ہوگئی

موت انسانی زندگی کا وہ مرحلہ ہے جہاں ہر انسان قدرت خداوندی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس سے دنیا کے بڑے بڑے انسانوں۔ ہفت اقلیم کے شہنشاہوں، خدائی کا دعویٰ کرنے والے فرعون و نمرود سکندر و دارا۔ قیصر و کسریٰ روما کے شہنشاہوں اور روس کے زاروں کو بھی مفر نہ ہوا۔ اور جب موت کے آہنی پنجہ نے آکر ان کا گلا دبایا تو شوکت و حشمت دولت و حکومت سطوت و ثروت کوئی چیز کام نہ آئی۔ دنیا کے جلیل القدر انسانوں۔ پیغمبروں۔ ولیوں اور متقی و پرہیزگاروں کو موت کی آغوش میں جانا پڑا اور خداوند کائنات کا یہ فرمایا پورا ہوا کہ "کُل نفس ذائقة الموت۔"

حضرت مفتی اعظم الحاج مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ نے اس پیغام برحق کو گذشتہ شب لبیک کہا اور اپنے مولا کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مفتی صاحب کی وفات اسلامی دنیا کا ایک ایسا حادثہ عظمیٰ ہے جس کے بعد دنیا کے ستر کروڑ انسانوں کے دل رنج و غم سے معمور ہو گئے ہیں ان کی نظروں اور ان کے دل و دماغ پر ایک الم و اندوہ کی گھٹائیں چھا گئی ہیں۔ انسانوں کی دنیا و عقبیٰ کے لیے ایک مشعل راہ تھی جو بجھ گئی۔ علم و عمل کا ایک آفتاب تھا جو

غروب ہو گیا۔ دین و مذہب کا ایک مجسم پیغام تھا جو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ حق و معروف کی ایک آواز تھی جواب کبھی نہ سنی جاسکے گی۔ بساط سیاست کا ایک رہنما تھا جو دنیا سے اٹھ گیا۔ اسلام کا ایک علمبردار تھا۔ جو آج ہم سے جدا ہو گیا۔ ہندوستان کی تاریخ نو کا ایک باب تھا جو ختم ہو گیا۔ قصر حریت کا ایک معمار تھا جس نے تکمیل قصر میں حصہ لیا خشت آخر اپنے ہاتھوں رکھی۔ لیکن رخصت اس حال میں ہوا کہ ساتھی قصر میں تھے اور وہ اپنے پرانے جھونپڑے میں۔ چمن آزادی کا وہ باغبان تھا جو آزادی کی بہاروں سے لطف اندوز نہ ہوسکا اور بچھڑ گیا۔ غرضیکہ ایک ایسا جلیل القدر انسان اٹھ گیا جس کے لیے کسی نے کہا ہے:

عمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا زِ بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ملک و ملت کے لیے ایک سرمایہ تھی انھوں نے پوری زندگی ایک انتھک سپہ سالار کی حیثیت سے گذاری انھوں نے اپنی تمام بے لوثی کے ساتھ ملک و ملت کی خدمت میں بسر کی۔ ان کا ہر قدم اور ہر فعل تعلیماتِ اسلامی کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ انھوں نے استخلاص وطن کے لیے جو جدوجہد کی، قید و بند کی جو صعوبتیں برداشت کیں ان کو جہاد فی سبیل اللہ سمجھ کر اور اسلام کا ایک مقدس فریضہ جانتے ہوئے وہ اپنے وقت کے ایک جلیل القدر رہنما، عظیم المرتبت پیشوا اور فقید المثال عالم دین تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دین و سیاست کے ایسے نازک ترین مسائل کو سلجھایا اور ایسی پیچیدہ گتھیوں کی عقدہ کشائی کی جن میں بڑے بڑے سیاسی رہنما اور مذہبی پیشوا اُلجھ کر رہ جاتے تھے ان کے ناخن تدبیر سے ہندوستان کی قسمت بدلنے والے بہت سے مسائل حل ہوئے ہیں۔ وہ جمعیۃ علماء ہند کے بانیوں اور آزادی کی لڑائی لڑنے والی کانگریس کو اپنے خون سے سینچنے والے قابل عزت و احترام رہنماؤں میں سے تھے۔

آج مفتی اعظم کی جدائی پر عالم اسلام ماتم کناں ہے اور آنے والے زمانہ میں سالہا سال تک سوگوار رہے گا۔ کیونکہ موجودہ دور میں علوم اسلامیہ، دین متین اور بالخصوص فقہ کی جزئیات کا رمز آشنا ان سے بڑھ کر دنیائے اسلام میں کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔ وہ عالم اسلام کی ایک مسلمہ شخصیت تھے اور اسلامی دنیا ہمیشہ اس منارۂ علم و عرفان سے رہنمائی حاصل کرتے رہی۔ وہ ایک ایسے انسان تھے جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ:

خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

مفتی اعظم کے ماتم کے لیے اگر آج ہمارے پاس آنسوؤں کے سمندر ہوں تو ہم بہائے جائیں، خود روئیں اور آپ کو رُلائیں، اور اپنے قلب و جگر کو چیر کر صفحہ قرطاس پر پیش کردیں مگر اس ماتم کے لیے عمر پڑی ہے۔ آج وقت ہے کہ ہم سب مل کر اس مرد عظیم اور نائب رسول اللہ صلعم کی زندگی سے انسانیت۔ اخوت، محبت اخلاص۔ ایثار۔ قربانی۔ خدمت، ہمت، حوصلہ، عزم و استقامت کا درس لیں۔ اور خدا سے دعا کریں کہ وہ اس مرد جلیل کی قبر پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے۔ ہم سب کو اس کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے اور ہم صبر و استقلال کے ساتھ مسلمانان ہند کی زندگی کے لیے ایک ایسے شاندار مستقبل کی تعمیر کریں جس کے لیے مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ زندگی بھر کوشاں اور دعا کناں رہے۔

(روزنامہ "نئی دنیا" دہلی ۳؍ جنوری ۵۳ء)

مفتی کفایت اللہؒ

مولانا مفتی کفایت اللہ کے انتقال کی خبر صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ سارے عالم اسلام میں نہایت ہی غم واندوہ کے ساتھ سُنی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مرحوم کے سیاسی مسلک سے کسی حلقے کو اختلاف ہو لیکن مفتی صاحب کے علمی تبحر، اور دیانتداری و راست بازی سے اُن کا بدترین مخالف بھی انکار نہیں کر سکتا۔ وہ ان علمائے حق میں سے تھے جنھوں نے اپنی زندگی حصولِ علم اور اشاعت علم کے لیے وقف کردی۔ انھوں نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ساتھ غیر ملکی اقتدار کے خلاف اعلانِ جہاد کیا اور اس وقت تک سرگرم عمل رہے

جب تک فرنگی اقتدار کا قلع قمع نہ کرلیا۔ اُن کی زندگی اور اُن کا عمل مسلمانانِ ہند کے لیے ہمیشہ مشعل ہدایت ثابت ہوا۔ وہ محض مفتی دین نہ تھے بلکہ اپنے ذاتی اعمال اور نجی زندگی میں بھی دین کے احکامات کی پابندی اور شرع مبین پر عمل در آمد کے سلسلے میں ان کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ انھوں نے جو کچھ کہا اس پر عمل بھی کیا۔ ان کے قول و عمل میں بڑا انطابق تھا۔ اور یہ بات ان دِنوں بڑی عنقا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ نکتہ بڑا اجاگر ہے کہ ان کے مذہبی رہنما محض "کٹھ ملا" کبھی نہیں تھے۔ بلکہ اس کے برعکس علمائے دین نے سیاست اور مذہب دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلنے کی سعی کی۔ چنانچہ وہ اگر ایک طرف فرنگی اقتدار کی بے دینی اور لامذہبیت کے خلاف صف آرا ہوئے تو دوسری طرف انھوں نے سیاسی اعتبار سے حق خود ارادیت اور آزادی و خود مختاری کی ہمیشہ حمایت کی۔ ان کی بغاوت محض ملائیت اور تنگ نظری کی مرہون منت نہ تھی، بلکہ اس کے پیچھے اسلام کی حریت پرور روایات اور آزادی، ترقی و خود مختاری کے زرّیں اصول اور اعلیٰ قدریں کار فرما ہیں۔ مفتی صاحب اُن صالحین میں سے تھے جن کا کردار اور جن کا عمل ہر اعتبار سے مکمل اور لائق تقلید تھا۔ وہ عالم دین تھے اور انھوں نے اپنی زندگی میں بہت سے علماء کو تعلیم دی۔ وہ آزادی کے علمبردار تھے اور ہمیشہ آزادی کے لیے نبرد آزما رہے۔ ہندوستان خواہ ہندوؤں ہی کے قبضہ میں کیوں نہ آجائے، اور خواہ تنگ نظر لیڈر اور متعصب وزرا اس پر حکمرانی کیوں نہ کریں، یہ حقیقت بہر حال ہے کہ اس ملک کو آزاد کرانے اور اس کے باشندوں کو آزادی کی نعمت سے متعارف کرانے میں مسلمان علماء کا بڑا دخل ہے۔ اور ان علماء میں مفتی کفایت اللہ مرحوم کا نام سب سے نمایاں اور سب سے ممتاز ہے۔

ہم ایک ایسے دَور میں رہتے ہیں جب ایک نسل اپنے متقدمین سے قطع تعلق کر رہی ہے اور کلچر یا تہذیب کی اُن قدروں کو روند رہی ہے، جو دراصل انسانیت اور تمدن کے ارتقاء کی روحِ رواں ہیں۔ ایسے زمانے میں مفتی صاحب جیسے بزرگوں کا اُٹھ جانا بڑا عذاب ہے۔ اُن کی موجودگی نئی نسل کی تربیت اور تعلیم کے لیے ضروری تھی۔

لیکن خدا کی مصلحتیں خدا ہی جانے۔ انسان یہاں بے بس و لاچار ہے۔ اور سوائے دعا کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے، اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل دے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(روزنامہ "امروز" کراچی، ۱۴؍جنوری ۱۹۵۳ء)

مولانا مفتی محمد کفایت اللہؒ

ایک دیا اور بجھا دیا اور بڑھی تاریکی

دُنیائے اسلام میں یہ خبر انتہائی رنج والم کے ساتھ سنی گئی ہے کہ موجودہ دَور کی عظیم شخصیت مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی کچھ عرصہ بیمار رہ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کی عمر ۷۵ سال تھی، کل آپ قطب صاحب (مہرولی) کے قبرستان میں سپردِ خاک کردیئے گئے۔ حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہ برّ صغیر پاک و ہند کے ممتاز رہنماؤں ے تھے۔ آپ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ممتاز تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ اہل علم و فضل آپ کو "ابو حنیفہ وقت" کے لقب سے پکارتے تھے۔ طبیعت کی سادگی اور زہد و اتقاء آپ کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ آپ ہندو پاک میں افتاء کے امام تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے اجلاسوں میں جب کسی موضوع پر بحث ہوتی تو حضرت مفتی صاحب نہایت متانت اور ٹھنڈے دل کے ساتھ ہر ایک رکن کی بحث سنتے، جب بات ختم کرنا ہوتی تو آپ لمبی چوڑی بحث کو ایسے سادہ جملوں میں سمودیتے کہ اراکین حیران رہ جاتے۔ قرار دادیں مرتب کرنا ہوتیں تو بھی ایسے سہل، سادہ اور مختصر الفاظ استعمال کرتے کہ کسی ممبر کو پھر ضرورت تک محسوس نہ ہوتی تھی کہ آپ کی تحریر کا کوئی جملہ کاٹا جائے یا کسی حرف کی جگہ دوسرا حرف استعمال کیا جائے۔

آپ اپنے آخری دَم تک تمام فتاویٰ کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھ

کر دیتے۔ آپ کا خط بے حد خوشنما تھا۔ تحریر یوں دِکھائی دیتی گویا موتیوں کی لڑیاں ہیں، جو پورے سلیقے اور قرینے کے ساتھ پروئی گئی ہیں۔ اپنی تحریر میں زبان سادہ استعمال کرتے، علامۃ الدہر اور مفتی اعظم ہونے کے باوجود چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے نہایت سہل زبان میں تعلیم الاسلام کے رسالے تحریر فرمائے جو تعلیمی اداروں میں بے حد مقبول ہیں اور پاکستان کے سرکاری اسکولوں میں بھی پڑھائے جاتے ہیں۔

آپ نے اپنی زندگی کے ایام محض "حجرۂ تنہائی" میں چھپ کر نہیں گذارے بلکہ ہندوستان کو انگریزی سامراج سے نجات دلانے اور حصولِ آزادی کے لیے آپ نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں! آپ کے نحیف و ناتواں جسم نے ملتان، منٹگمری کے علاوہ ہندوپاک کی کئی جیلوں کی سختیاں برداشت کی تھیں!

قیامِ پاکستان اور ملکی تقسیم کے بعد آپ اگرچہ ہندوستان میں رہ گئے تھے۔ مگر فتاویٰ کے حصول کے لیے مسلمانانِ پاکستان کو بالآخر آپ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔

آپ کی زندگی علم وفضل کا ایک سایہ تھی اور اب یہ سایہ اٹھ جانے کے بعد دُور تک تاریکی ہی دکھائی دیتی ہے:

دُور تک کوئی ستارا ہے نہ جگنو باقی
مرگِ اُمید کے آثار نظر آتے ہیں!

حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے لیے تمام مسلمان بالعموم اور مجلس احرار اسلام سے تعلق رکھنے والے حضرات بالخصوص ختم قرآن مجید کر کے ایصالِ ثواب کریں اور آپ کے حق میں دُعاء مغفرت کریں، اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کے درجات بلند کرے اور آپ کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

(روزنامہ "آزاد" لاہور۔ ۴ جنوری ۵۳ء)

ایک بڑا ستون گرگیا

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینے ہماری دینی و ملی عمارت کا ایک بڑا ستون گر گیا۔ اور ۳۱ دسمبر ۵۲ء کی شب کو حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم نے انتقال فرمایا۔ مفتی صاحب مرحوم اپنے فضل و کمال، دین و تقویٰ اور فہم و فراست کے لحاظ سے طبقہ علماء میں نہایت ممتاز اور منفرد شخصیت رکھتے تھے۔ دینی علوم خصوصاً فقہ و فتاویٰ میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ ان کی پوری زندگی علم دین کی خدمت میں گزری۔ اور وہ نصف صدی سے زیادہ درس و افتا کی مسند پر فائز رہے۔ دہلی کی مشہور دینی درسگاہ مدرسہ امینیہ کے صدر مدرس بلکہ اس کے جزو کل تھے اور یہ مدرسہ انھیں سے عبارت تھا۔ اس علم و تقویٰ کے ساتھ وہ ایک مجاہد کا دل اور مدبر کا دماغ رکھتے تھے۔ خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے زمانے سے لے کر ہندوستان کی آزادی تک تمام مذہبی و ملّی اور قومی و سیاسی تحریکوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا۔ ایک زمانے تک جمعیۃ العلماء کے صدر اور کانگریس کے رُکن رکین رہے اور ان دونوں کو ان کی رہنمائی سے بڑا فائدہ پہنچا۔

مرحوم کا دماغ بڑا نکتہ رس اور سلجھا ہوا تھا۔ اور ان کی رائے نہایت متین اور صائب ہوتی تھی۔ پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیوں کو اپنی فراست سے سلجھا دیتے تھے۔ اس لیے مذہبی اور ملکی و سیاسی دونوں جماعتوں میں ان کا بڑا وزن تھا۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں ان کا خاص حصہ ہے۔ ملکی سیاست میں وہ اخیر تک کانگریس کے ہم خیال رہے۔ لیکن جب سے اس پر فرقہ پرستوں کا غلبہ ہو گیا تھا اور اس میں مسلمانوں کی کوئی حیثیت اور ان کی قربانیوں کی کوئی قدر باقی نہ رہ گئی تھی، عملاً اس سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ طبعاً نہایت سنجیدہ و متین تھے۔

اگرچہ مرحوم عمرِ طبعی کو پہنچ چکے تھے۔ انتقال کے وقت ۷۹ سال کی عمر تھی۔ مگر اب طبقہ علماء میں ایسی جامع الحیثیات کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ اس لیے ان کی موت ہندوستان کے مسلمانوں کا بہت بڑا قومی حادثہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پیکر علم و عمل کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔

(ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ۔ فروری ۵۳ء)

مفتی صاحبؒ

دہلی کی خبر ہے کہ عین جس وقت سال عیسوی رخصت ہو رہا

تھا۔ ۳۱ر دسمبر اور یکم جنوری کی درمیانی شب میں (شب پنجشنبہ) مفتی صاحبؒ نے رحلت فرمائی۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

کون مفتی صاحب؟ مفتی کفایت اللہ صاحب سابق صدر جمعیۃ العلماء آج سے ۲۵-۳۰ سال قبل جب خلافت کمیٹی کا دورِ عروج تھا۔ مطلق مفتی صاحب سے مراد یہی مفتی صاحب ہوتے تھے نام لینے کی حاجت بھی نہ تھی اور اس کے بعد بھی مدتوں یہی حال رہا۔

علالت اور نازک کی خبریں بھی ہفتوں سے آرہی تھیں اس لیے دل اس آخری خبر کے سننے کے لیے بھی تیار تھا۔ لیکن اس تیاری سے بھی واقعہ کی اہمیت اور صدمہ کی شدت میں کوئی نہیں ہو جاتی۔ فقیہہ آج ہر وہ شخص سمجھا جاتا ہے جسے عالمگیری، شامی وغیرہ کے جزئیات حفظ ہوں۔ مفتی صاحب مرحوم اس عامیانہ مفہوم میں نہیں بلکہ واقعۃً فقیہہ تھے یعنی شریعت کے ہر چھوٹے بڑے مسئلہ پر تفقہ سے کام لینے والے۔ اور ان کی ذہانت ایسی تھی جیسے امام ابو حنیفہؒ کے ایک شاگرد رشید کی ہونی چاہیے۔ باریک مسائل کی تہ تک وہ بات کی بات میں پہنچ جاتے۔

مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسوں میں بارہا یہ نظارہ دیکھنے میں آیا کہ کسی مسئلہ میں شدید اختلاف ہے اور دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف بُری طرح الجھے ہوئے ہیں کہ مفتی صاحب نے ادھر توجہ فرمائی اور چند منٹ کے اندر ایسا آسان حل نکال دیا جس پر فریقین بخوشی متحد ہو گئے۔

ان کے رسالے تعلیم الاسلام کے نام سے گو بظاہر صرف مبتدیوں کے لیے ہیں۔ لیکن درحقیقت متوسطوں اور منتہیوں سب کے کام کے ہیں۔ ایک بڑی بات یہ تھی کہ باوجود پختہ نیشنلسٹ اور قوم پرور ہونے کے وہ اپنی اسلامیت اور اپنے عقائد میں بھی متشدد آخر تک رہے۔ یہ نہ ہونے پایا کہ سیاست کی رو میں بہ کر اپنے مقتضیات و مطالبات ایمانی میں کسی قسم کا ڈھیلا پن آجانے دیا ہو۔ اور وصف ایسا ہے۔ جو ان کے معاصرین میں کمتر ہی کسی میں پایا جاتا ہے۔ جوش اور ہوش اور فہم و فراست و تدبر کا اتنا خوشگوار امتزاج بھی نادر ہی کہیں دیکھنے میں آیا ہے۔ تواضع و انکسار، خوش خلقی، مہمان نوازی وغیرہ کے اوصاف حسنہ اس پر مستزاد۔

حالات سے بددل ہو کر ایک عرصے سے گوشہ نشین سے ہو گئے تھے۔ عمر ۷۵ اور ۸۰ کے درمیان تھی۔ بحیثیت مجموعی اپنے کمالات کے لحاظ سے اپنی نظیر بس آپ تھے۔ اللہ بلند سے بلند مراتب سے سرفراز فرمائے۔

("صدق جدید"۔ ۹ر جنوری ۵۳ء)

مفتی کفایت اللہ مرحوم

مفتی کفایت اللہ کو مرحوم لکھتے ہوئے جگر شق ہوتا ہے۔ اس چھوٹے سے قد کے منحنی شخص کے علم و تفقہ سے برصغیر ہندو پاکستان کی پرخروش زندگی کے ۳۰ برس متاثر ہوتے رہے۔ ان کا علم و تفقہ کا تعلق تو حضرات علماء سے تھا۔ جو دینی مسائل میں ان کو اپنا رہنما سمجھتے تھے۔ لیکن ان کی اصابت رائے۔ ان کا عزم و تحمل۔ ان کا صبر و توکل، ان کی جرأت و ہمت اور استقلال و استقامت ایسے اوصاف تھے جن سے اس ملک کی پوری زندگی متاثر ہوئی۔

تحریک خلافت کے زمانے سے لے کر تقسیم ملک اور اس کے بعد تک وہ جمعیۃ علمائے ہند کے صدر رہے۔ اور اس کی پالیسی کو معتدل اور متوازن رکھنے میں ان کے شخصی اوصاف کافی حد تک کار فرما رہے۔ مسلمانوں کے قانونی حقوق ہوں یا دینی۔ آزادیٔ وطن کی تحریک ہو یا فرقہ وارانہ قضیے وہ حتی الوسع جمعیۃ علمائے ہند کو انتہا پسندی اور رجعت دونوں سے روکتے رہے۔ ان کے سامنے بڑے بڑے علماء ان سے فقہی مسائل میں خم کھاتے تھے۔ ان کی نظر نہایت وسیع اور دقیق تھی۔ تقسیم کے بعد بھی انھوں نے بھارت کے مسلمانوں کو سنبھالنے میں غیر معمولی جرأت و ہمت سے کام لیا۔ آخری چند سالوں سے وہ خرابیٔ صحت کے باعث تمام سیاسی اور دوسری گرمیوں سے الگ ہو گئے تھے۔ افسوس کہ حال ہی میں ان کے انتقال کی خبر آگئی۔ اور عالم اسلام ایک بلند پایہ عالم دین کے وجود سے خالی ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ مفتی صاحب مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں انؔ کو جگہ بخشے۔ ہم مرحوم کے اعزہ کی خدمت میں دلی

تعزیت پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو صبر جمیل عطا کرے۔

(سہ روزہ "کوثر" لاہور۔ ۱۴ر جنوری ۵۳ء)

مفتی صاحبؒ مسلمانوں کے رہنما تھے

جمعیۃ علماء ہند کے (سابق) صدر مفتی کفایت کا انتقال نہ صرف دہلی بلکہ سارے ہندوستان کے لیے ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی کبھی نہیں ہوگی۔ مفتی کفایت اللہ نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے چوٹی کے مذہبی رہنما تھے۔ بلکہ قوم پرستوں کی صفوں میں بھی وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی ہر ایک جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا۔ برسوں کانگریس کے ایک سرگرم رہنما رہے۔ فرقہ وارکشیدگی کے کسی دور میں ان کے قدم متزلزل نہیں ہوئے۔ مسلم لیگ نے ان کے خلاف کیا کچھ پراپیگنڈہ نہیں کیا۔ لیکن وہ کبھی خوف زدہ نہ ہوئے۔ اور بڑے سے بڑا لالچ انھیں اپنے اعتقاد سے گرا نہیں سکا۔ مفتی صاحب کچھ دنوں سے گوشۂ تنہائی اختیار کر چکے تھے۔ اس کی وجہ ایک تو عمر کا تقاضہ تھا۔ دوسرے وہ کچھ عرصہ سے بیمار رہے تھے۔ اسی بیماری نے انھیں ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا کر دیا۔ دہلی والوں کے لیے لالہ دیش بندھو گپتا کے بعد یہ ایک دوسرا صدمہ ہے۔ جن لوگوں سے دہلی کی تہذیب کی صدق دلی، محبت اور خلوص کی روایات وابستہ تھیں وہ یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہوتے جا رہے ہیں اور اس لحاظ سے دہلی غریب ہوتی جا رہی ہے۔ تیج کو مفتی صاحب کے پریوار سے اس صدمۂ جانکاہ میں دلی ہمدردی ہے۔

(روزنامہ "تیج" دہلی ۳ جنوری ۵۳ء)

مفتی کفایت اللہؒ

سال گزشتہ کے آخری دن دہلی میں اپنی قدیم سکونت گاہ پر مفتی کفایت اللہ کی وفات ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اُس ملک کو جس سے انھیں انتہائی محبت تھی اور جس کی انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں حسرت کے ساتھ خیر باد کہہ رہے تھے۔ مفتی صاحب مرحوم ایک جید عالم تھے۔ ان کی اعلیٰ علمی و دینی قابلیت اور تفقہ فی الدین کی وجہ سے ان کے ارشادات اس قدر وزنی اور مستند تھے کہ مشرق وسطیٰ تک آپ کی شہرت پھیل گئی تھی۔ مسلم رہنماؤں کے ایک عالمی اجتماع کی صدارت جو قاہرہ میں ہوا تھا آپ ہی نے کی تھی۔ آپ کے علم و فضل اور تدبر سے صرف آپ کے ہم مذہب ہی فیضیاب نہیں ہوئے بلکہ اپنے وطن کی اعلیٰ اور ناقابل فراموش خدمات کی وجہ سے محبان وطن میں آپ کو وہ ممتاز اور درخشندہ مقام حاصل ہوا کہ اس کی روشنی سے دوسرے بھی مستفید ہوئے۔ آپ نے سیاست سے اجتناب کیا لیکن اُن ضروری سیاسی فرائض کو جو ہندوستانی شہری ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتے تھے کبھی پس پشت نہیں ڈالا انھوں نے اپنے آپ کو سب سے پہلے ایک ہندوستانی سمجھا۔ نیز کبھی ان کے اس یقین میں کمزوری پیدا نہیں ہوئی کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہندوستانی قومیت کے لیے ایک بنیادی اصول ہے۔ ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ کے وقت سے دہلی میں آپ ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی جنگ آزادی کے اگلے مورچوں پر لڑنے والے مرد مجاہد تھے۔ اور اسی شہر دہلی میں ۱۹۴۰ء میں آزاد مسلم کانفرنس کے پہلے اجلاس میں حضرت مفتی صاحب نے وہ مشہور قرارداد پیش کی تھی۔ جس کا مقصد اس الزام کی تردید کرنا تھا کہ مسلمان آزادی کے خلاف ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی ذات بابرکات ہی اُس دو قومی نظریہ کی ایک واضح تردید تھی جس کے نتیجے میں ہندوستان تقسیم ہوا۔

سیاسی درجہ کے لحاظ سے آپ مرحوم حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کے ہم پایہ تھے اور دینی طور پر مولانا آزاد کے سیاسی اور روحانی ہر دو حیثیت سے مرحوم مفتی صاحب نے جو شہرت اور مقام حاصل کیا اور ملکی و قومی مفاد کے لیے جو خدمات حسنہ انھوں نے انجام دیں ان کے پیش نظر وہ اپنے پیچھے کئی ایک ناقابل فراموش یادیں چھوڑ گئے ہیں اور وہ نام پیدا کر گئے ہیں کہ ان کی یاد آتے ہی ہر ہندوستان کا سر تعظیم و احترام میں جھک جایا کرے گا۔

("ہندوستان ٹائمس" ۳ر جنوری ۵۳ء)

مفتی کفایت اللہ مرحوم

ہندوستان کے معزز عالم مفتی کفایت اللہ کی وفات کی خبر پاکستان کے مختلف حلقوں میں رنج و افسوس کے ساتھ سنی گئی ہے۔ مولانا موصوف جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر تھے، اور اس حیثیت سے انھوں نے سیاسی سرگرمیوں میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ مفتی کفایت اللہ ایک عالم دین کی حیثیت سے اس برعظیم کے علماء میں ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے فقہ، حدیث اور تفسیر کے میدان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اس برعظیم کی گذشتہ سیاسی تحریکات میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور اپنی زندگی انگریز سامراج کے خلاف جدوجہد کے لیے وقف کردی، اس سلسلہ میں انھیں بارہا قید و بند کے مصائب سے بھی دوچار ہونا پڑا۔

ایک عالم دین کی رحلت ملی سانحہ ہوا کرتی ہے۔ ہم اس سانحہ پر اظہار افسوس کے سوا اور کیا کرسکتے ہیں۔ مشیت ایزدی بہر صورت اٹل ہے۔

("آفاق" لاہور۔ ۸ر جنوری ۵۳ء)

مولانا مفتی کفایت اللہ رح کا انتقال

یہ خبر پاکستان اور بھارت بلکہ پوری دنیائے اسلام میں عمیق رنج واندوہ کے سنی گئی ہوگی کہ متحدہ ہند کے مشہور عالم مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا اور جوار رحمت الٰہی میں پناہ لے لی۔

مفتی صاحب مرحوم علم و تقویٰ، کے اعتبار سے پوری دنیائے اسلام کے دینی حلقوں میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ان کی نظر علوم فقہ میں نہایت وسیع تھی۔ شاہ جہاں پور کے رہنے والے تھے۔ بعد میں دہلی چلے آئے اور اپنے علم تقویٰ اور اصابت رائے کے باعث طبقہ علماء میں ممتاز ترین مقام پر فائز ہوگئے۔ جرأت ہمت کے اعتبار سے بھی وہ صف اول میں تھے۔ اور زندگی بھر جب تک کہ ان کی صحت نے مساعدت کی وہ جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر رہے۔

مفتی صاحب مرحوم نے خلافت اور آزادئ ہند کی تحریک میں پورا حصہ لیا۔ اور قید و بند کی صعوبتیں بھی ان کی راہ نہ روک سکیں۔ نہایت سادہ مزاج، مرنجاں مرنج اور بے غرض آدمی تھے۔ ان کے انتقال سے علم کی جو مسند خالی ہوئی ہے۔ اس کو پُر کرنا مدتوں مشکل ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کو صالحین امت میں شمار فرمائے۔

("تسنیم" کراچی۔ ۹ر جنوری ۵۳ء)

مفتی اعظمؒ

ایسی ہستیاں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی ہیں جن کی موت کے بعد دنیا اپنے آپ کو یتیم تصور کرنے لگتی ہے۔ ایسی شخصیتیں نہ معلوم کس مٹی سے ڈھالی جاتی ہیں کہ علم و عمل کی مسند پر شمع روشن بن کر جگمگاتی ہیں۔ اور جب یہ شمعیں گل ہوجاتی ہیں تو ایک عالم کی آنکھوں کے سامنے اندھیاریاں پھیل جاتی ہیں۔

عمر ہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

حقیقت یہ ہے کہ حضرت العلامہ مفتی کفایت اللہ کی وفات حسرت آیات نے خادمان علم کی کمر توڑدی ہے۔ آج دنیائے اسلام اپنے آپ کو یتیم پاتی ہے اور فقہ و شریعت کی مسند سونی ہوگئی ہے۔

حضرت العلامہ کی موت ایک ایسی موت ہے جس کے ماتم کے لیے الفاظ نہیں، جس کو رونے کے لیے آنسو نہیں اور جس کے غم واندوہ کے اظہار کے لیے قلم کو یارا نہیں۔ موت ایک حقیقت ابدی ہے۔ اس سے کسی کو مفر نہیں۔ جس نے وجود کا جامہ پہنا ایک نہ ایک دن اس کا یہ جامہ چاک ہوا۔ البتہ کچھ برگزیدہ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کی جدائی کا صدمہ ان کے گھر والوں سے زیادہ باہر کے لوگوں کو ہوتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ایسوں کی زندگی زندگی اور موت موت ہوتی ہے۔

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
ورنہ دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

جنگ آزادی کا رہنما آئینی و دستوری سیاسیات کا مدبر و مفکر، علم کے بحر ناپیدا کنار کا شناور، رسم وراہ عمل کا رمز آشنا۔ تقویٰ و تقدس کا پیکر روحانی، اس جامع الصفات کا دوسرا نام تھا کفایت اللہ! وہ کفایت اللہ جس کی علمی وفقہی بصیرت نے صرف ہندوستان کے حدود ہی پر کفایت نہیں کی بلکہ ان حدود سے باہر نکل کر اسلامی دنیا سے خراج عقیدت وصول کیا۔ اور قاہرہ میں علماء و فضلاء کے ایک بین الاقوامی علمی و سیاسی مجمع کی رہنمائی کی — آہ! وہ کفایت اللہ، وہ فقیہہ بے مثال، حق و صداقت کا وہ پیکر، حریت کا وہ پیشوا، حب الوطنی کا وہ جذبۂ مجسم آج ہم میں نہیں ہے۔ آج ساری دنیائے اسلام میں ماتم بپا ہے — یہ ماتم یقینی اور ناگزیر ہے۔ دین مبین کا ہر پیرو اس میں شریک ہے۔ دنیائے علم وعمل میں آہ و نالہ کا شور ہے، قوم پرستوں کی محفل میں اُداسی چھائی ہوئی ہے، کیونکہ علم و کمال کا خزانہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے لوٹ لیا، جنگ آزادی کے سورما پر صیاد اجل نے تیر چلایا، اور عظمت اسلاف کی زندہ نشانی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے پہلو میں ہمیشہ کے لیے سو گئی — لیکن کیا ان کی زندگی ہمارے سامنے نہیں، کیا ان کی حق پسندی اور صداقت دوستی ہمارے لیے پیغام عمل نہیں، کیا ان کا مشن بھی ان کی زندگی مستعار کی طرح عارضی تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ زندۂ جاوید ہیں۔ ان کا مقصد اب بھی زندہ ہے اور ان کی اسپرٹ غیر فانی ہے۔ اس لیے ہمیں ان کے ماتم سے جلد از جلد فارغ ہو کر علم و دین کی اشاعت و تبلیغ کا بیڑا اٹھانا چاہیے۔ یہی ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ جس خدا کے دین و شریعت کے وہ مبلغ تھے وہ خدا ہمیں اپنی طرف بُلا رہا ہے، وہ دین قیم آج بھی ہماری تغافل شعاریوں پو نوحہ کناں ہے۔ کوچہ چیلاں (دہلی) میں جس خدا کے چھوٹے سے گھر کے منبر کی وہ زینت تھے۔ اسی خدا کی ہزاروں مسجدیں ہماری بے عملی کا مرثیہ پڑھ رہی ہیں۔ جس علم دین کے ایک چھوٹے سے مدرسے (مدرسۂ امینیہ) سے وہ نبی خاتم کی شریعت کا پیغام دیا کرتے تھے۔ اسی علم دین کے سینکڑوں گہوارے آج نزع کے عالم میں ہیں پس ماتم کرنے والوں کو اگر واقعی مفتی اعظم کی جدائی کا صدمہ ہے تو اُن کی یادگار اسی صورت میں قائم کی جاسکتی ہے کہ اُن کے مقصد اور اُن کے مشن کو سمجھا جائے، اس پر عمل کیا جائے اور اس کو آگے بڑھایا جائے۔ اسی ایک بات میں مفتی صاحب سے ہمارے تعلق اور ہماری محبت کی آزمائش ہے۔

(سہ روزہ "مدینہ" بجنور۔ ۹ر جنوری ۵۳ء)

آہ! مفتی اعظمؒ

آہ!...... دنیائے اسلام کا جلیل القدر فرزند موت کی ابدی آغوش میں آرام کی نیند سو گیا۔ فقیہہ وقت مفکر جلیل۔ مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ صاحبؒ نہ صرف ہند و پاکستان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ ساری دنیائے اسلام ان کے علم و کمال کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان تھی۔ بڑے بڑے فقہی مسائل مرحوم اپنی معمولی جنبش قلم سے حل کر دیا کرتے تھے۔ جن مسائل و فتاویٰ کے جواب میں دیگر علماء ورق کا ورق سیاہ کر دیا کرتے تھے۔ ان کا جواب وہ بسا اوقات ایک جملہ اور ایک سطر میں دے دیا کرتے تھے۔ مرحوم کتنی باریک بیں نظر کے مالک تھے اس کا اندازہ لگانا بجائے خود کچھ کم دشوار نہ تھا۔ لیکن اس تجر علمی کے باوجود مولانا کی سادگی پر قربان ہونے کو جی چاہتا تھا۔ مولانا کے نیاز مندوں نے اکثر یہ منظر دیکھا ہے کہ گرمی کا زمانہ ہے۔ اور یہ جلیل القدر انسان اپنے دونوں ہاتھوں میں لکڑیوں کا ڈھیر لیے ہوئے اپنے مکان کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اس وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا تھا کہ علم انسان پر حاوی ہے یا انسان علم پر۔ مولانا مرحوم کتنی جامع شخصیت کے مالک تھے اس کا کچھ وہی لوگ بہتر اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جنھیں اکثر و بیشتر ان سے ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔

مولانا مرحوم فقیہہ و عالم ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ کے سیاستداں بھی تھے۔ آپ نے تحریک خلافت و ملکی آزادی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ برسوں جمیعۃ العلمائے ہند کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں۔ متعدد بار جیل کی صعوبتیں بھی

برداشت کی ہیں۔ لیکن صبر و شکر کا ہمیشہ یہ عالم رہا ہے کہ پبلک تقریریا نجی گفتگو میں کہیں پر اور کبھی بھی حد سے بڑھی ہوئی مشقتوں کا گلہ و شکوہ نہیں کیا۔ قلم میں طاقت نہیں کہ وہ اس عظیم المرتبت عالم کی گونا گوں خوبیوں کو سپردِ تحریر کر سکے۔

مولانائے مرحوم کی رحلت سے علم و فقہ کی دنیا میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پر ہونا آسان نہیں خدا اس نیک سیرت انسان کی قبر کو انوار کی بارشوں سے معمور کردے اور اس فرشتہ صفت انسان کی روح کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

(روزنامہ "خلافت" ممبئی۔ ۴ر جنوری ۵۳ء)

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

عین اُس وقت جب کہ نئے سال کے آغاز میں پورے دو گھنٹے بھی باقی نہ تھے، دہلی کی فضاؤں سے ایک آفتابِ علم و حکمت غائب ہو گیا۔ اور وہ روشنی جو نصف صدی سے زائد مدت تک زندگی کے بہترین گوشوں کو منور کر رہی تھی۔ دفعتہً نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گئی! آہ! وہ علم و دانائی تدبر و تفکر اور تقویٰ و پرہیزگاری کا پیکر مثالی، جسے مفتی اعظم علامہ محمد کفایت اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام سے پوری دنیائے اسلام اور ہندوستان کے تمام نمائندگانِ اخلاق و سیاست کی بصیرت کی نگاہیں بخوبی جانتی اور سمجھتی ہیں۔ اور جس کی صداقت شعاری و ایثار پیشگی پر دیانت و امانت کا ضمیر ہمیشہ بے لاگ شہادتیں پیش کرتا رہا ہے۔

حضرت مفتی اعظم جہاں علوم دینیہ میں پوری دنیائے اسلام کے لیے ایک ممتاز اور قائدانہ حیثیت رکھتے تھے، وہاں ان کی ذاتِ گرامی پر حریت و استقلال کی تحریکات کو بھی انتہائی فخر تھا، وہ ہندوستان میں علم و اخلاق کے بھی بلند مرتبہ ترجمان تھے۔ اور اس کی تحریکِ آزادی کے بھی بیدار مغز، بہادر اور بیباک سپہ سالار تھے۔ ان کے سینے میں ہندوستان کی غلامی کے خلاف جذبات کا جو دریا موجزن رہتا تھا اس کا محرک سیاسی اقتدار کے حصول کی خواہشیں اور اقتصادی برتری کی تمنائیں نہ تھیں۔ وہ انسانیت کو اس کے حقیقی مقام پر دیکھنا چاہتے تھے، ان کا پاک ضمیر انسانوں کے لیے انسانوں کی غلامی کی گندگی کا تصور بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور انھیں پاکیزہ ترین محرکات نے انھیں عمل و کردار کے میدانوں میں ہمیشہ فائز و کامیاب رکھا، یہ صحیح ہے کہ وہ اپنی جدو جہد آزادی کے نتائج کو صورتاً بھی نمایاں دیکھنے کے متمنی تھے۔ اور یہ انسانی فطرت کے منافی بھی نہیں لیکن ایک انتہائی حق پرست اور مخلص انسان کی حیثیت سے اعلاء کلمۃ الحق ہی اُن کا حقیقی مقصد تھا۔ اور اس مقصد کے حصول میں وہ کبھی اور کسی مرحلہ پر بھی ناکام نہیں رہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

کانگریس کی تاسیس میں ان کی زندگی کا بہترین سرمایہ صرف ہوا، اُن کے منحنی اور انتہائی ضعیف و لاغر جسم کو متعدد بار جیل کی سلاخوں کے پیچھے قید و بند کے فرائض ادا کرنا پڑے، اس لیے نہیں کہ ہندوستان سے انگریزی اقتدار کا خاتمہ ہو گا، تو مسندِ اقتدار پر انھیں بھی جلوہ آرائیوں کے مواقع نصیب ہوں گے بلکہ محض اس لیے کہ غلامی کی لعنت کی موجودگی ان کے نزدیک انسانیت کی ایک ناقابلِ برداشت توہین تھی، اور اُن کی روح کی یہ خواہش تھی کہ بلا امتیاز مذہب و ملت ہندوستان کا ہر باشندہ بجز خدائے بزرگ و برتر کی بندگی و غلامی کے اور کسی طاقت کا غلام نہ رہے۔ اور ہندوستان میں انسانی مجد و شرف کا پرچم ہر سمت اور ہر مذہب و ملت کے سروں پر لہراتا ہوا نظر آئے مرحوم اپنے ان بلند و بالا مقاصد میں از اول تا آخر یقیناً کامیاب رہے۔ اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے صورتاً بھی اپنی قربانیوں کے ثمرات کا مشاہدہ کر لیا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کی تفصیل اس موقع پر نہ پوچھیے۔ ۱۵ر اگست ۴۷ء کی صبح کو خون میں نہاتا ہوا آفتابِ آزادی اُن کی آنکھوں کے سامنے طلوع ہوا اور انھوں نے دہلی ہی کے گلی کوچوں، میدانوں اور بڑے بڑے بازاروں میں اس "انسانیت" کا مشاہدہ کر لیا، جس کی تمناؤں میں اُن کی زندگی ہمیشہ وقف رہی!

آزادی کی مسرتیں کانگریسی ہندوستان کے چپہ چپہ پر اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے اُسے حصول

آزادی کے بعد تحریک آزادی کے اس مردِ مجاہد کے چہرے پر بھی کوئی حقیقی مسکراہٹ نظر آئی؟ کیوں نہیں آئی؟ یہ ضمیر انسانی ہی بتا سکتا ہے۔

بہر حال ہم بارگاہ خداوندی میں دست بدعا۔ ہیں کہ وہ مرحوم کی قبر کو اپنی نوازشوں اور انوار و برکات سے بھرپور فرمادے۔ اور ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اُن کے بتائے ہوئے صداقت و حق پرستی کے راستے پر پورے یقین کے ساتھ چلتے رہیں۔

(ہفت روزہ "بے باک" سہارنپور۔ ۷ر جنوری ۵۳ء)

وماکان قیس هلکه هلک واحد ولکنه بنیا قوم تهدما

مولانا الحاج مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا حادثہ رحلت مذکورہ بالا شعر کا صحیح مصداق ہے۔ مفتی صاحبؒ صرف ایک عالم و مفتی ہی ہوتے تو صبر کیا جاسکتا تھا کہ ابھی ہندوستان عالموں اور مفتیوں سے خالی نہیں۔ وہ صرف سیاستداں اور میدان آزادی کے مجاہد ہوتے تب بھی کوئی زیادہ افسوس نہ تھا کہ ملک میں ابھی بہت بڑے بڑے مجاہد و بہادر موجود ہیں جو اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ اسی دشت کی سیاحی میں گزار چکے ہیں۔ مفتی صاحب صحیح طور پر۔

لیس علی اللّٰہ بمستبعدٍ
ان یجعل العالم فی واحد

کے مصداق تھے۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو جوانی ہی میں ملک کے مشاہیر کی صف اول میں شمار ہونے لگے تھے۔ وہ جہاں عالم و مفتی تھے وہاں مقنن و سیاست داں اور کاروانِ آزادی کے قافلہ سالار بھی تھے۔ ان کی زندگی سیاست کی "ابجد" سے نہیں بلکہ "ضظغ" سے شروع ہوئی تھی۔ وہ سیاست میں قدم رکھتے ہی اپنی فطری صلاحیت ولیاقت کی بناء پر اس کے ذروۂ اعلیٰ پر پہنچ چکے تھے۔

ہندوستان کے بڑے بڑے رہنماؤں کے تاثرات سے پتہ چلتا ہے کہ مفتی صاحب کیا تھے۔ اور ملک کے اعلیٰ سیاستدانوں اور رہنماؤں کے دل میں ان کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ ہندوستان و پاکستان میں جس طرح مرحوم کا ماتم کیا گیا ہے اس سے بھی ان کی ہمہ گیر شخصیت کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

(دوروزہ "جمہور" علی گڑھ۔ ۲ر تا ۱۶ جنوری ۵۳ء)

مفتی اعظم کی وفات

مفتی اعظم ہند حضرت علامہ محمد کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تین چار مہینے علیل رہ کر ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو رات کے دس بج کر ۲۵ منٹ پر داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا اللّٰہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مفتی اعظم کا حادثہ انتقال ایک عظیم ترین حادثہ ہے، جو مسلمانوں کو پیش آیا ہے۔ حضرت مفتی اعظم کتاب و سنت کے ماہر، فقیہ اعظم اور ابو حنیفہ وقت تھے۔ علوم دینیہ کے ساتھ سیاست حاضرہ کے بڑے ماہر نہایت جلیل القدر مفکر اور صائب الرائے تھے۔ آزادی ہند کے مجاہدین کی صف اول سے تعلق رکھتے تھے اور اس کے لیے کئی بار جیل بھی گئے۔ اس وقت تو سیاست سے کنارہ کش تھے۔

آزادی ہند کے موقعہ پر جب سیاسئین کسی تجویز پر متفق نہیں ہوتے تھے، اور کانفرنسوں کے افتراق کے ساتھ ختم ہوجانے کا اندیشہ ہوتا تھا اس وقت حضرت مفتی صاحب ہی کی اصابت رائے اور تدبر عقدہ کو حل کیا کرتی تھی اور سیاسئین کا مختلف گروپ حضرت مفتی صاحب کی تجویزوں کو خوشی کے ساتھ منظور کرلیا کرتا تھا۔ اب ایسی مجلسوں کے شرکاء کم ہی رہ گئے ہیں۔ لیکن جو ہیں وہ اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔

حضرت مفتی اعظم ۱۹۱۹ء سے بیس سال تک جمعیۃ علماء ہند کے صدر رہے اور آپ ہی کی صدارت میں جمعیۃ علماء نے منازل ترقی طے کیے۔

حضرت مفتی صاحب نے تقریباً ساٹھ سال قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم دی اور فتوے دیئے۔ آپ کے فتاویٰ کی تعداد کئی لاکھ ہوگی۔ حضرت مفتی صاحب نے پوری زندگی علوم دینیہ اسلام اور

مسلمانوں کی خدمت میں گذاری۔ حضرت مفتی صاحب کی وفات سے جو جگہ خالی ہوئی ہے افسوس ہے کہ اس کا کوئی بدل نظر نہیں آتا۔ اور حضرت مفتی صاحب کا حادثہ وفات ملت کا ایک نا قابل تلافی نقصان ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اللہ عزوجل سے دعاء ہے کہ وہ حضرت مفتی صاحب کی مغفرت فرمائے۔ ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور جنت الفردوس عطا فرمائے۔ مسلمانوں کو حضرت مفتی صاحب کا کوئی جانشین عطا فرمائے اور حضرت کے متعلقین اور تمام مسلمانوں کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

("نقیب" پھلواری شریف۔ ۷ر جنوری ۵۳ء)

تاریخ اشکِ غم

از جناب مجاز الاعظمی صاحب

بے سپر دستِ حامیِ اسلام　　بازوئے امن و صلح بے صمصام
بے رُواں گشت کالبد ملت　　بے نشاں گشت تاجِ فرقِ انام
روحِ انسانیت بسا نالید　　از غم ہجرِ مفتیِ اسلام
نالہ زد اہل مشرق و مغرب　　ہندو ترک و حجاز و مصر و شام
گرسنہ کلیاتِ دین ازو　　تشنہ بر جزئیاتِ دین، کلام
آنچناں کرد جنگ با افرنگ　　قید ملتان گفت الف سلام
سنگ آمد ز منجنیق اجل　　تیر آمدز ترکشِ آلام
بس کہ بہرِ جنازہ مفتیؒ　　خاکِ ہندی زہر سو محوِ خرام
مہر از روزہائے ملک برفت　　شد زشبہائے ہند ماہِ تمام
چشم دارد ہجرتش تفصیل　　زانکہ دل داشتہ بسے ابہام

قدسیاں گفتہ اند در تاریخ
عرش فردوس، مفتیِ اسلام
۲　۷　۳　۱　ھ

حضرت مفتی اعظمؒ کی رحلت پر

شعراء کا منظوم خراجِ عقیدت

حضور مفتیٔ اعظم

فاخرؔ جلال پوری

ہے اب تک دیدۂ عالم حضور مفتیٔ اعظمؒ
جدائی میں تمھاری نم حضور مفتیٔ اعظمؒ

جہانِ دین و دانش میں تمھارے بعد سے اب تک
بچھی ہے اِک صفِ ماتم حضور مفتیٔ اعظمؒ

علومِ دین کی شیشہ گری میں ایک اِک لمحہ
سراپا عزمِ مستحکم حضور مفتیٔ اعظمؒ

قسم ہے بزمِ ملت میں تمھاری شمعِ ایمانی
نہ ہوگی حشر تک مدھم حضور مفتیٔ اعظمؒ

بہت سے وقت کے اسکندر و دارا کے سر اب تک
تمھارے سامنے ہیں خم حضور مفتیٔ اعظمؒ

تمھارے دَم سے ظلمت کی فضاؤں میں بھی لہرایا
نبیؐ کے عشق کا پرچم حضور مفتیٔ اعظمؒ

نگاہوں سے تمھاری جس نے پی لی آج بھی اس پر
وہی چھایا ہے کیف و کم حضور مفتیٔ اعظمؒ

یہی دیکھا کہ زخمِ قوم و ملت کے لیے فاخرؔ
ہمیشہ بن گئے مرہم حضور مفتیٔ اعظمؒ

ہدیۂ نیاز

جناب مشہود احمد صاحب بہارؔ برنی

انقلابِ آسماں نے کردیا سینہ فگار
زندگی بے کیف ہوکر رہ گئی پھر ایک بار
صدمۂ جانکاہ سن کر قلب انساں رو اُٹھا
آنکھ خوں نابہ فشاں دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا
ہر مکاں تاریک ہر گھر بن گیا ماتم سرا
آہ دنیا میں اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا
رنگ کلیوں کا اُڑا، گل آبدیدہ ہوگئے
اور خوش الحانِ چمن مصروف گریہ ہوگئے
محرمِ اسرارِ دین و پیکرِ خلقِ حسیں
رہنمائے ملک و ملت رونقِ بزمِ زمیں
رہبرِ دیں جانشین رحمۃ للعالمین
مفتیٔ اعظم امیرِ ملک و سالارِ دیں
اب کہاں سے پائیں گے ہم آہ ایسا سربراہ
کون اب گم کردۂ منزل کو بتلائے گا راہ
ایک مفتی عالمِ قرآن ہم نے کھودیا
اِک مفکر صاحبِ ایمان ہم نے کھودیا
اِک چھلکتا ساغرِ عرفان ہم نے کھودیا
آہ دنیا کا عظیم انسان ہم نے کھودیا
ایک دو غم ہوں اگر تو ماتم و گریا کریں
پے بہ پے صدمے مقدر ہوچکے ہیں کیا کریں

خون کے دو آنسو

شیخ الحدیث حضرت علامہ الحاج مولانا سید فخر الدین صاحب
صدر جمعیۃ علماء مرادآباد و صدر مدرس مدرسہ شاہی

ذیل کی نظم میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے متاثر ہو کر حضرت مولانا سیّد فخر الدین احمد صاحب نے اپنے قلبی تاثرات کا اظہار فرمایا ہے۔ اگرچہ حضرت مولانا موصوف شاعر نہیں ہیں لیکن جو تعلق حضرت مفتی صاحب سے مولانا فخر الدین صاحب کو رہا ہے اس تعلق خاطر کی وجہ سے مولانا فخر الدین صاحب نے قلم برداشتہ اپنے قلبی تاثرات کا اظہار بشکل نظم فرمایا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ قارئین کرام اس نظم کو شعریت کے لحاظ سے پرکھیں۔ اس لیے یہ معذرت حضرت مولانا موصوف کی طرف سے ہدیۂ ناظرین ہے کہ وہ فن شعریت اور ظاہری الفاظ سے ہٹ کر اس کے معنوی پہلو پر غور فرمائیں کہ حضرت مفتی صاحب کی شان کس قدر جامع تھی اور حضرت مفتی صاحب کی وفات نے مولانا موصوف پر کس قدر اثر کیا ہے جس کا انھوں نے بصورت نظم اظہار فرمایا ہے۔ (اشفاق حسین قاسمی، خادم حضرت مولانا سیّد فخر الدین احمد صاحب)

جمعیۃ العلماء کے وہ رہبرِ اعظم — وہ صدر مسند علم و عمل وہ شاہِ قلم
وہ آفتابِ سیاست وہ ماہتابِ دین — وہ نور چشم بصیرت وہ مفتی اعظم
وہ بے مثال مفکر وہ جامعِ اشتات — وہ نکتہ سنج مبصر وہ قدوۂ عالم
وہ زیب مجلس عرفاں وہ پیکر اخلاص — سراپا علم و عمل، حلم و عزم مستحکم
لطیف طبع سبک روح کریم سادہ مزاج — وہ راہِ حق کا مجاہد کفایت اللہ علم
اساسِ حریت ہند روح صدق و صفا — امام اہلِ خرد پیشوائے اہلِ حکم
خبر ملی ہے کہ وہ باکمال مرد بزرگ — ابھی ابھی ہوا رخصت بسوئے ملک عدم
یہ سننا تھا کہ ہوا دل حزیں و صد پارہ — رہا نہ ضبط کا یارا بڑھا یہ رنج و الم

یہ ٹوٹے دل کی دعا ہے کہ اے غفور کریم
مدام ان پہ رہے تیرا لطف و جود و کرم
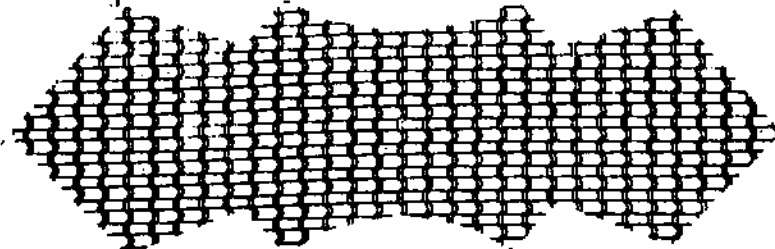
حضرت مفتی کفایت اللہؒ

شریف جالندھری

مفتی اعظم حضرت مولانا الحاج مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی قدس سرہ العزیز کے سانحۂ ارتحال کی خبر سن کر دنیائے اسلام میں صف ماتم بچھ گئی۔ تمام مدارس عربیہ اور دینی اداروں میں ختم قرآن مجید کر کے آپ کو ایصالِ ثواب کیا گیا۔ برادرم شریف جالندھری نے حضرت مفتی صاحبؒ کے انتقال پر ملال پر یہ نظم ارتجالاً سپرد قلم کی ہے: (مدیر)

علم و دانش کی تجلی کہیں روپوش ہوئی
وادیٔ علم میں ہر سمت فضا روئے گی
اے کفایت تیرے دامن سے جو اُلجھی آکر
وہ معطر سی، وہ پاکیزہ ہوا روئے گی

زندگی تیری تقدس کا سراپا کہیے
تیری ہر بات میں تھی فکر کی دُنیا آباد
شب آخر میں ترے دل کا تڑپنا معلوم
تیری آواز میں تھی ذکر کی دنیا آباد

تو نے سوئے ہوئے انسان کو بیدار کیا
تیرا احسان ہے ملّت کے نگہبانوں پر
تو نے بخشا ہمیں وہ جذبۂ رنگ نہاں
کیف طاری ہے ہر اِک سمت گلستانوں پر

تو وہ درویش تھا جس کی نگہ قہر کے ساتھ
تاج اُڑتے نظر آئے ہیں شہنشاہوں کے
تو وہ درویش تھا اُف جس کے دلِ زندہ سے
اُڑتے دیکھے گئے خوش رنگ شرر آہوں کے

تیرے افکار خزینہ تھا فدا کاری کا
تیری کوشش تھی کہ زندانوں کے در ٹوٹ گئے
جن کو افرنگ نے پابند قفس رکھا تھا
وہ اسیرانِ وطن قید سے سب چھوٹ گئے

تیری گفتار تھی یا مردِ مجاہد کا خروش
تو نے وہ درس دیا تھا کہ بھلایا نہ گیا
وقت کے ہاتھوں لٹا قوم کا سرمایۂ دل
تیرا پیغام مگر دل سے مٹایا نہ گیا

تو وہ رہبر تھا کہ صدیوں میں نہ پیدا ہوگا
ہے یقیں مجھ کو اندھیروں میں ضیا روئے گی
موت نے تجھ کو جدا ہم سے کیا ہے لیکن
"بال کھولے تری تربت پہ قضا روئے گی"

یادِ مفتیِ اعظم (نور اللہ مرقدہٗ)

اثر خامہ حضرت مولانا محمدعلی صاحب فاروقی

سکونِ دیدۂ پُرنم تکجائی
قرارِ نالہ پیہم کجائی؟

غم آگیں را علاجِ کجائی
برائے زخم دل مرہم کجائی

شمیم گلشنِ آدم کجائی
نسیم رحمتِ عالم کجائی

نیازِ سجدۂ پیہم کجائی
نمازِ بندۂ اکرم کجائی

فروغِ شمعِ ایمانم کجائی
بہارِ جلوۂ روحم کجائی

تہی سجادۂ فضل و کمال است
کجائی مفتیِ اعظم کجائی؟

کنوں آئینۂ معنی و صورت
فرشتہ زادۂ آدم کجائی

غزالی بو علی طوسی درازی
جنید و شبلی و ادہم کجائی

بہائے تربتِ آں مرقد پاک
سلیماں مہر و جامِ جم کجائی

نثارِ عارض آزادیٔ ہند
اسیر کاکل برہم کجائی

سلامِ بیکراں بر روح اقدس
فدائے فخر دو عالم کجائی

زمضرابِ قضا بشکست تارے
خدا را نغمۂ سازم کجائی

کفیل از صبر اجرش بے خبر نے
امیرِ کارواں! تاہم کجائی؟

رحلت بو حنیفۂ ثانی

ازجناب مولانا عبدالقیوم صاحب ارشق شیرکوٹی

آوخ آوخ کہ مفتی اعظمؒ — رخت بستہ ز عالمِ فانی
کاشف معضلات فقہ و حدیث — واقف نکتہائے قرآنی
فخر رازی و بیہقیٔ زماں — بو علی و معلم ثانی
عندلیب حدیقۂ اسلام — گل بستا نسرائے ایمانی
عالمے آبروئے علم و عمل — عارفے رونقِ مسلمانی
متکی اریکۂ تحقیق — مسند آرائے بزمِ عرفانی
از مبین او ساطع — لمعاتِ فروغِ ایمانی
ذاتِ پاکش کہ منبع علم است — فیض بخشائے قاصی و دانی
سالک مسلک رضائے خدا — عارجِ سلم خدا دانی
آنکہ خاکِ درش بصیرت را — روکش سرمہ صفا ہانی
بود افتاء او مطابق شرع — بحدیث و نصوص قرآنی
از حریمِ فطانتش مے شد — اکتسابِ فنونِ سحبانی
کرد نہضت ازیں سرائے پنج — پئے سیرِ ریاضِ رضوانی
شد غروب آفتابِ فضل و کمال — گشت تاراج گنجِ عرفانی
قدسیاں گشتہ اندخاک بسر — بوفاتِ امامِ ربانی
دارالافتاء شدست بیتِ حزن — مدرسہ مصدرِ پریشانی
آر سمک تا سماک شور نشور — گشت برپا ز اِنسی و جانی
پئے سال وصال علامہ — دل محزوں نمود حیرانی

از سرِ حزن و درد ارشق گفت
رحلتِ بو حنفیۂ ثانی
۲ ۷ ۳ ۱ ھ

جذباتِ غم

از جناب مولانا ظہور الحسن صاحب فنا استاذ جامعہ حسینیہ راندیر، سورت

ہم نشیں با توچہ گویم حالِ غم — شد پراگندہ نظام ہستیم
اُف چہ کرد ایں گردشِ لیل و نہار — چہ بلا ہاریخت بر جان و دلم
تو کجائی مفتی اعظم کجا — یاد تو لمحہ بہ لمحہ دمبدم
جانِ من در فرقت تو مضطرب — وزتپ ہجرت چونے در آتشم
مسند تدریس بیتو سوگوار — سر خمیدہ بیتو اربابِ حکم
ایکہ ہر مشکل بہ نزدت سہل بود — ایکہ فکرت بود، ہمچون جامِ جم
یاد لطف ِ حق بروئے جانِ تو — بر تو باردِ ابرِ رحمت دمبدم

گفت ہاتف سالِ رحلت اے فنا
شد مقام برترش دارِ نعم
۱۹۵۲ء

مفتی اعظم

عزیز صاحب وارثی بچھرایونی

آہ اے مفتی اعظم حامل رازِ خودی — زندگی رشک ملائک بالیقیں تھی آپ کی
آپ کے دَم سے ہمارا گلستاں شاداب تھا — آپ کا ہر لفظ علم و فضل کا اِک باب تھا
آپ اِک صوفی بھی تھے عالم بھی اور فاضل بھی تھے — بزم انجم و کہکشاں میں اِک مہ کامل بھی تھے
آپ کی شہرت رہینِ منتِ عالم نہ تھی — شہسوارانِ وطن سے پھر بھی عزت کم نہ تھی
آپ کے اُٹھنے سے دنیا پر اُداسی چھا گئی — آپ کے ہمراہ بزمِ زیست کو موت آگئی
شمع کو آج اپنے پروانوں سے نفرت ہوگئی — محفل عشرت کی ہر اِک چیز عبرت ہوگئی
اب نکاتِ علم آکر ہم کو سمجھائے گا کون — دین کی الجھی ہوئی گتھی کو سلجھائے گا کون
پیار اور اخلاص کی تعلیم پائیں گے کہاں — آپ کی محفل کے یہ پروانے جائیں گے کہاں
ہے پریشانی کہ دل کی بات اب کس سے کہیں — عصر نو میں آپ کی کتنی ضرورت تھی ہمیں
آپ کی ہستی کے سب طوفاں کنارے ہوگئے — سب کا جو پیارا ہے آپ اس کے ہی پیارے ہوگئے

دامنِ ضبط و تحمل پارا پارا کرلیا
آج ہم نے آپ کا غم بھی گوارا کرلیا

رحلت مفتی ہندؒ

از جناب مولانا یحییٰ صاحب اعظمی

ملتِ بیضا کو کیا کم تھا غم قحط الرجال — اس کی محفل سے اُٹھا اِک اور بھی اہلِ کمال
اجملؔ و انصاریؔ و جوہرؔ کا ماتم تھا ابھی — کردیا اس تازہ غم نے اور بھی آشفتہ حال
ہوتے جاتے ہیں سبھی رخصت بساطِ ہند سے — دیکھئے اب کیا ہو اس فقدانِ ملی کا مآل
ہے صفِ ماتم بچھی ہر سو جہاں آباد میں — ذرّہ ذرّہ بن گیا ہے پیکرِ حزن و ملال
مسند ارشاد و افتا حیف سونی ہوگئی — اُٹھ گیا اُف دورِ حاضر کا فقیہ بے مثال
مرجع اصحابِ استفتا تھی اس کی بارگاہ — اب کہاں جائیں گے امت کے یہ اربابِ سوال
عقدہ ہائے شرع، ملت کے مہماتِ امور — حل کرے گا آہ اب کس کے تفقہ کا کمال
"جرعہ خوارانِ کہن" اپنی بجھائیں تشنگی — آج انھیں کی بزم میں ہے ساقی دیرینہ سال
جلوہ گر ہوتی ہے بزم دہر میں صدیوں کے بعد — اس وقار و سادگی و حزم و تقویٰ کی مثال
کس کی سیرت میں فضائل کا تھا ایسا اجتماع — کس کی فطرت میں مکارم کا تھا ایسا اعتدال
سادگی، تقویٰ، تفقہ، فہم دیں، ذوقِ جہاد — جلوہ گر سرتا قدم استاذؒ کا فیض کمال
فقہ و دانش کا وہ خازن درس و افتاء کا امام — جس کا اُٹھنا ہے سلف کے علم و حکمت کا زوال
چہرہ آرائے معارف جس کا ہر نقشِ قلم — شرح اسرار و غوامض جس کا ہر حرفِ مقال
اس کی ہستی ملک و ملت میں تھی یکساں محترم — تھا مسلم اس کی تدبیر و فراست کا کمال
زندگی اس کی مجسم پیکر حلم و وقار — سادگی اس کی سراپا آئینہ دار جلال
ذات اس کی مختلف اجزا کی تھی شیرازہ بند — شعلہ و شبنم کا قائم تھا اُسی سے اتصال
اس کی رحلت دین و ملت کا ہے نقصانِ عظیم — آہ اب صدیوں میں بھی اس کی تلافی ہے محال
دیر تک روئے گی خون چشم جہانِ علم دین — غیر ممکن ہے مگر اس زخمِ غم کا اندمال
شہر دہلی دردِ فرقت سے نہ کیوں ہو بے قرار — آج اس کے مفتیٔ اعظم کا ہے یومِ الوصال

تیرے استقبال کو حاضر ہے بزمِ قدسیاں
الفراق و الوداع اے مفتیٔ ہندوستاں

مفتی اعظم

ازجناب غیور احمد صاحب فاخر نوری، غازی آباد

(۱)

اِک اور سہارا چھوٹ گیا دریا کا کنارا ٹوٹ گیا
اِک مرد مجاہد رُوٹھ گیا چڑھ کے ستارہ ٹوٹ گیا

(۲)

اپنے روئے غیر بھی روئے ڈھارس سب کی ٹوٹ رہی ہے
دُنیا سونی سونی رہ گئی سر کو اپنے پیٹ رہی ہے

(۳)

بہتی ندیاں چلتی ہوائیں بہتے بہتے رُک سی گئی ہیں
موت بھی جیسے رو رہی ہو پلکیں اُس کی بھیگ گئی ہیں

(۴)

مرحوم کا وہ پیغامِ عمل اب ہم سب ہی کو اپنانا ہے
کردار سے ہم کو اپنے اب مفتیٔ اعظمؒ بن جانا ہے

آہ! مفتی اعظمؒ

از علامہ انور صابری

مفتیٔ اعظمؒ فقیہ بے مثال و فخر دیں
سرورِ کون و مکاں کے علم و حکمت کا امیں

وقت کا اونچا مدبر، رہنمائے باشعور
دانشِ حاضر کے رُخ کا غازۂ حسن آفریں

نبض فطرت پر جماکر جس نے اپنی انگلیاں
نفع بخشِ زندگی گہرائیاں معلوم کیں

گلشن محمودؒ کی جانِ بہارِ آرزو
جس کے ہونٹوں کا تبسم جس کی تنویرِ جبیں

ظاہر و باطن میں اصحابِ نبی کی یادگار
صورت و سیرت میں ہم رنگِ قرونِ اوّلیں

ہند کی تحریک آزادی کا مخلص پیش روؒ
نقشِ پا جس کے نہ بھولے گی وطن کی سرزمیں

فہم و دانش کی ہر اِک گتھی کو سلجھاتے ہوئے
پیش جس کے ذہن کو مشکل کوئی آتی نہیں

بات میں نرمی لب و لہجہ میں دل کش سادگی
شکل انساں میں فرشتوں کا جمالِ دلنشیں

اتباعِ سنت و تائید شرعِ پاک میں
ہر عمل جس کا تقدس زادۂ عرشِ بریں

جس کی چشم حق نگر کے اشکِ عصمت ریز سے
سرد ہوجاتا تھا باطل کا مزاجِ آتشیں

دوزخِ دنیا میں انورؔ ہم کو تنہا چھوڑ کر
لے گئی ہے موت اس کو جانبِ خلدِ بریں

والد مرحوم کی یاد میں

ان کی وفات کے کئی برس کے بعد

از واصف

زمانہ بدلا ہے آہ! کیسا الم کے جھکڑ سے چل رہے ہیں
فضائیں مسموم ہو رہی ہیں فلک کے تیور بدل رہے ہیں

اُٹھایا گردوں نے ایسا طوفاں کہ عقل و تدبیر سے ہراساں
کچھ ایسا بھڑکا ہے داغ حرماں جگر کے ٹکڑے بھی جل رہے ہیں

نہ کی کبھی ہم نے قدر اُن کی بڑا سہارا تھی جن کی ہستی
گئی ہے ہاتھوں سے دولت ایسی کہ بیٹھے اب ہاتھ مل رہے ہیں

نگاہیں تم نے جو پھیر لی ہیں تو سارا سنسار پھر گیا ہے
رفیق آنکھیں دکھا رہے ہیں عزیز پہلو بدل رہے ہیں

جو خوابِ غفلت سے آنکھ کھولی عجب نظارہ یہ ہم نے دیکھا
ابھی کچھ آیا نہیں سمجھ میں ابھی تو آنکھیں مسل رہے ہیں

تمھاری وہ اِک نگاہ رحمت جو تھی کبھی زخم دل کا مرہم
وہ یاد آئی ہے آج ایسی کہ دل پہ تیشے سے چل رہے ہیں

کہاں ہے آشیاں ہمارا فلک نے چھوڑا نہ ایک تنکا
یہ بال و پر اب جو رہ گئے ہیں زمین والوں کو کھل رہے ہیں

وہ ظرف عالی کہاں سے لائیں وہ ضبط و تمکین کس سے سیکھیں
کسے خبر تھی کہ زیر دامن مہیب فتنے بھی پل رہے ہیں

کمال احساں سے جن کو تم نے سکھائے احسان کے طریقے
وہ ان طریقوں کو پاؤں سے اچھل اچھل کر کچل رہے ہیں

سنبھالا اس کارواں کو جس نے ثبات و ایقان تھا تمھارا
بڑے بڑے رہبران دانا قدم قدم پر پھسل رہے ہیں

ہزار ہا سنگ راہ آئے تمھاری فکر رسا کے آگے
مگر یہ دیکھا کہ سوکھے پتے ہوا سے گویا اُچھل رہے ہیں

کہاں وہ ایثار و جاں فشانی کہاں وہ اخلاق و مہربانی
یہاں تو اوضاعِ زندگانی ہوس کے سانچوں میں ڈھل رہے ہیں

اگرچہ روشن دماغ بھی ہیں اگرچہ دل بھی بہت منور
مگر یہ شعلے ہیں سازشوں کے چراغ کینے کے جل رہے ہیں

کہاں وہ نباض دین و ملت کہاں وہ نکتہ رس سیاست
یہ اہل دانش یہ اہل حکمت دماغ سب کے پگھل رہے ہیں

نہیں کھلونا یہ جام عرفاں امین بننا نہیں ہے آسان
یہ جانے کیا چاہتے ہیں ناداں کہ طفل صورت مچل رہے ہیں

نہ تھے کبھی ہم بھی ایسے عاجز چٹان تھا حوصلہ ہمارا
پڑی مصائب کی چوٹ ایسی کہ دل سے چشمے اُبل رہے ہیں

نہیں ہے واصف مجال گفتن کرے گا کیا کوئی چارہ سازی
اگرچہ سن سن کے میرا قصہ ہر اک کے آنسو نکل رہے ہیں
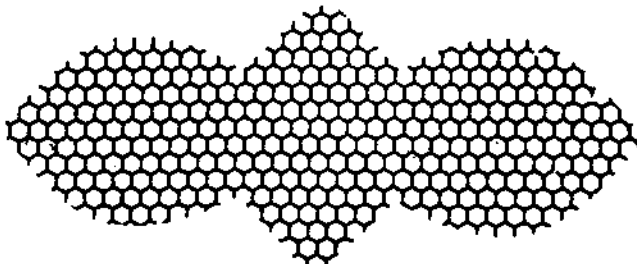
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مخمور یوسف زئی سعیدی ٹونکی

لبِ غم ترجماں پر کس کا نام آیا ہے یارب؟ — قلم تھرایا جاتا ہے جسے مرحوم لکھنے میں
اُفق پر زندگی کے چھائی جاتی ہے گھٹا غم کی — ہے پر زہر اب درد و کرب دل کے آبگینے میں

کے چھینا ہے ہم سے موت کے بے درد ہاتھوں نے؟ — الٰہی جسم ملت کی جسے روح و رواں کہیے
سدھارا آج باغِ دہر سے وہ غنچۂ معنی — گلستانِ حقیقت کا جسے اِک باغباں کہیے

وہ دین و علم و عرفاں کی خرد افروز اِک مشعل — وہ نورِ آگہی ، وہ شمعِ بزمِ ملّتِ بیضا
وہ باطل کش، وہ حق پرور، وہ ایماں فطرت اِک انساں — صفا و صدق کا مظہر، صداقت کا اِک آئینہ

جو اِک روشن شعاعِ نور تھا تاریکیِ شب میں — جو کردار و عمل کا ایک تابندہ ستارا تھا
جو عزم و جہد کی چلتی ہوئی تلوار تھا ہر دَم — جو استقلال و ہمت کا سبک رفتار دھارا تھا

وہ جس نے اپنی عظمت کا ہمیں احساس بخشا تھا — وہ جس نے ہم کو نغماتِ خود آگہی سنائے تھے
وہ جیلوں میں بھی تھا جس کی زباں پر نامِ آزادی — وہ جس نے مدتوں دار و رسن کے گیت گائے تھے

وہ جس کا ذہن اندھیارا نہ تھا عکسِ تعصب سے — وہ جس کے قلب میں انسانیت کی شمع روشن تھی
وہ اِک بے لوث خادم تھا جو ہر اپنے پرائے کا — وہ جس کی خدمت آدم میں ساری زندگی گذری

وہ اُٹھا ہے جو ہستی کی فنا آمادہ محفل سے — بٹھا کر صفحۂ عالم پہ نقشِ دائمی اپنا
وہ جس نے زندگی پہ موت کو ترجیح دی اپنی — وہ جس نے موت میں پایا ہے رازِ زندگی اپنا

اب اے مخمور ایسا صاحبِ فکر و نظر پیدا — جانے کب ہو اس معمورۂ جہل و مشیّت میں
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آہ! مفتی اعظم

رشید الوحیدی متعلم دارالعلوم دیوبند

ابھی نظامِ چمن کا خاکہ برائے تکمیل رہ گیا تھا
ابھی تو رنگِ رخِ گلستاں بھی بہر تبدیل ہوگیا تھا

شعور پرواز کھو چکے تھے قفس کے قیدی قفس میں رہ کر
بھلا چکا تھا دماغ صحن چمن، اسی خار و خس میں رہ کر

وہ پاسباں دینِ مصطفیٰ کا مبلغِ حکمت و سیاست
کفایت اللہ جس نے کی تھی جہانِ اسلام کی قیادت

اسی نے سکھلا دیئے تھے انسان کو رمزِ انسانیت جہاں میں
اسی کے علم و ہنر سے پھیلی تھی درسِ للّٰہیت جہاں میں

امینیہ تیری بزم سے آج رونق بزم اُٹھ چکی ہے
غرور تھا ناز تھا تجھے جس پہ وہ سعادت لٹ چکی ہے

تری عمارت قدومِ برکت سے آج محروم ہوگئی ہے
وہ علم کی مایہ ناز دولت جو تجھ سے معدوم ہوچکی ہے

نہ تیرے افتاء سے اہلِ علم کو تقویت اب پہنچ سکے گی
نہ تیرے محمل سے ظلمت شب میں اب کبھی روشنی ملے گی

نہیں ہے ضبط فراق مجھ کو کہ موتِ عالم ہے موتِ عالم
زہجرِ تو آہ من طپیدم کہ از فراقت ز قلبِ نالم

اگر بظاہر تو اہلِ عالم سے چھپ گیا ہے تو غم ہی کیا ہے
دلوں میں باقی ہے یاد تیری لبوں پہ تیرے لیے دعا ہے

مرقع سادگی تھی جس کی حیات قدسی وہ رہبرِ دیں
چلا گیا اور کتاب ہستی کا گم ہوا ایک بابِ رنگیں

خموش ہے شمع علم و عرفاں بجھا بجھا سا ہے رنگ محفل
خوشی مبدل ہوئی الم سے کچھ اس طرح محو یاد ہے دل

فقیہ کامل فقیر صورت محافظ دیں کفایت اللہ
سیاست دورِ حاضرہ میں وہ مصلحت ہیں کفایت اللہ

لکھی یہ میں نے رشید تاریخ انتقال اب سے زمانہ
فرشتے پڑھتے ہیں آسماں پر ولی مغفور کا ترانہ

مفتی اعظم کی یاد میں

از جناب اسیر صاحب ادروی

وہ مفتی و فقیہ شریعت نہیں رہا وہ آفتابِ رُشد و ہدایت نہیں رہا
وہ قامع اساسِ ضلالت نہیں رہا وہ واقفِ رموزِ سیاست نہیں رہا

خورشید زندگی ابھی برجِ محن میں ہے
تنویر چھن گئی، ابھی سورج گہن میں ہے

بے تاب کارواں ہے ابھی رہگزار میں اُلجھا ہوا سفینہ ہے موجِ شرار میں
کلیاں نہ کھل سکیں چمنِ روزگار میں گلشن میں آگ لگ گئی فصل بہار میں

پژمردہ ہو رہا ہے چمن، باغباں نہیں
جائیں کدھر؟ کہ راہبرِ کارواں نہیں

شمعِ خرد سے جس کی ہمیں روشنی ملی ملّت کو جس کے دَم سے نئی زندگی ملی
جس کے ثبات و عزم سے خود آگہی ملی ظلمت فروش راہوں کو تابندگی ملی

جس کا دماغ دہر میں وہ کام کر گیا
ہر مرحلہ سے آگے مسلماں گزر گیا

بزم وطن کی شمع شبستاں اُداس ہے کلیاں فسردہ ہیں تو گلستاں اُداس ہے
آبادیاں اُداس بیاباں اُداس ہے ہندوستاں کا آج مسلماں اُداس ہے

ہر آنکھ اشک ریز ہے، دل بے قرار ہے
ماتم کناں جہاں ہے، فضا سوگوار ہے

نوحۂ غم

بشیر الدین صاحب عنبر دہلوی

رو رہے ہیں مسلمان سارے
مفتی اعظمؒ جہاں سے سدھارے
مومنوں کے دلوں کے سہارے
مفتی اعظمؒ جہاں سے سدھارے
سیکڑوں سال کے بعد ایسا
دیدہ ور کوئی ہوتا ہے پیدا
جیسے تھے مفتی اعظمؒ ہمارے
مفتی اعظمؒ جہاں سے سدھارے
جو کہ رکھتے ہیں اُن سے عقیدت
آج ہے اُن کے دل پر قیامت
کیوں نہ ہوں لب پہ غم کے شرارے
مفتی اعظمؒ جہاں سے سدھارے
خدمتِ خلق سے منہ نہ موڑا
دامنِ صبر بالکل نہ چھوڑا
دن غریبی کے ہنس کر گذارے
مفتی اعظمؒ جہاں سے سدھارے
کیا کہوں مفتی اعظم کو کیا تھے
خاص پابندِ صبر و رضا تھے
تھے توکل پہ ان کے گزارے
مفتی اعظمؒ جہاں سے سدھارے
علم کا شمس بدلی میں آیا
اور اندھیرا زمانے میں چھایا
رہ گئے جھلملاتے ستارے
مفتی اعظمؒ جہاں سے سدھارے
جب نماز جنازہ پڑھا کر
اور چلے لوگ میّت اُٹھاکر
رو گئے جھلملاتے ستارے
مفتی اعظمؒ جہاں سے سدھارے
کوئی بھی بیٹھے اُن کی جگہ پر
پر وہ خوبی نہ ہوگی میسر
یاد آئیں گے جب یہ نظارے
مفتی اعظمؒ جہاں سے سدھارے
یا خدا واسطہ آلِ حضرت
دیجیو مرحوم ملّت کو جنت
کیجیو رحمتوں کے اشارے
مفتی اعظمؒ جہاں سے سدھارے
جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تھے
بدھ کا دن رات کے دس بجے تھے
رشتے ناطے ہوئے ختم سارے
مفتی اعظمؒ جہاں سے سدھارے
چودہ تاریخ تو چاند کی تھی
سن ترپین یکم جنوری تھی
جب گئے قبر میں وہ اُتارے
مفتی اعظمؒ جہاں سے سدھارے
خوش ہو جس سے کہ روحِ منور
پڑھ کے تم مفتی اعظمؒ کو عنبر
بخشو قرآن کے تیس پارے
مفتی اعظم جہاں سے سدھارے

آہ! مفتی اعظمؒ

از مولانا محمد عمر خاں صاحب ثمر چھتاروی مدیر "جمہور" علی گڑھ

اِک شریعت کا مبلغ اِک فقیہ باکمال — ناخنِ تدبیر سے کرتا تھا حل مشکل سوال
پیکرِ حق و صداقت ، حریت کا پیشوا — جنگِ آزادی کا ہیرو اور وطن کا ناخدا
مسند و منبر کی زینت شارحِ عالیجناب — درحقیقت جس کو کہئے اِک درخشاں آفتاب
آہ وہ مفتیٔ اعظم وہ محدث بے مثال — آہ عالمِ باعمل اور مخزنِ علم و کمال
ملت اسلامیہ کا آہ روشن ماہتاب — علم و دانش میں نہ تھا جس کا زمانے میں جواب
ظاہر و باطن تھا جس کا مشعل راہ ہدیٰ — درس دیں جس کا ہمیشہ سے رہا اِک مشغلہ
صورت و سیرت میں یکتا تھا جو صد رشک ملک — جس کا ثانی مل نہیں سکتا زمیں سے تا فلک
جس کی حق گوئی کی شہرت از زمیں تا آسماں — مضطرب اس کے لیے ہے آج یہ سارا جہاں
جس کے دَم سے تھی منور مجلس علم و ہنر — چھوڑ کر دنیا کو جنت میں ہوا وہ جلوہ گر
ناز کرتا تھا زمانہ جس کی ذاتِ پاک پر — سو گیا مرقد میں جاکر اب وہ فرشِ خاک پر
عظمتِ اسلاف کی زندہ نشانی بجھ گئی — زہد و تقویٰ اور شرافت کی جوانی بجھ گئی
آج میدانِ سیاست ہے بغیر اس کے اُداس — زلزلہ نے مرگ کے ڈھادی تدبر کی اساس
کیوں نہ ہو جمعیۃ خاطر ملول و بے قرار — ہر کس و ناکس وطن کا ہے بچشم اشکبار

رنج و غم حد سے زیادہ اے ثمر بے فائدہ
بس مقامِ صبر ہے کیسا گلہ کس کا گلہ

قطعہ تاریخ وفات

از مولانا قاضی ظہور الحسن صاحب ناظمؔ سیوہاروی

سدھارے خلد کو مفتی اعظمؒ — جو تھے مقبول و منظور الٰہی
ہوئی مجھ کو جو فکر سالِ رحلت — کہا ہاتف نے مغفور الٰہی

۱۳۷۲ھ

چند آنسو

از جناب انعام اللہ خاں صاحب ناصر

مفتی اعظم ہوئے جنت مکاں
بس کے اصلِ خلد ہے حسن عمل

مگر ایسا جدائی کا قلق — اس خبر سے جی گیا اپنا دہل
چھین لی ہم سے متاعِ بے بہا — آہ آہ از دست بیدادِ اَجل
رہ گئے سر پیٹتے اہلِ زمیں — وہ قضائے آسمانی تھی اَٹل
علم دیں کہتا ہے باقلب حزیں — اب کہاں وہ رونقِ بزمِ عمل
یہ تو اُس ذہنِ رسا کا وصف تھا — عقدۂ مشکل کرے اب کون حل
خلق سے تھا آپ کے برتاؤ میں — رنگِ اخلاق خدائے عزو جل
ناصیہ میں آپ کے تھا جلوہ گر — چہرۂ نورانیِ صبحِ ازل
آپ یوں تھے بے ہمہ اور باہمہ — جیسے سطحِ آبِ صافی پر کنول
ربط ایسا عالمانِ دیں سے تھا — جیسے وابستہ ہے جمعیۃ سے "اَل"
قوم کی گدڑی پہ حسنِ ظن سہی — کون یہ اُس سے کہے گا لعل اُگل
آپ ہی کے نعرۂ حق سے پڑا — ناامیوں کے خواب راحت میں خلل
آپ کے آگے غرورِ سلطنت — تھا مگر کیا اِک جلی رسّی کا بل
عزم سے مردانہ کی وہ راہ طے — جس میں اکثر پاؤں جاتے تھے پھسل

عقل کہتی ہے اُٹھا دست دعا
ہوش سے راہِ عبودیت پہ چل
رحمت حق ہم کو ارزانی کرے
صبر اور مرحوم کا نعم البدل

وفات حسرت آیات

از: جناب ماسٹر شفیع الدین صاحب نیرؔ جامعی

مفتیٔ ہند جو رخصت ہوئے اِس دنیا سے — باغِ فردوس کی لی حضرتِ مرحوم نے راہ
آپ کی روح کو کافی ہوئی حق کی نصرت — کیوں نہ ہوتا یہ ، کہ تھا نام کفایت اللہ
بچھ گئی آپ کے غم میں صف ماتم ہر سو — ہوگیا بلدۂ دہلی کا تو بس حال تباہ
نوحہ خوانی میں ہیں مصروف سب اہلِ دہلی — واقعی اُن کے لیے روز ہے یہ روزِ سیاہ
غم زمیں کا یہ بنا وجہ نشاطِ گردوں — خیر مقدم کی صدا آئی فلک سے ناگاہ
پیشوائی کو جو آئے تھے ملک بول اُٹھے — پرضیا چہرہ ہے کیا خوب یہ ماشاء اللہ
چہرہ ایمان کی برکت سے مثالِ خورشید — ہے جبیں نور سعادت سے منور جوں ماہ
حور و غلمان نے آمد کا ترانہ گایا — بولے مشتاقِ زیارت تھیں یہ آنکھیں واللہ
کیا کہیں حضرت والا کہ عجب حالت تھی — عرش والوں میں سبھی کو تھی بڑی آپ کی چاہ
آپ کا علم وہ اور آپ کا اعلیٰ اخلاق — یہ بھی تھا صلِّ علیٰ وہ بھی تھا سبحان اللہ
مسند درس و ہدایت سے رہا آپ کو کام — حرص نے مال کی، نے تھی ہوس دولت و جاہ
نہ نمائش سے غرض، اور نہ طلب شہرت کی — ”نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ“
انکسار آپ کا شیوہ تھا ، طریق آپ کا حلم — مگر اظہار عقائد میں جری حق ہے گواہ
یوں تو ہیں راہ شریعت کے بہت سے رہبر — ایسے کم ہیں کہ جو دکھلائیں سدا صدق کی راہ

خیر مقدم کی خبر تھی یہ خوشی کا موجب — باوجود اس کے نکل ہی گئی منہ سے اِک آہ
چند روز اور ابھی آپ جو زندہ رہتے — کیا عجب تھا کہ رہِ راست پہ آتے گمراہ
کیا عجب تھا کہ اس امت کے بھی دن پھر جاتے — کیا عجب ہوتی نئے عہد کی پھر بسم اللہ
کیا عجب قوتِ ایمان اثر دکھلاتی — کیا عجب ہوتے مسلمان حقیقت آگاہ
پر مشیت سے ہیں مجبور یہاں سب انسان — ہو کے رہتا ہے وہی کرتی ہے جو ذات اللہ
ہاتھ اُٹھا دستِ دعا کو تو بعجز و الحاح — مغفرت حق سے تو اِس بندۂ مومن کی چاہ

ہے دعا نیرؔ دل خستہ کی تجھ سے یارب!
ہو عطا حضرتِ مغفور کو رحمت کی پناہ

انین الحزین

لمولانا المحمود الدیروی احد ارکان التدریس بالجامعة الاسلامیه قاسم العلوم (ملتان)

نعزّیك یا من فاز بالخیر والعُلیٰ — بان افلت شمس الهدایة للوریٰ

نعزّیك یا من صار قلبك فجعةً — کذالك بکت اعماق افئدة الوریٰ

اذا مانعی الناعی بموت ولینا — کفایة مولانا و وارث من هدیٰ

وصیّة شیخ الهند قسمة قاسم — ورشد رشید فاز بالرشد والتقیٰ

واشرف خلق الله انور وقته — وبدر سماء العلم والفقه والفتیٰ

حملنا من الاحزان مالو بعضها — تحمّله بعض الجبال لانحتیٰ

اراضی دیار الهند والسنده اظلمت — بفقد کریم نوره اشرق الدنیٰ

لهٗ منَنٌ فی اهل علم کثیرةٌ — اشاع علوماً سابقاً کل من سعیٰ

مسائل مستفتین ایضاً یتیمة — کذاك علوم فی المدارس القریٰ

وما کان مزعوم الخلائق قبله — ان فی الثریٰ تخفی الکواکب و الذکا

وخالقنا الرحمن اعطی اجره — وخلّده اذ ذاك بالعیش والمنیٰ

وارضٰکم والغابرین و من بکیٰ — واخلصهم من سورة الحزن والشجیٰ

ولما التقت ذات الا له نفسه — فاجاب ارضاءً لها ربّ الوریٰ

غفرانك یوجب من رفیع جنابنا

۲ ۷ ۳ ۱ ۵

فانت مثیلٌ للملئکة العلیٰ

باقة الرثاء

للاستاذ العلامة الحاج الاديب اللوزعی مولانا عبدالحق المدنی

هوی کوکب العلیاء وانهد بنیان
نعم و تداعت للمعارف ارکان

برتری اور سربلندی کا تارا ٹوٹ گیا۔ علم و فضل کی عمارت منہدم ہو گئی۔ بیشک ایسا ہی ہوا علم و معارف کے ستونوں میں شگاف پڑ گئے۔

بکل فواد لوعة لایطیقها
وهل یحمل الرزء المبرح انسان

ہر ایک قلب میں غیر قابل برداشت سوزش ہے اور کیا کوئی انسان شدید ترین مصیبت کو برداشت کر سکتا ہے

اجل خطوب الدهر رحلة عالم
له فی عویصات المسائل امعان

رحلت عالم زمانہ کی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ عالم بھی ایسا کہ مشکل اور الجھے ہوئے مسائل میں نظرِ عمیق اور گہرے غور و فکر کا مالک ہو۔

تری منه فی کل العلوم مجلّیا
وفی عصره فی الفقه لاشك نعمان

ایسا عالم جو ہر ایک علم و فن میں پیش رو ہو (بالخصوص) فقہ میں اپنے زمانہ کا نعمان ہو (یعنی ابوحنیفہ وقت ہو)

علیم باسرار الخطاب کانّه
اذا قال اما بعد فی القوم سحبان

اسرار خطابت کا بہترین واقف ہو۔ گویا جب خطبہ پڑھ کر تقریر شروع کرے تو معلوم ہو کہ اپنی قوم کا سحبان ہے۔

کانّ الثریا قلّدته نجومها
ففی کل حرف للنباهة برهان

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہکشاں نے اپنے تاروں کا ہار بنا کر اس کو پہنایا ہے۔ بس ہر ایک حرف میں شرافت و عظمت کی برہان اور دلیل موجود ہوتی تھی۔

حکیم بتلخیص المعانی کانّما
یلقنه وحیا من الصحف لقمان

مقاصد اور مطالب کا خلاصہ پیش کرنے میں ایسا دانشمند و ماہر کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت لقمان اپنے دانشمندانہ رسالوں کا ان کے دل میں القاء کر رہے ہیں۔

کان بکفیه مجلة آصف
وفی صدره بحر من العلم طفحان

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ہاتھ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر اعظم آصف بن برخیا کی کتاب ہے اور ان کے سینے میں علم کا جھلکتا ہوا دریا موجیں مار رہا ہے۔

قضی العمر فی درك العلوم و نشرها
و تدوینها و المرْ بالعلم یزدان

علوم کے حاصل کرنے اور ان کو پھیلانے، شائع کرنے، مرتب و مدوّن کرنے میں اپنی ساری عمر صرف کر دی۔ انسان علم کے ذریعہ ہی تقرب و مقبولیت کے اعلیٰ و بلند ترین مرتبہ پر فائز ہوتا، اور اپنے دور کا واجب الاحترام شخص بن جاتا ہے۔

اناة و اقدام و حلم و سطوة
و رای رشید فی الامور و امعان

آپ سراسر سنجیدگی واقدام (پیش قدمی) مجسمہ علم و وقار، پیکر تدبر و تفکر اور اصابت رائے کی بہترین مثال تھے۔

بیسرٰه سفر للسیاسة کافل
و فی کفة الیمنی حدیث و قرآن

آپ کے بائیں ہاتھ میں دستور و سیاست کی مکمل کتاب تھی اور دائیں ہاتھ میں حدیث و قرآن۔

ارانا سبیل الرشد صبحا انا ره
بآيٍ فی محکم الذکر تبیان

ہمیں رشد و ہدایت کے راستے بتائے جو صبح صادق کی طرح روشن تھے۔ مزید براں اُن پر قرآن حکیم کی واضح آیتوں کی روشنی ڈالی۔

وحث علی حسن التوافق قائلا
حذار من التفریق فالقوم اخوان

ہمیں ہندو مسلم اشتراک عمل اور باہمی موافقت پر آمادہ کیا اور فہمائش کی کہ ہندو مسلمان وطنی برادر ہیں تفریق و تقسیم ہرگز ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔

Scanned by CamScanner

فوافقه قوم و خالف بعضهم
فللحق اعداء و للحق اعوان

بس ایک جماعت نے آپ کی بات تسلیم کی دوسرے گروہ نے مخالفت کی۔ دنیا کا دستور یہی ہے کہ حق وصداقت کے دشمن بھی ہوتے ہیں اور معاون و مددگار بھی۔

لقد خدم الاسلام و القوم باذلاً
لهم نصحه حقا و ماثم ادهان

بلاشبہ قوم وملت کی پوری خیر خواہی اور سچائی کے ساتھ بلا کسی مداہنت کے صحیح اور سچی خدمت انجام دی۔

وفي الناس من لايرعوى عن ضلاله
و ان لاح مثل الصبح يسطع برهان

مگر دنیا میں وہ آدمی بھی کثرت سے ہوتے ہیں جو گمراہی سے کبھی نہیں خائف ہوتے ہیں۔ اگرچہ صداقت صبح صادق کی طرح روشن ہو کر سامنے آجائے۔

فذاك الذى استهوته نفس غوية
يهيم بوادى غيّها و هو حيران

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اغراض کے تابع ہوتے ہیں اور گمراہی نفس کی تاریک وادی میں سرگرداں بھٹکتے رہتے ہیں۔

يشاهد ما قد حل هتك محارم
وغمط صريح الحق لاشك طغيان

لیکن ضد، اور بے جا ضد کا خمار کچھ اس طرح دماغوں پر چھایا ہوا ہے کہ اعتراف کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ واقعہ یہ ہے کہ صاف اور صریح صداقت کے مقابلہ میں اکڑنا بہت بڑی سرکشی ہے۔

فلا كنت يا مذياع مذ جئت ناعياً
فهل نعبت في جوفك اليوم غربان

اے آلہ نشر الصوت (ریڈیو) تو خود کیوں نہیں فنا ہو گیا۔ جب تو نے یہ الم انگیز خبر نشر کی تھی، کیا آج تیرے اندر کوئی غراب البین صداء فراق لگا رہا ہے۔

نعيت لنا الطور العظيم فزلزلت
دعائم بيت المجدوا نهال ايوان

کوہ وقار کے وفات پاجانے کی تو نے خبر دی، جس سے شرف و مجد کی عمارت کے ستون ہل گئے اور قصہ علم و فضل دہل گیا۔

اصم تناجى الخلق شرقاً و مغربا
و ليس لرجع الصوت عندك آذان

اے بہرے ریڈیو تو اپنی باتیں مشرق و مغرب کے کانوں میں پھونکتا رہتا ہے۔

مگر صداء بازگشت سننے کے لیے خود تیرے پاس کان نہیں ہیں۔

فلو كنت ذا سمع لذبت تحسّرا
واصبح في موجات نشرك بحران

اگر تیرے کان ہوتے تو اس الم واندوہ میں تو خود پگھل گیا ہوتا اور نشر آواز کی فضائی لہروں میں بحران پیدا ہو گیا ہوتا۔

ولو لا التقى والدين والله عاصم
و في القلب ايمان و للحق اذعان

اگر خوف حدا احکام شریعت کی پابندی قلب میں ایمان اور حق وصداقت کا اذعان نہ ہوتا۔

لزلت بنا الاقدام و استلب النهى
وشقت جيوب الصبر و الشجوا فنان

تو ہمارے قدم پھسل جاتے۔ عقلیں سلب ہو جاتیں، گریبان صبر چاک ہو جاتے اور یہ رنج والم طرح طرح ہمیں بدحواس کرتا۔

ولكن جميل الصبر احرى بذى الحجىٰ
واجدر بالتقوى و ان عزّ سلوان

لیکن صاحب عقل و ہوش کے لیے صبر ہی موزوں ہے۔ تقاضاء تقویٰ بھی یہی ہے کہ خواہ صبر و سکون کتنا ہی دشوار ہو۔

حفيظ اَفِق واستوف بالصبر اجره
فليس لاجر الصبر في الحشر ميزان

اے حفیظ (صاحبزادہ کو خطاب) تم بھی ہوش وحواس درست رکھو۔ صبر کر کے اللہ تعالیٰ سے صبر کا ثواب پورا پورا حاصل کرو۔ صبر کا ثواب اتنا بڑا ہے کہ میدان حشر میں میزان عمل بھی اس کو نہیں اُٹھا سکتی۔

فانت ابنه البر الوفى بحقّه
لحظك في نيل السعادة رجحان

تم اُن کے خلف رشید ہو، حق شناس اور حق ادا کرنے والے۔ سعادت کی کامیابی میں تمھاری خوش نصیبی کا پلہ جھکا ہوا ہے۔

يقولون مات الشيخ والشيخ لم يزل
بآثاره حيا و ان غاب جثمان

لوگ کہتے ہیں مفتی صاحب کی وفات ہو گئی حالانکہ مفتی صاحب ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ صرف جسم غائب ہو گیا ہے۔

لقد عشت محمود الخصال فلم تدع
مجالاً لمرتاب ولو ثم اضغان

آپ نے ہمیشہ قابل ستائش زندگی گذاری۔ اس طرح کہ کبھی شک وشبہ کی

گنجائش نہیں ہوئی اور بدترین مخالف بھی نکتہ چینی نہیں کر سکے۔

وسرت الیٰ دار البقاء مزوّداً
بقلبك ایمان و فعلك احسان

آج دار بقاء کی جانب اس طرح روانہ ہو رہے ہو کہ تمہارے قلب میں ایمان اور کردار و عمل میں حسن و خوبی کا پورا توشہ ساتھ ہے۔

وارجو من الرحمن اضعاف رحمة
سلام و اکرام و عفو و غفران

اللہ تعالیٰ رحیم و کریم سے بیش از بیش رحمتوں کی امید ہے۔ سلام و اکرام، عفو اور غفران کی توقع ہے۔

و علمك وروض فی ضریحك ناضر
ونورٌ علی متن الصراطله شان

آپ کا علم قبر میں تر و تازہ باغیچہ اور پل صراط پر شاندار نور ہوگا

و سعیك فی علم الحدیث و نشره
یفوح بدار الخلد روح و ریحان

علم حدیث کے درس دینے اور نشر و اشاعت میں جو جد و جہد کی، وہ دار الخلد میں روح و ریحان بن کر مہکے گی۔

و ارجولك الزلفی بما قد ارخته
وحسبك بالحسنیٰ یحییك رضوان

۲ ۷ ۳ ۱ ۵

آپ کے مادۂ تاریخ سے بھی مجھے قرب خداوندی کی توقع ہو رہی ہے کیونکہ آپ کے مادۂ تاریخ کا مفہوم یہ ہے کہ جنت کی عیش راحت کے لیے یہ کافی ہے کہ رضوان جنت آپ کی تعظیم بجالا رہا ہے۔

حضرت مفتی اعظم قدس سرہ'

از مولانا حفیظ الرحمن صاحب واصف

مرے ہر سانس سے ہے کاوشِ ضبط فغاں پیدا
کہ گلشن میں نہیں ہے آج کوئی رازداں پیدا

یہ کس کا قصۂ غم صفحۂ فطرت پہ لکھا ہے
کہ ہر نقطے سے ہے اِک لمعۂ شوقِ نہاں پیدا

رگِ خس میں دلِ بلبل کا خونِ گرم جاری ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے مزاجِ آشیاں پیدا

سکوتِ گل پہ کتنے چہچہے قربان ہوتے ہیں
چمن میں جب کہیں ہوتا ہے اِک طرزِ بیاں پیدا

تری کوتاہ بینی دوسروں کی قدر کیا جانے
باندازِ نظر ہوتا ہے اوجِ آسماں پیدا

ابھی اِک اہل دل اس جادۂ ہستی سے گذرا ہے
بہر نقش قدم ہے گلستاں در گلستاں پیدا

خزانہ علم و حکمت کا چھپا کر لوگ آئے ہیں
ہوا ہے خاکِ مہرولی میں اِک تازہ جہاں پیدا

اٹھا کر ایک مشت ِ خاک دیکھو چشم باطن سے
تو ہوگا ایک اِک ِ ذرّے سے گنج شائگاں پیدا

سکھایا اِک فقیر راز داں کی موت نے واصف
کہ یوں مر کر کیا کرتے ہیں نامِ جاوداں پیدا

اکابر اور اعزاء واحباب کی

تعزیت کا شکریہ

آخر وہ وقت آپہنچا جس کا اندیشہ تھا۔ یعنی چار ماہ کی صبر آزما علالت کے بعد حضرت والد محترم مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ صاحب (قدس سرہٗ) ہم سب کو مضطرب چھوڑ کر ۳۱ر دسمبر ۵۲ء مطابق ۱۳ر ربیع الثانی ۷۲ ۱۳ھ بوقت ساڑھے دس بجے شب عازم ملک بقا ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شدت غم سے آنکھیں اشکبار اور حواس پراگندہ ہیں۔ میں اپنے آپ کو ایسے سفینہ کا مسافر محسوس کر رہا ہوں جس کا بادبان ٹوٹ گیا ہو اور وہ طوفان میں گھر کر تھپیڑے کھا رہا ہو۔

خود بخود دل ہے کہ افسردہ ہوا جاتا ہے ۔۔۔ کیا بتاؤں تمھیں کیا مجھ پہ پڑی ہے افتاد
آہ کچھ ایسا مرے دل کو اُجاڑا تم نے ۔۔۔ جیسے دلّی کو زمانے نے کیا تھا برباد
اشک آنکھوں میں نہیں طاقت فریاد نہیں ۔۔۔ کون اب ان کو سنائے گا ہماری روداد
میری غیرت پہ کوئی حرف نہ آئے یارب ۔۔۔ ہے اُدھر تاک میں بجلی تو ادھر ہے صیاد

صورت موج صبا تو نے کیا رم ہم سے
تیری منزل نہ تھی یہ کارگہ کون و فساد

حضرت مفتی اعظم کی ذات والا صفات ہر طبقہ اور ہر فرقہ کا مشترک سرمایہ اور دنیائے اسلام کی عظیم الشان دولت تھی۔ میرے محترم اکابر اور عزیز نے احباب نے جن تاثرات کے ساتھ ہمدردی اور تعزیت کا اظہار فرمایا ہے وہ میرے لیے باعث فخر اور موجب مباہات ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے احباب اور مرحوم کے تلامذہ اور ان سے نیازمندانہ ومحبانہ تعلق رکھنے والے حضرات کے بے شمار خطوط و پیغامات آچکے ہیں اور آرہے ہیں۔ میں ان سب حضرات کی حوصلہ افزائی اور ہمدردی کا بے انتہا ممنون ہوں اور ان کی مخلصانہ توجہات کا باچشم تر و آہ سرد شکریہ ادا کرتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ وہ ایصال ثواب کی مسنون صورتوں کے ساتھ حضرات مرحوم کو ہمیشہ یاد رکھیں کہ ان کے عظیم الشان حقوق کا بدلہ اسی طرح ادا کیا جاسکتا ہے۔

حفیظ الرحمٰن واصف

حضرت مفتی صاحبؒ کے قلم سے۔ طالب علمی کے زمانہ میں یہ نمونے دکھا کر ٹوپی بُننے کی فرمائش حاصل کیا کرتے تھے۔ (بشکریہ واصف صاحب)

Scanned by CamScanner